استفسارات

سوال و جواب کی نشستیں

حصّہ دوم

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب:
اختر حجازی

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اردو بازار، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

عرض مرتب	۵
درس قرآن و حدیث کے بعد	۷
اسلام، بیسویں صدی میں	۲۵
پاکستان، تحریک اسلامی اور متعلقہ مسائل	۶۳
اسلام اور عالم اسلام کے مسائل	۱۲۳
دعوت اسلامی کی کامیابی کا راستہ	۱۴۱
جب جمہوری اور آئینی راستے بند ہو جائیں	۱۶۸
حکمت اور موعظۃ الحسنہ	۱۷۵
تحریکی مزاج	۱۸۰
دورۂ سکھر	۱۸۳
مولانا مودودی اسلام آباد میں	۱۹۳
سید مودودی جواب دیتے ہیں	۱۹۹
یہ سب کچھ ہمارے مقصد حیات کا لازمی تقاضا ہے۔	۲۱۱
ایڈیٹر چٹان سے ملاقات	۲۱۹
دعوت اسلامی کی رفتار	۲۳۳
علمائے مراکش کے سوالات	۲۳۹
ریاض یونیورسٹی کے وفد سے ملاقات	۲۴۷

سقوطِ مشرقی پاکستان	۲۵۱
کیا مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ہو سکتے ہیں	۲۷۳
مولانا مودودی قاہرہ میں	۲۸۱
لندن میں	۲۹۷
مغرب کو اسلام کی دعوت	۳۱۹
مجلتہ العربا کا سوالنامہ	۳۲۶
لندن سے واپسی	۳۳۵
ایک امریکی بھائی سے مکالمہ	۳۴۶
اسلام یا سوشلزم	۳۵۱

عرضِ مرتّب

"استفسارات" حصہ دوم پیش خدمت ہے۔ یہ مجموعہ کسی موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، بلکہ مولانا مرحوم کی علمی و دعوتی اور تحریکی مجالس میں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک مختلف مقامات پر کئے گئے سوالات کے جوابات اور بعض تقاریر اور انٹرویو پر مشتمل ہے۔ جو وقتاً فوقتاً ملک کے جرائد خصوصاً ایشیا، آئین زندگی، اور اخبار جسارت اور چٹان میں شائع ہوتے رہے ہیں ان کی اشاعت سے مقصود بقول مشہور دانش ور اور صحافی عبدالقادر حسن ـــــــ سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور افکار آنے والے مورخوں، محققوں اور علماء کے لئے تحقیق کا بہت اہم موضوع بنتے رہیں گے۔ اور ان کی ذہانت اور صلاحیت سے خراج وصول کرتے رہیں گے۔ ہم ــ مولانا کے عہد زریں کے خوش نصیب لوگ ـــــــ جو مولانا کے قدموں میں بیٹھے ہیں۔ جنہوں نے اس نادر روزگار شخصیت کی گفتگو سنی ہے۔ جنہوں نے ان کو اپنے درمیان زندگی بسر کرتے دیکھا ہے۔ جنہوں نے ان سے سوال و جواب کئے ہیں۔ جنہوں نے ان کی رہنمائی اور قیادت میں زندگی کا ایک بڑا حصہ بسر کیا ہے اور جن کے سر ان کے

دست شفقت کا سایہ اب بھی محسوس کرتے ہیں۔ وہ اس عظمتِ روزگار کے رخصت ہوتے ہی آنے والی نسلوں کے مقروض ہو گئے ہیں ہمارے اوپر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ ہم جلد از جلد ان یادوں، ان معلومات، ان تحریروں اور ان حقیقتوں کو قلم بند کر دیں جس سے آنے والی نسلیں محروم رہیں گی اور جن تک یہ سب کچھ پہنچانا ہمارا فرض ہے ——— یہی ہے کہ بعد میں آنے والوں کے لئے کچھ آسانی ہو۔

تحریکی احباب سے گزارش ہے کہ اگر ان کے پاس مولانا مرحوم کی کوئی ایسی تحریر ہو تو اس کی نقل بھیج کر مشکور فرمائیں تاکہ اسے حصہ سوم میں شامل کر دیا جائے۔

آخر میں گزارش ہے کہ اس مجموعہ میں رہ جانے والی خامیوں، کوتاہیوں کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے نا کہ مولانا مرحوم پر۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس ذہنی اور قلبی انتشار کے دور میں یہ اس کتاب کو ذہنی اور قلبی اطمینان کا سبب بنائے۔ آمین

اختر حجازی

رفیق پارک۔ حماد کالونی۔ شاد باغ لاہور

یکم اگست ۱۹۸۹ء

درسِ قرآن و حدیث کے بعد

ایک تفسیری نکتہ۔

سوال۔

ایک با اختیار مخلوق پیدا کرنے کے بعد عذاب و ثواب کا بیان کرنا دونوں ہی اللہ کی رحمت میں شامل ہے ظاہر ہے اگر عذاب کا بیان شامل نہ ہوتا تو انسان کے لئے عذاب سے بچنا محال ہوجاتا اس لحاظ سے سورۂ رحمٰن میں جہاں عذاب کے بیان کے بعد نعمتوں کا ذکر ہے کیا یہ زیادہ مناسب نہیں کہ عذاب کا بیان کرنا بھی انسان کے لئے عین رحمت ہے۔

جواب:

مگر اس تفسیر سے کسی کا اطمینان ہوتو اسے اختیار کرلے۔ میں برسوں کے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فبای الاء ربکما تکذبٰن میں بحیثیت مجموعی ساری کائنات کی نعمتیں مذکور ہیں اور ہر دو تین آیتوں کے بعد جو اس آیت کی تکرار ہوتی ہے تو جن اور انسانوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ آخر وہ ان تمام نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلائیں گے۔

فبایّ آلاءِ ربکما تکذبٰن۔

سوال۔

جمعہ کے دن عید کے خاص پروگرام میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ایک قاری صاحب نے سورۂ رحمٰن کی تلاوت کی لیکن ساری سورۃ کے دوران فبای الاء ربکما تکذبٰن کو صرف تین بار پڑھا براہِ مہربانی اس بات پر روشنی ڈالیے۔ کیا یہ جائز ہے۔

جواب۔

یہ بات جائز نہیں ہے۔ دراصل اس زمانے میں قرآن کی تلاوت کو گانا بنا لیا گیا ہے۔ اور جس طرح گانے والے ٹیپ کا بند درمیان میں چھوڑتے جاتے ہیں۔ اسی طرح قاری صاحب نے بھی اُسے چھوڑ دیا ہوگا۔

زیورات پر زکوٰۃ۔

سوال۔

زکوٰۃ بڑھنے والے مال پر واجب ہوتی ہے اس اصول کے مطابق زیورات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ زیورات بڑھتے نہیں اگر ان کی زکوٰۃ ہر سال دینی واجب ہو تو ممکن ہے کہ ان کی زکوٰۃ ادا کرتے کرتے ان کی قیمت سے بھی زکوٰۃ بڑھ جائے۔ اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب۔

یاد رکھیئے کہ اس قسم کے قیاسات پر شرعی احکام نہیں بنا کرتے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ ادا کی جائے تو پھر یہ اندیشہ کیسا؟ اگر آپ چاہتے ہیں کہ زیورات پر زکوٰۃ ادا کرنے کی زحمت سے بچ جائیں تو اتنی ہی مقدار کے زیورات بنایئے جن پر مطابق نصاب زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ بصورت دیگر آپ

کو ہر سال زکوٰۃ ادا کرنا پڑے گی اگر وہ ۔۔۔۔ زکوٰۃ زیورات کے وزن سے ادا کرنے کے بجائے علیحدہ رقم سے ادا کی جائے گی تو جب تک زیورات اپنے وزن پر قائم رہیں گے ان پر ایک ہی زکوٰۃ واجب آئے گی خواہ آپ سالہا سال تک ادا کرتے رہیں۔

زکوٰۃ اور ٹیکس۔

سوال ۔۱۔

زکوٰۃ اور ٹیکس میں کیا فرق ہے۔ کیا ٹیکس دینے کی صورت میں ہمیں اپنی صحیح آمدنی ظاہر کرنی چاہیئے جبکہ صحیح آمدنی ظاہر کرنے سے انکم ٹیکس آفیسران پر دوگنا اور چوگنا کرکے ٹیکس لگاتے ہیں۔

جواب ۔

زکوٰۃ اور ٹیکس کا فرق متعدد مرتبہ پوری تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے اور ترجمان القرآن میں بھی اس بحث سے متعلق میری تحریر موجود ہے آپ اسے پڑھ لیجئے۔

زیر درس احادیث میں جس حکومت کا ذکر ہو رہا ہے وہ ایک صحیح اور معیاری اسلامی حکومت ہے جہاں زکوٰۃ دینے والے پوری خدا خوفی سے اپنے مال محصلین کے سامنے پیش کرتے ہیں اور محصلین بھی پوری راست روی سے زکوٰۃ وصول کرتے ہیں آپ کو اصول بتا دیا گیا ہے اب آپ خود موجودہ حالات کا جائزہ لے کر اپنی پالیسی طے کر سکتے ہیں۔

محصلین زکوٰۃ

سوال ۲۔

کیا موجودہ دور میں بھی محصلین کو راضی کرنا ضروری ہے۔ یا جو کوئی بھی وصول کرنے کے لئے آئے ضرور کچھ نہ کچھ اسے دے دیا جائے :

جواب : محصلین سے مراد ہر مانگنے والا نہیں ہے اسلامی حکومت کے قیام

کے بعد جب زکوٰۃ کی وصولی کے لئے سرکاری عمال مقرر کئے جائیں تو انہیں تحصیلدار کہا جاتا ہے آج کے اس نظام پر تو یہ چیز بھی قیاس بھی نہیں کی جا سکتی کہ "تحصیلدار" عوام کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئیں گے انہیں تو ایڈمنسٹریشن اکیڈمی کی تربیت میں سکھایا ہی یہ جاتا ہے کہ وہ حاکم ہیں اور باقی سب محکوم۔

۲۹ رمضان کا چاند۔

سوال۔

ایک حدیث میں ہے کہ عید کے دن صرف شیطان روزہ رکھتا ہے اگر تمہیں شک ہو تو روزہ نہ رکھو۔

جواب:

یوم الشک سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ پوری مخلوق نے چاند نہیں دیکھا اور ریڈیو سے اس کے دیکھے جانے کا اعلان ہو گیا تو شک پڑ گیا۔ یوم الشک اسے کہتے ہیں کہ مطلع ابر آلود ہے کہیں بادل سرک جانے سے چمک سی پیدا ہوئی اور یہ شک ہوا کہ ممکن ہے یہ چمک چاند کی ہو اس لئے دوسرے دن عید تو نہیں منائی جائے گی لیکن روزہ بھی نہیں رکھا جائے گا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ۔

سوال۔

کیا کبھی دور اوّل میں بھی مکہ اور مدینہ دو عیدیں ہوئی تھیں؟

جواب۔

مکہ اور مدینہ میں اس ریڈیو سے سابقہ کب پیش آیا تھا وہاں تو قاضی و مفتی قابل اعتبار آدمیوں کی شہادت کے بعد رویت ہلال کا فیصلہ کرتا تھا اور یہ شہادت ٹیلیفون پر نہیں بلکہ رو در رو ہوتی تھی۔ ٹیلی فون کی شہادت کو تو قانون بھی تسلیم نہیں کرتا یہ ضروری ہے کہ شہادت دینے والا جج کے سامنے موجود ہو تاکہ اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کا بھی جائزہ لیا جا سکے

پھر یہ غلط فہمی جو پھیلائی جارہی ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کی عید ایک دن ہونی چاہیئے بالکم ازکم ایک ملک میں عید تو ایک دن ضرور ہونی چاہیئے۔ یہ شریعت کا منشا ہرگز نہیں شریعت اسلامی تو تمام زمانوں کے لئے ہے آج سے سو سال پہلے کیا اس بات کا امکان تھا کہ پورے پنجاب میں بھی ایک دن عید ہو سکتی۔ ریڈیو کے سبب اگرچہ یہ ممکن ہوا ہے لیکن اگر ریڈیو ہی کو فیصل مان لیا جائے تو پھر ہر شخص کے پاس اس کی موجودگی دینی واجبات میں سے ہو جائے گی۔

اسی طرح نماز کا معاملہ لیجئے۔ نماز کے اوقات کا تعین سورج کے طلوع وغروب سے کیا گیا ہے اگر گھڑی سے اوقات مقرر کیئے جاتے تو یہ ہماری دینی ضرورت بن جاتی۔

دنیا کے تمام مسلمانوں کی عید ایک دن ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ چاند کے طلوع میں فرق ہے جو لوگ ایسا دعوی کرتے ہیں وہ کل یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نماز بھی ایک وقت پر پڑھی جائے حالانکہ سورج کا طلوع وغروب دنیا کے تمام ممالک میں مختلف ہے۔

معیارِ حق۔

سوال

بہت سے علماء آپ پر اعتراض کرتے ہیں کہ آپ صحابہ کرام رضؓ کو معیارِ حق نہیں مانتے

جواب

ہمارے نزدیک معیارِ حق سے مراد وہ چیز ہے جس سے مطابقت رکھنا حق ہو۔ اور جس کے خلاف ہونا باطل ہو اس لحاظ سے معیار حق صرف خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ صحابہ کرام رضؓ معیار حق نہیں ہیں بلکہ کتاب وسنت کے معیار پر پورا اترتے ہیں کتاب وسنت کے معیار پر ہی جانچ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ گروہ برحق ہے ان کے اجماع کو ہم اس بنا پر حجت مانتے ہیں کہ ان کی کتاب وسنت کی

اور نئے سی خلاف ورزی پر بھی متفق ہو جاتا ہمارے نزدیک ممکن نہیں ہے صحابہ کرام رض
کو برا کہنے والا میرے نزدیک صرف فاسق ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ایمان بھی مشتبہ ہے
من ابغضهم فببغضي ابغضهم (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (جو میرے
صحابہ رض کے ساتھ بغض رکھتا ہے وہ گویا میرے ساتھ بغض رکھتا ہے)

ایشیا ۲۲ جنوری ۱۹۶۷ء

سوال۔

کیا جماعت اسلامی کو زکوٰۃ دینا جائز ہے؟ جبکہ زکوٰۃ غرباء کے لئے ہے۔؟

جواب۔

جماعت اسلامی اپنے لئے زکوٰۃ نہیں لیتی بلکہ اسے اسی مصرف میں استعمال کرتی ہے جس کے لئے یہ مخصوص کی گئی ہے۔

سوال۔

جس علم کا حاصل کرنا فرض ہے وہ صرف دین کا ہے یا جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ بھی اس میں شامل ہے؟

جواب۔

قرآن و حدیث کی رو سے اصل علم حقیقت النفس الامری کا جاننا ہے یعنی یہ اس کائنات اور خود انسان کا پیدا کرنے والا کون ہے اور وہ طریقہ ہے جس پر چل کر انسان نے ہدایت پا سکتا ہے اب اگر کسی شخص کو یہ علم حاصل نہ ہو تو خواہ دنیا کے تمام علوم میں وہ مہارت حاصل کرے قرآن و حدیث کی رو سے جاہل مطلق ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ دنیا میں لله کا کلمہ بلند کرنے کے لئے دوسرے علوم کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اور یہ اسی صورت میں نافع اور باعث اجر بن سکتا ہے جب اصل علم حاصل کرنے کے بعد آدمی اس طرف رجوع کرے۔

(ایشیا ۲۰ نومبر ۱۹۶۶ء)

سوال۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سرمایہ داری زکوٰۃ سے ختم ہوسکتی ہے لیکن زکوٰۃ کی مقدار کو دیکھا جائے تو اس کو تسلیم کرنا مشکل ہوجاتا ہے اگر سیٹھ داؤد صاحب جیسے سرمایہ دار زکوٰۃ دینا شروع کردیں تو کیا ان کی سرمایہ داری ختم ہوسکے گی۔

جواب۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ سرمایہ داری ختم کرنے کے لئے عائد کی گئی ہے وہ سرے سے بات ہی غلط کہتے ہیں زکوٰۃ سرمایہ داری نہیں بلکہ غریبی ختم کرنے کے لئے فرض کی گئی ہے اگر کوئی اللہ کی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے دولت کماتا ہے اور کروڑ پتی بھی بن جاتا ہے تو یہ اللہ تعالےٰ کی اس پر خاص رحمت ہے۔ کوئی معیوب یا خلافِ شریعت بات نہیں اب یہ اس شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنی دولت میں سے غریبوں کا وہ حق نکالے جو از روئے قانون اللہ تعالےٰ نے مقرر کیا ہے۔

سوال۔

بعض زکوٰۃ دینے والے تاجر اپنی زکوٰۃ کی رقم اپنے ہی قرض داروں کو دے کر پھر وہ رقم اسی وقت اپنے قرض میں لے کر مقروض کے حساب میں جمع کرلیتے ہیں کیا اس طرح زکوٰۃ کی بلا کراہت ادائیگی ہوجاتی ہے۔؟

جواب۔

جی ہاں ادائیگی ہوجائے گی اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

سوال۔

کیا زکوٰۃ نوٹوں کی صورت میں ادا ہوجائے گی حالانکہ نوٹ مال نہیں بلکہ سند مال ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی مال میں فرض ہے۔

جواب۔ یہ تو محض حیلہ تراشی ہے، ورنہ آپ جس وقت بازار سے کوئی چیز

خریدنے جاتے ہیں تو دکاندار سندِ مال (نوٹ) کے بجائے آپ سے اصل مال طلب نہیں کرتا۔ ہاں زکوٰۃ ادا کرتے وقت آپ کو یہ خیال آتا ہے۔

سوال

کیا وہ رقم جو ٹیکس کی صورت میں حکومت کو ادا کی جائے آمدن میں شمار ہوگی اور کیا اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔؟

جواب۔

تمام مصارف سے بچ کر جو مال آپ کے پاس ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب آئے گی

سوال۔

سائیکل سکوٹر، موٹر کار پر زکوٰۃ کی کیا حیثیت ہوگی یا یہ چیزیں مستثنیٰ ہیں ؟

جواب۔

اگر یہ چیزیں ذاتی استعمال میں ہیں تو بلاشبہ مستثنیٰ ہیں ورنہ ان کی تجارت کی صورت میں اموالِ تجارت کے قاعدے کی رُو سے ان پر زکوٰۃ عائد ہوگی

(ایشیا ۱۳ نومبر ۱۹۶۹ء)

لا یکلف اللہ نفساً الّا وسعھا۔

سوال۔
ایک شخص ساری عمر فرض روزوں کا تارک رہا۔ اور آخری عمر میں اسے توبہ کی توفیق نصیب ہوئی اب اس کے قویٰ کا اضمحلال اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ان روزوں کی قضا رکھے ایسی صورت میں وہ کیا کرے۔؟

جواب
قاعدہ ہے کہ شریعت انسان سے انہی امور کا مطالبہ کرتی ہے جو اس کی حدِ استطاعت میں ہوتا ہے لا یکلف اللہ نفساً الّا وسعھا۔ اب ایک شخص اپنی آخری عمر میں تائب ہوا ہے تو بہرکیف یہ اس کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ سے خلوصِ دل سے توبہ کرے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگے بجز توبہ کے اور کوئی راستہ اس کی نجات کا نہیں ہے جہاں بڑے بڑے گناہ توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔ وہ اسے امید رکھنی چاہیئے۔ کہ اس کا یہ گناہ بھی معاف ہو جائے گا بس خلوصِ نیت اور باقی عمر کو اللہ تعالےٰ کی رضا کے مطابق گزارنا شرط ہے۔

پتھر پہننا۔
سوال۔ کیا انگلی میں ایسی انگوٹھی پہننا جائز ہے جس میں پتھر جڑا ہوا ہو۔

جواب

شاید پوچھنے والے نے میرے ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھی کو دیکھ کر یہ سوال کیا ہے .... اس پتھر کی خاصیت یہ ہے کہ اگر یہ جسم کو مس کرتا رہے تو گردے کا درد نہیں ہوتا چونکہ میں درد گردہ کا مریض ہوں اس لئے اسے استعمال کرتا ہوں ۔

تعویذ کا استعمال ۔

سوال ۔

کیا دفع بلیات کے لئے تعویذوں کا استعمال جائزہ ہے ؟

جواب

پہلے تو تعویذ کے بارے میں دیکھنا چاہئیے کہ یہ کیا چیز ہے اس میں بیشتر مشرکانہ باتیں درج ہوتی ہیں اور غیراللہ سے استمداد کیا جاتا ہے پھر اس میں قرآنی آیات بھی الٹی سیدھی لکھی جاتی ہیں ۔ رہی یہ بات کہ اللہ کا نام اور اس کے کلام کو سیدھے طریقے سے لکھ کر تعویذ بنایا جائے تو سوچئے کیا یہ کسی طرح مناسب و مفید بھی ہے؟ اللہ کے کلام کو پڑھ کر تو آدمی اس سے فائدہ حاصل کرسکتا ہے لیکن اسے اپنے بازو پر باندھ کر یا گلے میں لٹکا کر کیا فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے پھر یہ کلام الٰہی کے احترام کے بھی منافی ہے ۔ آدمی ان تعویذوں کے ساتھ بیت الخلاء بھی جاتا ہے دوسری صورتوں سے بھی دوچار ہوتا ہے جب اللہ کے کلام کو بدن کے ساتھ باندھے رکھنا کسی طرح بھی مناسب نہیں رہتا ۔

سفر میں سنتوں کی ادائیگی ۔

سوال :۔

کیا سفر میں سنتیں پڑھنی چاہیئں

جواب :۔ اس مسئلے میں فقہا کی مختلف رائیں ہیں ، لیکن میرا اطمینان اس بات پر

ہے کہ اگر آدمی حالت سفر میں ہو تو سنتیں نہ پڑھنا اولیٰ اور سفر کے دوران میں کہیں قیام کرے تو وہاں سنتیں پڑھنا افضل ہے۔

چھوٹے بچے اور شراب

سوال

کیا چھوٹے بچوں کو بیماری میں برانڈی دی جاسکتی ہے؟

جواب

اگر کوئی طبیب یہ کہے کہ برانڈی کے سوا بچے کی جان بچانے کا اور کوئی بدل نہیں ہے تو پھر اس کے دینے کا جواز ہے لیکن اگر بدل ممکن ہو تو پھر جائز نہیں ہے جان بچانے کے لئے بھی جس حد تک اس کی ضرورت ہو شریعت نے اسی حد تک اجازت دی ہے اگر بلا وجہ بھی بچے کو شراب دی جائے گی، تو بچہ تو گنہگار نہیں ہوگا اسے دینے والے ضرور گنہگار ہوں گے

عالم آخرت کی باتیں۔

سوال۔

سیدھے ہاتھ سے اعمالنامہ دینے کی صحیح کیفیت کا کیا تصوّر کیا جاسکتا ہے؟

جواب

عالم آخرت کے بارے میں جو چیزیں بیان کی گئی ہیں ہم ان کا اسی حد تک تصوّر کرسکتے ہیں جس حد تک قرآن و حدیث میں ان کی صراحت کی گئی ہے اس سے آگے کریدکرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے

عصمت انبیاء کا عقیدہ

سوال

آپ نے تفہیم القرآن میں انبیاء کی لغزشوں کا ذکر فرمایا ہے لیکن اس سے بات

واضح نہیں ہوتی براہِ کرم، عصمتِ انبیاء کے صحیح تصور کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

اگر قرآن مجید میں بعض لغزشوں کی نشاندہی اور ان پر تنبیہ کا ذکر نہ ہوتا تو ہم انبیاء علیہم السلام کے بارے میں لغزشوں کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے لیکن قرآن میں بعض اشارات ایسے موجود ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے بعض ایسے امور کا نادانستہ صدور ہو گیا تھا جنہیں اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا تھا اور اس پر انہیں متنبہ کیا تھا اسی بنیاد پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے بعض لغزشیں سرزد ہوئیں لیکن ان لغزشوں کی نوعیت وہی ہے جو سیئات المقربین کی ہے یعنی جو ابرار کی حسنات ہیں وہ مقربین کی سیئات ہیں ان لغزشوں میں بظاہر کوئی نقص کی بات نہ تھی لیکن انبیاء کا اپنا مقام اتنا بلند اور ان کا منصبِ اصلاح اتنا ذمہ دارانہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہ تھا کہ ان سے کسی بھی خفی یا جلی چوک کا اظہار ہو اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو متنبہ فرما کر ان کی فوراً اصلاح کر دی اور یہ تمام لغزشیں وہی ہیں جن کے اشارات قرآن میں ملتے ہیں اس کے علاوہ ان کی پاکیزہ زندگیاں بالکل بے عیب تھیں۔

قرآن میں جن لغزشوں کے اشارات ملتے ہیں ان کی بنیاد پر اگر یہ بات کہی جائے کہ انبیاء علیہم السلام سے بعض معاملات میں لغزشیں ہوئی تھیں تو یہ ایسی نہیں جو عصمت انبیاء کے خلاف ہو اب جو شخص اللہ سے بھی بڑھ کر انبیاء کا طرفدار بننا چاہتا ہے وہ جو چاہے عقیدہ رکھے خود مختار ہے۔

شرح صدر کیا ہے؟

سوال

جب ہر انسان فطری طور پر "نیکی کی فطرت" پر پیدا کیا گیا ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا تو پھر ہر آدمی کو قبولِ ہدایت کے لئے شرحِ صدر

کیوں نہیں ہے؟

جواب

آدمی کو شرح صدر اسی وقت عطا کیا جاتا ہے جب وہ متنبہ ہو کر خلوص دل سے راہِ راست کی طرف پلٹنا چاہتا ہے اگر وہ خلوص نیت کے ساتھ راہ راست پر آنا ہی نہ چاہے تو شرح صدر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس پر زبردستی مسلط کر دیا جائے

بعض ایام کی فضیلت۔

سوال۔

روزہ چاہے عاشورہ کے دن رکھا جائے یا ہے کسی اور دن انسان کو مشقت تو ایک جیسی کرنی پڑتی ہے پھر ایک خاص دن کسی عبادت کا اجر کیسے زائد ہو سکتا ہے؟

جواب

ویسے تو نیکی جس دن بھی کی جائے اس کا اجر ہے۔ لیکن بعض دن ایسے ہیں جو اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتے ہیں مثلاً عاشورہ وہ دن ہے جب اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی اب جو شخص اس عظیم الشان واقعہ کو مد نظر رکھتے ہوئے اس دن روزہ رکھے گا اس کے دل کی کیفیت کچھ اور ہی ہو گی۔ اسی طرح جو شخص گھر میں بیٹھے ہوئے عرفے کا روزہ رکھتا ہے لیکن اس کا دل عرفات میں اٹکا رہتا ہے اور عالم خیالی میں اپنے آپ کو حاجیوں کے درمیان محسوس کرتا ہے تو یہ کیفیت اس کے روزے کے اجر کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔

دل کی بیماری

سوال

حسد کینہ، بغض اور لالچ دل میں گھر کر رہا ہے ایمان میں کمزوری محسوس ہوتی ہے نمازیں پڑھتا ہوں مگر افاقہ نہیں ہوتا اس کا موثر علاج بتا لیے اور دعا فرمائیے۔

جواب

اللہ تعالیٰ آپ کو اخلاص عطا فرمائے اور راہِ حق میں استقامت بخشے اس دنیا میں انسان ایک سخت کشمکش میں مبتلا ہے شیطانی قوتیں اسے ایک طرف کھینچ رہی ہیں اور ملکوتی قوتیں اسے دوسری طرف لے جانا چاہتی ہیں اب یہ اس کے اپنے ارادے اور اپنی کوشش پر منحصر ہے کہ وہ کدھر جاتا ہے دعائیں اسی وقت کارگر ہوتی ہیں جب ان کے ساتھ سعی وجہد بھی کی جائے اگر ایک شخص بیمار ہو وہ نہ دوا کھائے اور نہ پرہیز کرے اور صرف دعا کے بل بوتے پر شفایاب ہونا چاہیئے تو ایک ناممکن سی بات ہے اگر وہ اپنی طرف سے ممکن کوشش کے بعد دعا پر بھی بھروسہ کرے تو یہ ایک معقول بات ہے۔ دعا کو بہر حال اپنے اثر کے لئے کسی قالب کی ضرورت ہے وہ قالب نہ ہوگا اور دعا کیا اثر کرے گی۔

(الفضل ۲۸ فروری ۱۹۶۸ء)

دعا کے بارے میں

سوال۔

اگر دعاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے بدل دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ فیصلے لکھ رہا تھا (نعوذ باللہ) اسے معلوم نہ تھا کہ متعلقہ شخص دعا مانگے گا یا نہیں؟

جواب:۔

فیصلے میں اس نے یہ لکھا تھا کہ اگر یہ شخص دعا مانگے گا تو میں اپنا فیصلہ بدل دونگا اگر نہیں مانگے گا تو اسے برقرار رکھوں گا۔ میں پہلی حدیث میں ہی اس بات کی وضاحت کرچکا ہوں۔

سوال :۔ نیکی اگر عمر میں اضافے کا باعث ہوتی ہے تو امریکہ جیسی بدکار قوم میں

اوسط عمر کے اضافے کی کیا وجہ ہے؟

جواب

ایک آبادی میں زیادہ سے زیادہ عمر اور کم سے کم عمر کو سامنے رکھ کر اس کی اوسط عمر نکالی جاتی ہے اب ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ انسان کی کتنی عمر اس کی تقدیر میں لکھی گئی ہے اور اس نے اپنی کوششوں سے کتنی بڑھالی۔ نہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالےٰ نے فلاں زمانے میں فلاں قوم کی اوسط عمر یہ لکھی ہے اس لئے بے بنیاد قیاس آرائی کرنا درست نہیں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ نیکی ہی وہ چیز ہے جس سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے اس لئے ہم اس بات کے قائل ہیں ورنہ عمر کو ناپنے کا پیمانہ کسی کے پاس نہیں ہے۔

(ایشیاء ۲۵ جولائی ۱۹۶۹ء)

تسخیر ماہتاب اور انسان۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان نے چاند پر انسان کے اترنے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"چاند پر آدمی کا اترنا بہرحال سائنس کی ترقی کا کمال ہے اس کمال کا اعتراف نہ کرنا ایک علمی اور اخلاقی بخل ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف آدمی مادی ترقی کی ان بلندیوں پر پہنچ چکا ہے اور دوسری یہ دیکھتے ہیں کہ اخلاقی حیثیت سے وہی انسان ان پستیوں تک پہنچ گیا ہے کہ جس امریکہ نے اپنے سائنسی کمالات کی بدولت چاند تک آدمی کو پہنچایا ہے اسی امریکہ میں علی الاعلان ڈرامے کے سٹیج پر عمل جنسی اور عمل قوم لوط تک کے مظاہرے ہوئے ہیں اور اس ملک میں اس وقت رنگ و نسل کی بنیاد پر انسانوں کو تقسیم کیا جاتا ہے اور کالے رنگ والوں کو انسانی حقوق تک میسر نہیں آتے اور اسی امریکہ میں لاکھوں انسان بھوک

سے مر رہے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ محض مادی ترقی ایک ہتھیار سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہتھیار اگر ڈاکو کے ہاتھ میں ہو تو اس سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں ہے۔ اور اگر محافظ امن کے ہاتھ میں ہو تو وہ ایک کارآمد اور مفید چیز ہے۔ سائنس میں نہ یہ طاقت ہے اور نہ صلاحیت کہ وہ انسان کو ڈاکو بننے سے بچائے اور انسانیت کے امن کا محافظ بنادے یہ کام تو لامحالہ ایک ایسا دین ہی کر سکتا ہے جو انسان کو خدا کے خوف اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے صحیح معنوں میں انسان بنائے اور پھر اس کو زندگی کا وہ راستہ بھی بتائے جس سے وہ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو استعمال کرنے کا صحیح طریقہ جان سکے۔ ایسے دین کی رہنمائی کے بغیر سائنس کی ترقی انسان کے لئے جتنی مفید ہو سکتی ہے اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ تباہ کن بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ مسلمانوں پر اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مسلمانوں کو دین حق کی نعمت عطا کی ہے لیکن یہ مسلمانوں کی اپنی غلطی ہے کہ وہ اس دین حق کو لے کر نہیں اٹھتے اور اس کی پیروی کرتے ہوئے مادی ترقی کر کے دنیا کو اس بات کا نمونہ نہیں دکھاتے کہ ایک خدا ترس اور راست بازوں کے گروہ کے ہاتھ میں جب سائنسی ترقی کے ذریعہ سے مادی وسائل آتے ہیں تو وہ انہیں کس طرح انسانیت کی فلاح کے لئے استعمال کرتا ہے۔

اسلام

بیسویں صدی میں

سوال ۱

بیسویں صدی کے اس مہذب و ترقی یافتہ دور کی رہنمائی بھی مذہبی نقطۂ نظر سے "اسلام" کرسکتا ہے یا "عیسائیت" ؟

(ا) کیا انسان کو سیکولرازم یا دہریت، روحانی و مادی ترقی کی معراج نصیب کرا سکتی ہے ؟

(ب) بالخصوص کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے اور ختم کرنے کی صلاحیت کس میں ہے ؟

جواب : یہ سوال کئی سوالات کا مجموعہ ہے۔ اس لئے اس کے ایک ایک جزو پر علیحدہ بحث کرنی ہوگی۔

(ا) جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے، اس دور کی راہنمائی سے وہ پہلے ہی دستبردار ہو چکی ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ کسی دور میں بھی انسانی تہذیب و تمدن کی راہنمائی نہیں کرسکی ہے۔ عیسائیت سے مراد اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وہ تعلیمات ہیں جو اب

عیسائیوں کے پاس ہیں تو بائیبل کے عہد جدید کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ وہ انسانی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا رہنمائی اور کتنی راہنمائی کرتی ہے؟ اس میں بجز چند مجرد (ABSTRACT) اخلاقی اصولوں کے سرے سے کوئی چیز موجود نہیں ہے جس سے انسان اپنی معاشرت اور اپنی معیشت اور عدالت اور سیاست اور قانون کے متعلق کوئی ہدایت حاصل کر سکے۔ لیکن اگر عیسائیت سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو عیسائی پادریوں نے بنایا تھا تو سب کو معلوم ہے کہ یورپ میں احیائے علوم کی نئی تحریک کے رونما ہونے کے بعد وہ ناکام ہوگیا۔ اور مغربی قوموں نے اس کے بعد جتنی کچھ بھی مادی ترقی کی وہ عیسائیت کی راہنمائی سے آزاد ہو کر ہی کی ہے۔ اگرچہ اسلام کے خلاف عیسائیت کا تعصب اور عیسائیت کے ساتھ ایک جذباتی تعلق ان میں اس کے بعد بھی موجود رہا اور اب بھی ہے۔

(ب) جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ اپنے آغاز ہی سے تمدن و تہذیب کے معاملے میں نہ صرف یہ کہ راہنمائی کرتا رہا ہے بلکہ اس نے خود اپنا ایک مستقل تمدن اور اپنی ایک خاص تہذیب پیدا کی ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق قرآن مجید نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کو ہدایت نہ دی ہو اور ان ہدایات کے مطابق عملی ادارے قائم نہ کر دیئے ہوں۔ یہ چیزیں جس طرح ساتویں صدی عیسوی میں قابل عمل تھیں، اسی طرح اس بیسویں صدی میں بھی قابل عمل ہیں اور ہزاروں برس آئندہ بھی انشاء اللہ قابل عمل رہیں گی۔ اس ترقی یافتہ دور میں کسی ایسی چیز کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جس کی وجہ سے اسلام آج نہ چل سکتا ہو۔ یا انسان کی راہنمائی نہ کر سکتا ہو۔ جو شخص اس معاملہ میں اسلام کو ناقص سمجھتا ہو، یہ اس کا کام ہے کہ کسی ایسی چیز کی نشاندہی کرے جس کے معاملے میں اسلام اس کی راہنمائی سے قاصر نظر آتا ہو۔

(ج) سیکولرازم یا دھریت درحقیقت نہ کسی روحانی ترقی میں مددگار ہیں اور نہ مادی

ترقی میں معراج نصیب کرنے کا تو ذکر ہی کیا ہے؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے اہل مغرب نے جو ترقی مادی حیثیت سے کی ہے وہ سیکولرازم یا مادہ پرستی یا دہریت کے ذریعہ سے نہیں کی بلکہ اُس کے باوجود کی ہے۔ مختصراً میری اس رائے کی دلیل یہ ہے کہ انسان کوئی ترقی اس کے بغیر نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بلند مقصد کے لئے اپنی جان و مال اپنے اوقات اور محنتوں کی اور اپنے ذاتی مفاد کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو۔ لیکن سیکولرازم اور دہریت ایسی کوئی بنیاد فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ جس کی بنا پر انسان یہ قربانی دینے کو تیار ہو سکے۔

اسی طرح کوئی انسانی ترقی اجتماعی کوشش کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور اجتماعی کوشش لازماً انسانوں کے درمیان ایسی رفاقت چاہتی ہے جس میں ایک دوسرے کے لئے محبت اور ایثار ہو۔ لیکن سیکولرازم اور دہریت میں محبت و ایثار کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اب یہ ساری چیزیں مغربی قوموں نے مسیحیت سے بغاوت کرنے کے باوجود اُن مسیحی اخلاقیات ہی سے لی ہیں جو ان کی سوسائٹی میں روایتاً باقی رہ گئی تھیں۔ ان چیزوں کو سیکولرازم یا دہریت کے حساب میں درج کرنا غلط ہے سیکولرازم اور دہریت نے جو کام کیا ہے وہ یہ کہ مغربی قوموں کو خدا اور آخرت سے بے فکر کر کے خالص مادہ پرستی کا عاشق اور مادی لذات و فوائد کا طالب بنا دیا ہے۔ مگر ان قوموں نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جن اخلاقی اوصاف سے کام لیا وہ ان کو سیکولرازم یا دہریت سے نہیں ملے بلکہ اُس مذہب ہی سے ملے جس سے وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے تھے اس لئے یہ خیال کرنا سرے سے غلط ہے کہ سیکولرازم یا دہریت ترقی کی موجب ہیں وہ تو اس کے برعکس انسان کے اندر خود غرضی، ایک دوسرے کے خلاف کشمکش اور جرائم پیشگی کے اوصاف پیدا کرتی ہیں جو انسان کی ترقی میں مددگار نہیں بلکہ مانع ہیں۔

(ح) کمیونزم کے سیلاب کو روکنے کی صلاحیت کسی ایسے ہی نظام زندگی میں ہو سکتی

ہے۔ جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کو اس سے بہتر طریقہ پر حل کر سکے۔ اور اس کے ساتھ انسان کو وہ روحانی اطمینان بھی بہم پہنچا سکے جس کا کمیونزم میں فقدان ہے۔ ایسا نظام اگر بن سکتا ہے تو صرف اسلام کی بنیاد پر بن سکتا ہے۔

سوال نمبر ۲

اگر بیسویں صدی میں بھی اسلامی نظام قابلِ نفاذ ہے تو موجودہ رجحان و نظریات کی جگہ لینے میں جو مشکلات یا موانع (Handicaps) درپیش ہوں گی؟ ان کا بہترین حل ابن خلدون کے ہر دو نظریۂ حکومت و ریاست یعنی "الخلافت" یا "الحکومت" کس سے ممکن ہے؟

جواب

۲۔ اس زمانے میں اسلامی نظام کو جو چیز نافذ ہونے سے روک رہی ہے اور جو رجحانات اور نظریات اس کے راستے میں سدِ راہ ہیں۔ ان کا اگر تجزیہ کرکے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ انہیں مسلمان ملکوں پر مغربی قوموں کے طویل سیاسی غلبہ نے پیدا کیا ہے مغربی قومیں جب ہمارے ملکوں پر مسلط ہوئیں۔ تو انہوں نے ہمارے قانون کو ہٹا کر اپنا قانون ملک میں رائج کیا۔ ہمارے نظامِ تعلیم کو معطل کرکے اپنا نظامِ تعلیم رائج کیا۔ تمام چھوٹی بڑی ملازمتوں سے ان سب لوگوں کو برطرف کیا۔ جو ہمارے تعلیمی نظام کی پیداوار تھے۔ اور ہر ملازمت ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دی جو ان کے قائم کردہ نظامِ تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے تھے۔ معاشی زندگی میں اپنے ادارے اور طور طریقے رائج کئے۔ اور معیشت کا میدان بھی رفتہ رفتہ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہو گیا۔ جنہوں نے مغربی تہذیب و تعلیم کو اختیار کیا۔ اس طریقہ سے انہوں نے ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن اور اس کے اصولوں اور نظریات سے انحراف کرنے والی ایک نسل خود ہمارے اندر پیدا کر دی جو اسلام اور اس کی تاریخ اس کی تعلیمات اور اس

کی روایات ہر چیز سے عملی طور پر بھی بیگانہ نہ رہے ۔اور اپنے رجحانات کے اعتبار سے بھی بیگانہ نہ ہو یہی وہ چیز ہے جو دراصل ہمارے اسلام کی طرف پلٹنے سے مانع ہے اور یہی اس غلط فہمی کا موجب بھی ہے ۔کہ اسلام اس وقت قابلِ عمل نہیں ہے جن لوگوں کو ساری تعلیم اور تربیت غیر اسلامی طریقے پر دی گئی ہو وہ آخر اس کے سوا اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں ۔کہ اسلام قابلِ عمل نہیں ہے کیونکہ نہ تو وہ اسلام کو جانتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار کئے گئے ہیں جس نظامِ زندگی کے لئے وہ تیار کئے گئے ہیں اسی کو وہ قابلِ عمل تصوّر کر سکتے ہیں ۔اب لامحالہ ہمارے لئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں ۔یا تو ہم من حیث القوم کافر ہو جانے پر تیار ہو جائیں ۔اور خواہ مخواہ اسلام کا نام لے کر دنیا کو دھوکا دینا چھوڑ دیں ۔یا پھر خلوص اور ایمانداری کے ساتھ (منافقانہ طریق سے نہیں) اپنے موجودہ نظامِ تعلیم کا جائزہ لیں ۔اور اس کا پورے طریقے سے تجزیہ کر کے دیکھیں کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہم کو اسلام سے منحرف بنانے والی ہیں ۔اور اس میں کیا تغیرات کئے جائیں جن سے ہم ایک اسلامی نظام کو چلانے کے قابل لوگ تیار کر سکیں ۔مجھے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے تعلیمی کمیشن نے اس مسئلہ کی طرف کوئی دلچسپی ہوئی توجہ بھی نہیں کی ۔یہ مسئلہ بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل ہے اور جب تک ہم اسے حل نہیں کر لیں گے اس وقت تک اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ کبھی ہموار نہ کر سکیں گے ۔

ابن خلدون کے کسی نظریہ کی طرف رجوع کرنے سے اس مسئلہ کو حل کرنے میں مدد نہیں مل سکتی کیونکہ اس مسئلہ کی حقیقی نوعیت یہ ہے کہ مغربی استعمار رخصت ہوتے ہوئے ہمارے ملکوں میں اس نسل کو حکمران بنا کر چھوڑ گیا ہے جس کو اس نے اپنی تعلیم اور اپنی تہذیب کا دودھ پلا پلا کر اس طرح تیار کیا تھا کہ وہ جسمانی حیثیت سے تو ہماری قوم کا حصہ ہے لیکن عملی اور ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے انگریزوں فرانسیسیوں یا ولندیزیوں کا پورا جانشین ہے ۔اس طبقہ کی حکومت جو مشکلات پیدا کرتی ہے ان کو رفع کرنے کا معاملہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے جسے حل

کرنا ابن خلدون کے نظریات کا کام نہیں، اس کے لئے بڑے سنجیدہ غور و فکر کی اور حالات کو سمجھ کر اصلاح کے لئے نئی راہیں نکالنے کی ضرورت ہے ۔

سوال نمبر ۴۔

اگر اسلامی نظریۂ حکومت کی افادیت بین الاقوامی طور پر عوامی جمہوریت کی شکل میں تسلیم کر لی جائے تو:۔

ا۔ بالخصوص مسلم ممالک میں کیا سربراہ حکومت The head of the (State) ایک مسلمان کے علاوہ ایک غیر مسلم بھی (خواہ قائم مقام سربراہ ملک کی حیثیت سے ہی) عہدہ سنبھال سکے گا؟ یا

(ب) اس وقت قانون ساز اسمبلی کا سپیکر غیر مسلم چنا جا سکے گا؟

(ج) یا عدلیہ کے کسی منصب پر فائز ہو سکے گا جیسا کہ پاکستان میں ایک رومن کیتھولک عیسائی (اپنی انصاف پسندی، قابلیت (Seniority) کی بنا پر) چیف جسٹس جیسے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہے؟

(د) اگر اسلامی مملکت میں یہی نظم قائم رہے کیونکہ تمام ڈھانچہ (set up) یکدم بدل دینا ممکن نہ ہوگا۔ تو کیا پھر بھی قابلیت پر مذہب کو ہی ترجیح دینا اس ترقی یافتہ دور میں مبنی بر انصاف ہوگا؟۔

جواب

۴۔ اگر اسلامی نظریہ پر کوئی حکومت قائم ہو تو اس کا سربراہ مملکت یا چیف جسٹس یا اس کی قانون ساز اسمبلی کا صدر کوئی غیر مسلم نہیں ہو سکتا۔ اس کے معنی قابلیت پر مذہب کو ترجیح دینے کے نہیں ہیں، اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک نظریاتی مملکت میں اس طرح کے مناصب صرف انہی لوگوں کو دیئے جا سکتے ہیں جو اس کے بنیادی نظریہ کو مانتے ہوں نظریاتی مملکت میں قابلیت محض علمی قابلیت کا نام نہیں ہوتا بلکہ اس میں اس نظریہ کو جس پر مملکت قائم کی گئی ہے جاننا اور اس کی اسپرٹ

کو سمجھنا اور ایمانداری کے ساتھ اس کو عمل میں لانا بھی قابلیت ہی کا ایک لازمی جزو قرار دیا جاتا ہے اس پر اگر کسی کو اعتراض ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ انگلستان میں کیا ایک رومن کیتھولک بادشاہ ہو سکتا ہے - یا امریکہ میں کسی کیمونسٹ کو صدارت کا منصب دیا جا سکتا ہے اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر ہم پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے -

سوال نمبر ۴

اسلامی مملکت میں اقلیتی فرقوں کو مثلاً عیسائی، یہودی، بدھ، جین، پارسی، ہندو وغیرہ کو دیگر مسلمانوں کی طرح پورے حقوق حاصل ہوں گے؟

ا - کیا ان کو اپنے مذہب کی تبلیغ بھی اسی طرح کرنے کی اجازت ہوگی جیسا کہ آج کل پاکستان اور دیگر ممالک میں کھلے بندوں پرچار ہوتا ہے -؟

ب - کیا اسلامی مملکت میں ایسے مذہبی یا نیم مذہبی ادارے مثلاً ادارہ مکتی فوج (Salvation Army) یا کیتھڈرل، کانونٹ، سینٹ جان و سینٹ فرانسز وغیرہ جیسے ادارے کیا قانوناً بند کر دیئے جائیں گے (جیسا کہ حال ہی سیلون میں ہوا یا دو ایک ممالک میں ہو چکا ہے)؟

ج - فراخدلی سے مسلمان بچوں کو وہاں بھی ماڈرن ایجوکیشن حاصل کرنے کی عام اجازت ہوگی؟ -

د - کیا اس صدی میں بھی ان اقلیتی فرقوں سے جزیہ وصول کرنا مناسب ہو گا (عالمی حقوق انسانی کی روشنی میں بھی) جبکہ وہ نہ صرف فوج بلکہ سرکاری عہدوں پر فائز اور حکومت کے وفادار ہوں -

جواب

۴ - اسلامی مملکت میں غیر مسلم گروہوں کو تمام مدنی حقوق (Civil Rights) مسلمانوں کی طرح حاصل ہوں گے - مگر سیاسی حقوق (Political Rights) مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتے اور اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر سوال نمبر ۳ میں بیان

کی گئی ہے۔ اسلام میں ریاست کے نظام کو چلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور مسلمان اس بات پر مامور ہیں۔ کہ جہاں بھی ان کو حکومت کے اختیارات حاصل ہوں وہاں وہ قرآن اور سنت کی تعلیمات کے مطابق حکومت کا نظام چلائیں چونکہ غیر مسلم نہ قرآن اور سنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اس کی اسپرٹ کے مطابق ایمانداری سے کام چلا سکتے ہیں۔ اس لئے وہ اس ذمہ داری میں شریک نہیں کئے جا سکتے البتہ نظم ونسق میں ایسے عہدے ان کو دیئے جا سکتے ہیں جن کا کام پالیسی بنانا نہ ہو۔ اس معاملہ میں غیر مسلم حکومتوں کا طرزِ عمل منافقانہ ہے اور اسلامی حکومت کا طرزِ عمل صاف صاف ایماندارانہ۔ مسلمان اس بات کو صاف صاف کہتے ہیں اور اس پر عملدرآمد کرنے میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری ملحوظ رکھتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی شرافت اور فراخ دلی کا برتاؤ کرتے ہیں غیر مسلم بظاہر کاغذ پر قومی اقلیتوں (National minorities) کو سب قسم کے حقوق دے دیتے ہیں بگر عملاً انسانی حقوق تک نہیں دیتے۔ اس میں اگر کسی کو شک ہو تو دیکھ لے کہ امریکہ میں سیاہ فام لوگوں (Negroes) کے ساتھ اور روس میں غیر کمیونسٹ یا شتمدوں کے ساتھ چین اور ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے میں نہیں سمجھتا کہ خواہ مخواہ دوسروں سے شرما کر ہم اپنے مسلک کو صاف صاف کیوں نہ بیان کریں اور اس پر صاف صاف کیوں نہ عمل کریں۔

جہاں تک غیر مسلموں کی تبلیغ کا معاملہ ہے اس کے بارے میں یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ جب تک ہم بالکل خودکشی کے لئے تیار نہ ہو جائیں ہمیں یہ حماقت نہ کرنی چاہیئے کہ اپنے ملک کے اندر ایک طاقتور اقلیت پیدا ہونے دیں۔ جو غیر ملکی سرمایہ سے پرورش پائے اور بڑھے اور جس کی پشت پناہی بیرونی حکومتیں کر کے ہمارے لئے وہی مشکلات پیدا کریں۔ جو ایک مدت دراز تک ٹرکی کے لئے عیسائی اقلیتیں پیدا کرتی رہی ہیں۔

عیسائی مشنریوں کو یہاں مدارس اور ہسپتال جاری رکھ کر مسلمانوں کے

ایمان خریدنے کی کوشش کرنے اور مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اپنی ملت سے بیگانہ (De-Nationalise) کرنے کی کھلی اجازت دینا بھی میرے نزدیک قومی خودکشی ہے ہمارے حکمران اس معاملے میں انتہائی کم نظری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان کو قریب کے فائدے تو نظر آتے ہیں مگر دوررس نتائج دیکھنے سے ان کی آنکھیں عاجز ہیں۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم اُس حالت کے لئے دیا گیا ہے جبکہ وہ یا تو مفتوح ہوئے ہوں یا کسی معاہدہ کی رو سے جزیہ دینے کی واضح شرط پر اسلامی حکومت کی رعایا بنائے گئے ہوں۔ پاکستان میں چونکہ یہ دونوں صورتیں پیش نہیں آئی ہیں۔ اس لئے یہاں غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرنا میرے نزدیک شرعاً ضروری نہیں ہے۔

سوال نمبر ۵

کیا اسلامی ملک میں ان مغربی مستشرقین غیر مسلم اسکالرز اور پروفیسروں کو تعلیم یا تقریر کے لئے مدعو کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے اپنے نقطۂ نظر سے اسلام کے موضوعات پر کتابیں لکھتے ہوئے نہ صرف اسلام پر بے جا تنقیدی تبصرے کئے ہیں۔ بلکہ عمداً یا کم علمی و تعصب سے اسلامی تاریخ لکھنے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اہل بیت، خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور آئمہ کرام (جن پر اسلام اور مسلمانوں کو فخر ہے) کی شان میں نازیبا فقرات لکھ کر ہدف ملامت بنایا ہے مثلاً امریکی و برطانوی قابل ترین پروفیسروں کی نظر ثانی شدہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں بھی دیگر اعتراضات کے علاوہ رسول مقبولؐ کی ازواج مطہرات کو (Concubines) (لونڈیاں) لکھا ہے۔

و۔ ان میں اکثر کے یہاں آ کر لیکچر اور خطبات دینے اور ان کی تشہیر کرنے پر کیا اسلامی حکومت بالکل پابندی عائد نہ کر دے گی؟۔

ب۔ ان کتابوں اور زہر آلودہ لٹریچر کی ہماری لائبریریوں میں موجودگی گوارا کی جا سکتی ہے؟ حکومت ان کے جوابات و تردید شائع کرنے، ان کی تصحیح کرانے یا ان سے رجوع کرانے کے لئے کیا اقدام کر سکتی ہے۔

جواب

یہ زمانے کے انقلاب ہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ یورپ کے عیسائی اُندلس (Spain) جاکر مسلمانوں سے انجیل کا سبق لیا کرتے تھے اب معاملہ اتنا ہو گیا ہے کہ مسلمان یورپ والوں سے پوچھتے ہیں۔ کہ اسلام کیا ہے اور اسلام کی تاریخ اور اس کی تہذیب کیا ہے۔ حتیٰ کہ عربی زبان بھی مغربی مستشرقین سے سیکھی جاتی ہے مغربی ممالک سے استاد درآمد کر کے ان سے اسلامی تاریخ پڑھوائی جاتی ہے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ وہ لکھتے ہیں نہ صرف اسے پڑھا جاتا ہے بلکہ اس پر ایمان بھی لایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ خود اپنے مذہب اور اس کی تاریخ کے متعلق اپنے ہم مذہبوں کے سوا کسی کی رائے کو ذرہ برابر دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے یہودیوں نے اپنی انسائیکلو پیڈیا (Jewish Encyclopaedia) شائع کی ہے اور اس میں کوئی ایک مضمون (Artical) بھی کسی مسلمان تو در کنار کسی عیسائی مصنف کا بھی نہیں ہے بائبل کا ترجمہ بھی یہودیوں نے اپنا کیا ہے۔ عیسائیوں کے ترجمے کو وہ ہاتھ نہیں لگاتے۔ اس کے برعکس یہودی مصنفین اسلام کے متعلق مضامین اور کتابیں لکھتے ہیں۔ اور مسلمان ہاتھوں ہاتھ ان کو لیتے ہیں۔ اور ان کا یہ حق مانتے ہیں کہ ہمارے مذہب اور ہماری فقہ اور ہماری تہذیب اور ہمارے بزرگوں کی تاریخ کے متعلق وہ محققانہ کلام فرمائیں۔ اور ہم یہ چیزیں ان سے سیکھیں۔ یہ صورت حال کسی صحیح اسلامی حکومت میں نہیں رہ سکتی۔ اور نہ ہی رہنی چاہئے۔ اور کوئی وجہ نہیں۔ کہ رہ سکے۔ اسلامی حکومت بھی ہو اور اسلام اور مسلمان یتیم بھی ہوں؟ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں۔ یہ رویہ مسلمانوں کی غیر اسلامی حکومت ہی کو مبارک رہے۔

سوال نمبر ۶

کیا اسلامی حکومت موجودہ دور میں جبکہ ایک ملک دوسرے ملک سے قطع تعلق کرکے ترقی نہیں کرسکتا۔ غیر ممالک سے متعلق اقتصادی، فوجی، ٹیکنیکل امداد یا بین الاقوامی بینک سے شرح سود پر قرض لینا بالکل حرام قرار دے گی؟

ا۔ پھر، مادی، صنعتی، زراعتی و سائنسی ترقی وغیرہ کی جو عظیم خلیج مغربی ترقی یافتہ (Advanced) ممالک اور مشرقی وسطیٰ بالخصوص اسلامی ممالک یا اس ایٹمی دور میں Have اور Have not کے درمیان حائل ہے کس طرح پر ہو سکے گی؟

ب نیز کیا اندرون ملک تمام بینکنگ وانشورنس سسٹم ترک کرنے کا حکم دیا جائے گا؟۔

ج۔ سود، پگڑی، منافع، ورِبح اور گڈول (Good Will) و خرید وفروخت میں دلالی کمیشن کے لئے کوئی سی اجتہادی راہ نکالی جاسکتی ہے؟

د کیا اسلامی ممالک آپس میں سود، منافع۔ ربح وغیرہ پر کسی صورت میں قرض کا لین دین کر سکتے ہیں؟۔

جواب

اسلامی حکومت نے کسی دور میں بھی غیر مسلم ممالک سے قطع تعلق کی پالیسی اختیار نہیں کی۔ اور نہ آج کرے گی۔ لیکن تعلق کے معنی قرض مانگتے پھرنے کے نہیں ہیں اور وہ بھی ان کی شرائط پر۔ یہ تعلق اس زمانے کے کم ہمت لوگوں نے ہی پیدا کیا ہے اگر کسی ملک میں ایک صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو وہ مادی ترقی سے پہلے اپنی قوم کی اخلاقی حالت سدھارنے کی کوشش کرے گی۔ اخلاقی حالت سدھارنے کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے حکمران اور اس کی انتظامی مشینری کے کارپرداز اور قوم کے افراد ایماندار ہوں۔ اپنے حقوق سے پہلے اپنے فرائض کو ملحوظ رکھنے اور سمجھنے والے

ہوں۔ اور سب کے سامنے ایک بلند نصب العین ہو جس کے لئے جان، مال اور وقت اور محنتیں اور قابلیتیں سب کچھ قربان کرنے کے لئے وہ تیار ہوں نیز یہ کہ حکمرانوں کو قوم پر اور حکمرانوں پر قوم کو پورا اعتماد ہو۔ اور قوم ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھے کہ اس کے سربراہ درحقیقت اس کی فلاح کے لئے کام کر رہے ہیں۔ یہ صورتِ حال اگر پیدا ہو جائے تو ایک قوم کو باہر سے سود پر قرض مانگنے کی صورت پیش نہیں آسکتی۔ ملک کے اندر جو ٹیکس لگائے جائیں گے وہ سو فیصدی وصول ہوں گے۔ اور سو فیصدی ہی وہ قوم کی ترقی پر صرف ہوں گے۔ نہ ان کی وصول یابی میں بے ایمانی ہو گی۔ اور نہ ان کے خرچ میں بے ایمانی ہو گی۔ اس پر بھی اگر قرض کی ضرورت پیش آئے تو قوم خود سرمایہ کا ایک بڑا حصہ رضاکارانہ چندے کی صورت میں اور ایک اچھا خاصہ غیر سودی قرض کی صورت میں اور ایک حصہ منافع میں شرکت کے اصول پر فراہم کرنے کو تیار ہو جائے گی۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پاکستان میں اگر اسلامی اصولوں کا تجربہ کیا جائے تو شاید بہت جلد ہی پاکستان دوسروں سے قرض لینے کے بجائے دوسروں کو قرض دینے کے لئے تیار ہو جائے گا۔

بالفرض اگر ہمیں بیرونی قوموں سے سود پر قرض لینے کی کوئی ناگزیر صورت پیش آ ہی جائے یعنی ہمیں اپنی ضرورت کو پورا کرنا بھی لازم ہو اور اس کے لئے ملک میں سرمایہ بھی نہ مل سکے تو دوسروں سے سود پر قرض لیا جا سکتا ہے۔ لیکن ملک کے اندر سودی لین دین جاری رکھنے کا پھر بھی کوئی جواز نہیں ملک میں سود بند کیا جا سکتا ہے اور پورا مالی نظام (Financial System) سود کے بغیر چلایا جا سکتا ہے میں اپنی کتاب "سود" میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ بینکنگ کا نظام سود کے بجائے منافع میں شرکت (Profit Sharing) کے اصول پر چلایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انشورنس کے نظام میں ایسی ترمیمات کی جا سکتی ہیں جن سے انشورنس کے سارے فوائد غیر اسلامی طریقہ اختیار کئے بغیر حاصل ہو سکیں دلالی، سود، پگڑی یا کمیشن یا گڈ ول (Good will) وغیرہ کی علیحدہ علیحدہ شرعی پوزیشن ہے جب اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آئے گا تو اس کا جائزہ لے کر یا تو سابق پوزیشن

بحال رکھی جائے گی یا پھر ضروری اصلاحات کی جائیں گی۔

سوال نمبر

اس برصغیر میں چونکہ تمام قانونی ضابطہ ہائے دیوانی، فوجداری، مالیاتی اور عملدرآمد (Procedural Law) وغیرہ عرصے سے ہر عدالت میں جاری و ساری ہیں اور چونکہ ڈیڑھ صدی سے تمام لوگ بالخصوص جج و وکلاء وغیرہ نہ صرف ان قوانین سے پوری طرح مانوس بلکہ اس کا وسیع علم رکھتے ہیں اس لئے بھی اسلامی مملکت کے قیام سے یہاں برطانوی دور کے نظام عدل British (Rule of Law) کا سارا ڈھانچہ بدلنا ممکن نہ ہوگا۔ تو کیا پھر بھی عدالتی ریفارم لائی جائیں گی جبکہ اسلامی قانون کسی پہلو سے جامع، مرتب یا مکمل اور مدوّن (Codified) نہیں ہے۔

ا۔ اسلامی عدالتی نظام میں وکلاء کی حیثیت کیا ہوگی؟ کیا اسی طرح (Procedural Law) کے تحت انہیں مقدمہ جات لڑنے اور مقدمہ بازی (Litigation) کو طول دینے کا اختیار ہوگا۔

ب۔ کیا اس موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی چور کے ہاتھ کاٹنے اور زانی کو سنگسار کرنے کی سزائیں دی جائیں گی۔

ج۔ کیا قاضیوں کو موجودہ نافذ قانون شہادت (Evidence Law) کی مدد کے بغیر فیصلے صادر کرنے ہوں گے۔

د۔ پھر بین الاقوامی قسم کے ادارے مثلاً اقوام متحدہ (United Nations) کی جنرل اسمبلی سیکورٹی کونسل بین الاقوامی عدالت انصاف یا کمرشل ٹریبونل اور لیبر قوانین وغیرہ کی عملداری دخل اندازی یا انٹرنیشنل لاء پر عمل پیرا ہونے اور ان کی من وعن قبولیت کے لئے اسلامی حکومت کا کیا رویہ ہوگا۔؟

س۔ اگر اسی قسم کے ادارے اسمبلی کنفیڈریشن یا اسلامی بلاک بنا کر عمل میں لائے

جائیں۔ تو ان کو کیا حیثیت حاصل ہو گی؟

ص۔ کیا اسلامی قانون ساز اسمبلی کے پاس شدہ یا اجتہادی احکام کی اسلامی عدلیہ کو نظر ثانی (review) کرنے کا اختیار ہو گا؟

ط۔ اسلامی ممالک اور تمام مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر لانے کے لئے اختلافات کس طرح رفع کئے جا سکتے ہیں؟

جواب

اس سوال کے جواب میں یہ بات پہلے ہی سمجھ لینی چاہیئے کہ جب انگریزی حکومت اس ملک میں آئی تھی تو اس وقت سارا قانونی نظام (legal system) اسلامی فقہ پر قائم تھا۔ انگریزوں نے آکر اس کو یک لخت تبدیل نہیں کیا۔ بلکہ انگریزی حکومت میں سالہا سال تک اسلامی نظام ہی چلتا رہا۔ انگریز اس کو تدریجاً تبدیل کرتے رہے اور رفتہ رفتہ انہوں نے اپنا نظام رائج کیا۔ اب اگر ہم اسلامی نظام قانون کو از سر نو قائم کرنا چاہیں۔ تو یہ تبدیلی بھی یک لخت نہیں، تدریجاً ہی ہو گی۔ اور اس کے لئے بہت حکمت کے ساتھ ایک ایک قدم اٹھانا پڑے گا۔ اسلامی قوانین اگر مدون (Codified) نہیں ہیں۔ تو ان کے مدون (Codify) کرنے میں کوئی وقت نہیں ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون کی شرحیں کثرت سے موجود ہیں۔ ان کو آسانی سے اردو زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اور آگے نئی شرحوں کا سلسلہ چل سکتا ہے۔

اسی موجودہ ترقی یافتہ دور میں سعودی عرب میں زنا اور چوری کی سزائیں جاری ہیں۔ اور تجربے نے تمام دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انہی سزاؤں کی وجہ سے سعودی عرب میں جرائم کی اتنی کمی ہو گئی ہے جتنی دنیا کے کسی ملک میں نہیں ہے اب اگر اس دور کے ترقی یافتہ ہونے کے معنی یہی ہیں۔ کہ جرائم میں ترقی ہو تو بسم اللہ، مغربی قانونی سسٹم پر عمل کرتے رہیئے۔ لیکن جرائم کا انسداد بھی اگر ترقی کے لئے ضروری ہے تو پھر یہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی قانون سے زیادہ کارگر کوئی قانون نہیں ہے دراصل اس زمانے کی مغربی تہذیب کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی ساری ہمدردیاں

مجرموں کے ساتھ ہیں۔ اسی لیئے یہ نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے کہ یہ سزائیں وحشیانہ ہیں اس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ چوری کرنا کوئی وحشیانہ کام نہیں ہے البتہ اس پر ہاتھ کاٹنا وحشیانہ کام ہے اور زنا کا ارتکاب تو مغربی تہذیب میں ایک تفریح ہے ہی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس خیال کا ماخذ کیا ہے کہ اسلامی قانون میں قاضیوں کو قانون شہادت (Law of Evidence) کی مدد کے بغیر فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے یا کوئی ایسا دستورالعمل رہا ہے۔ حالانکہ خود قرآن نے قانون شہادت کے بہت سے اصول بیان کیئے ہیں۔ اور اس کی بیشتر تشریحات حدیث اور خلفائے راشدین کے فیصلوں سے ملتی ہیں۔ بالخصوص فقہاء نے ان اصولوں کو نہایت محنت سے ترتیب دیا ہے اور اسلامی دور میں کوئی ایسا قاضی نہیں گزرا جس نے ثبوت کے بغیر فیصلے صادر کئے ہوں۔

وکالت کے بارے میں میرے نزدیک صرف اتنی اصلاح درکار ہے کہ قانون کی پریکٹس بند کردی جائے۔ اور وکلاء کو اسٹیٹ معاوضہ دے۔ اب بھی قانون کا نظریہ یہ ہے کہ وکیل کا اصل کام اپنے موکل کی حمایت کرنا نہیں ہے بلکہ عدالت کو قانون سمجھنے اور منطبق (Apply) کرنے میں مدد دینا ہے۔ وکالت کے پیشہ بن جانے کی وجہ سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے۔ کہ وکیل عدالت کو گمراہ (Mislead) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گواہوں کو سکھاتے پڑھاتے ہیں۔ عدالت کے سامنے مقدمے کی روئداد غلط لانے کی کوشش کرتے ہیں مقدمات کو طول بھی دیتے ہیں اور مقدمہ بازی کو بڑھاتے بھی ہیں۔

بین الاقوامی قسم کے تمام اداروں میں ہم شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کے اندر اگر کوئی چیز بھی ہمارے اصول کے مطابق نہ ہوگی۔ تو ہم اس کی حد تک اپنی الگ پالیسی بنائیں گے اور اسی حد تک ہماری شرکت میں استثناء ہوگا۔ مسلمان ممالک خود اپنی دولت متحدہ (Confederation) یا تحالف (Common Wealth) بنا سکتے ہیں اور اسلامی اصول کے مطابق باہمی تعلقات کے طریقے مقرر کرسکتے ہیں۔

اسلامی قانون ساز اسمبلی کے طے کئے ہوئے اجتہادی احکام پر اسلامی عدلیہ نظر ثانی

(Review) نہیں کر سکتی۔ البتہ اگر وہ احکام قانون ساز اسمبلی کے اختیار سے متجاوز ہوں تو ان کی حدود اختیار سے تجاوز (Ultra vires) قرار دے سکتی ہے

اسلامی ممالک اور مسلمانوں کو ایک سطح پر لانے کے لئے اختلافات رفع کرنے کی صورت ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان ایمانداری کے ساتھ قرآن وسنت کی ہدایات پر چلنے کے لئے تیار رہوں قرآن کی تاویل اور سنت کی تحقیق میں اختلافات ہو سکتے ہیں، لیکن وہ مل کر کام کرنے میں مانع نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم اس اصول کو مان لیں کہ جو شخص بھی قرآن اور سنت کو سند وحجت (Authority) مان لے وہ ہماری برادری کا آدمی ہے تو یہ چیز کسی آدمی کو ہماری برادری سے خارج نہیں کر سکتی۔ کہ وہ قرآن کے معنی ہم سے مختلف سمجھ رہا ہے۔ اور اس کے نزدیک کسی معاملہ میں سنت سے کوئی اور بات ثابت ہوتی ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جتنی عدالتیں بھی پاکستان کے دستور اور قانون کو واجب الاطاعت قانون مان کر کام کرتی ہیں۔ وہ سب اس ملک کی جائز عدالتیں ہیں۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام عدالتوں کے فیصلے بھی یکساں ہوں۔

سوال نمبر ۸

کیا "اجتہاد" کے اس دروازے کو جسے صدیوں پیشتر بند کر دیا گیا تھا آج کھولنے کی شدید ضرورت نہیں ہے؟

(الف) اور وہ اجتہادی اصول جو آج سے ہزار سال قبل بنائے گئے تھے کیا ان کو بڑی سختی سے آج بیسویں صدی کے مسائل پر بھی نافذ کیا جائے گا؟

(ب) حکومت اس صورت حال سے کس طرح نپٹے گی جبکہ ہر طبقہ فکر یعنی (Sub-Sects) کے پیرو اپنے آئمہ کے اجتہادی احکام کو بدلنے کے خلاف ہیں۔ اور نہایت شدومد سے آج مسائل کے لئے بھی انہی کی تشریح وتوضیح کر کے فیصلے کرنے کے حق میں ہیں؟

ج۔ اگر ہر مکتب فکر کے علماء کو اکثریت آراء سے اجتماعی طور پر "اجماع" کے لئے مامور کیا جائے تو کیا جو "اجتہاد" اس طرح کیا گیا ہو وہ تمام مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول ہوگا؟

د۔ کیا حکومت کو اس پر سختی سے عمل پیرا ہونے پر مجبور کیا جا سکے گا؟

۳۔ خلاف ورزی اور مخالفت و نکتہ چینی کہاں تک برداشت ہو سکتی ہے؟

۴۔ کیا حضرت علیؓ و جعفر صادقؒ و شیعہ ائمہ کا اجتہاد اور قوانین جو نہایت مناسب ہیں، تمام مسلمانوں کے لئے اسلامی حکومت نافذ کر سکتی ہے؟

جواب

یہ سوال بہت سے اصولی سوالات پر مشتمل ہے۔ میں اس کے ایک ایک جزو کا جواب بالترتیب دوں گا۔

۱۔ اجتہاد کا دروازہ کھولنے سے کسی ایسے شخص کو انکار نہیں ہو سکتا جو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں ایک اسلامی نظام کو چلانے کے لئے اجتہاد کی اہمیت و ضرورت کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ لیکن اجتہاد کا دروازہ کھولنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی احتیاط کا متقاضی بھی ہے اجتہاد کرنا ان لوگوں کا کام نہیں ہے۔ جو ترجموں کی مدد سے قرآن پڑھتے ہوں۔ حدیث کے پورے ذخیرہ سے نہ صرف یہ کہ ناواقف ہوں بلکہ اس کو دفتر بے معنی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں پچھلی تیرہ صدیوں میں فقہائے اسلام نے اسلامی قانون پر جتنا کام کیا ہے اس سے سرسری واقفیت بھی نہ رکھتے ہوں اور اس کو فضول سمجھ کر پھینک دیں پھر اس پر مزید یہ کہ مغربی نظریات و اقدار کو لے کر ان کی روشنی میں قرآن کی تاویلیں کرنا شروع کر دیں۔ اس طرح کے لوگ اگر اجتہاد کریں گے تو اسلام کو مسخ کر کے رکھ دیں گے۔ اور مسلمان جب تک اسلامی شعور کی رمق بھی ان کے اندر موجود ہے ایسے لوگوں کے اجتہاد کو ہرگز ضمیر کے اطمینان کے ساتھ قبول نہ کریں گے اس طرح کے اجتہاد سے جو قانون بھی بنایا جائیگا۔ وہ صرف ڈنڈے کے زور سے ہی قوم پر مسلط کیا جا سکے گا۔ اور ڈنڈے کے ساتھ ہی وہ رخصت ہو جائے گا۔ قوم کا ضمیر اس کو

اس طرح اگل کر پھینک دے گا جس طرح انسان کا معدہ نگلی ہو مکھی کو اگل کر پھینک دیتا ہے مسلمان اگر اطمینان کے ساتھ کسی اجتہاد کو قبول کر سکتے ہیں۔ تو صرف ایسے لوگوں کا اجتہاد ہے۔ جن کے علم دین اور خدا ترسی اور احتیاط پر ان کو اطمینان اور بھروسہ ہو اور جن کے متعلق وہ یہ جانتے ہوں کہ یہ لوگ غیر اسلامی نظریات و تصورات کو اسلام میں نہ ٹھونسیں گے۔

ب۔ جو اجتہادی اصول آج سے ہزار سال پہلے بنائے گئے تھے وہ صرف اس لئے رد کر دینے کے قابل نہیں ہیں۔ کہ وہ ہزار سال پرانے ہیں۔ معقولیت کے ساتھ جائزہ لے کر دیکھئے کہ وہ اصول صحیح تھے کیا۔ اور اس بیسویں صدی میں ان کے سوا اور کچھ اصول بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں؟ ان میں سے پہلا اصول یہ تھا کہ آدمی اُس زبان کو اور اس کے قواعد اور محاورں اور ادبی نزاکتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے بتائیے کیا یہ اصول غلط ہے؟ انگریزی زبان میں قانون کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کیا ان کی تعبیر کا حق کسی ایسے شخص کو دیا جا سکتا ہے جو انگریزی زبان کی ایسی ہی واقفیت نہ رکھتا ہو وہاں تو ایک کاما (Comma) کے ادھر سے ادھر ہو جانے سے معنی میں عظیم فرق پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ بسا اوقات ایک کاما کی تبدیلی کے لئے پارلیمنٹ کو ایک قانون (Act) پاس کرنا پڑتا ہے مگر یہاں یہ مطالبہ ہے کہ قرآن کی وہ لوگ تعبیر کریں گے جو ترجموں کی مدد سے قرآن سمجھتے ہوں۔ اور ترجمے بھی وہ جو انگریزی زبان میں ہوں دوسرا اصول یہ ہے کہ آدمی نے قرآن مجید کا اور ان حالات کا جن حالات میں قرآن مجید نازل ہوا ہے گہرا اور وسیع مطالعہ کیا ہو۔ کیا اس اصول میں کوئی غلطی ہے کیا موجودہ قوانین کی تعبیر کا حق کسی ایسے شخص کو دیا جا سکتا ہے جس نے قانون کی کسی کتاب کا محض سرسری مطالعہ کر لیا ہو یا اس کا محض ترجمہ پڑھ لیا ہو؟ تیسرا اصول یہ ہے کہ آدمی اس عمل درآمد سے اچھی طرح واقف ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی قوانین پر ہوا ہے ظاہر بات یہ ہے کہ قرآن خلا میں سفر کرتا ہوا براہِ راست ہمارے پاس نہیں پہنچ گیا ہے اس کو خدا کی طرف سے ایک نبی لایا تھا

اس نبی نے اس کی بنیاد پر افراد تیار کئے تھے معاشرہ بنایا تھا ایک ریاست قائم کی تھی ہر بار آدمیوں کو اس کی تعلیم دی تھی اور اس کے مطابق کام کرنے کی تربیت دی تھی ان ساری چیزوں کو آخر کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے ۔ ان کا جو ریکارڈ موجود ہے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف قرآن کے الفاظ سے احکام نکالنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ آدمی اسلامی قانون کی پچھلی تاریخ سے واقف ہو۔ وہ یہ جانے کہ یہ قانون کس طرح ارتقاء کرتا ہوا آج تک ہمیں پہنچا ہے پچھلی تیرہ صدیوں میں صدی بصدی اس پر کیا کام ہوا ہے اور مختلف زمانوں میں وقت کے حالات پر قرآن اور سنت کے احکام کو منطبق کرنے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے گئے ہیں اور تفصیلاً کیا احکام مرتب کئے جاتے رہے ہیں ۔ اس تاریخ اور اس کام سے واقف ہوئے بغیر اجتہاد کر کے ہم اسلامی قانون کے ارتقاء کا تسلسل (Continuity) آخر کس طرح برقرار رکھ سکتے ہیں ۔ ایک نسل اگر یہ طے کر لے کہ پچھلی نسلوں کے کئے ہوئے سارے کاموں کو چھوڑ دے گی اور نئے سرے سے اپنی عمارت بنائے گی ۔ تو ایسا ہی احمقانہ فیصلہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں کر سکتی ہیں ۔ ایک دانشمند قوم اپنے اسلاف کے کئے ہوئے کام کو برباد نہیں کرتی ۔ بلکہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس کو لے کر آگے وہ کام کرتی ہے جو انہوں نے نہیں کیا ۔ اور اس طرح مسلسل ترقی جاری رہتی ہے۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ آدمی ایمانداری کے ساتھ اسلامی اقدار اور طرز فکر اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی صحت کا معتقد ہو اور رہنمائی کے لئے اسلام سے باہر نہ دیکھے بلکہ اسلام کے اندر ہی رہنمائی حاصل کرے یہ شرط ایسی ہے جو دنیا کا ہر قانون اپنے اندر اجتہاد کرنے کے لئے لازمی طور پر لگائے گا ۔ درحقیقت اجتہاد کے یہی پانچ اصول ہیں ۔ اگر کوئی صاحب معقول دلیل سے اس بیسویں صدی کے لئے کچھ اور اصول تجویز کر سکیں تو ہم ان کے ممنون احسان ہوں گے ۔

ج ۔ مسلمانوں میں فرقوں کے جتنے اختلافات ہیں ان کے بارے میں پہلے ہی پاکستان کے علماء اس بات پر اتفاق کر چکے ہیں ۔ کہ جہاں تک پرسنل لاء کا تعلق ہے ہر فرقے

پر وہی احکام نافذ ہوں گے جو اس فرقے کے نزدیک مسلم ہیں اور جہاں تک ملکی قوانین کا تعلق ہے وہ اکثریت کے مسلک کے مطابق ہوں گے۔ کیا اس کے بعد وہ مشکلات باقی رہتی ہیں جن کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ اگر مجلس قانون ساز میں ہمارے نمائندے احتیاط کے ساتھ اس اصول پر عمل کریں۔ تو فرقہ وارانہ اختلافات آہستہ آہستہ کم ہوتے چلے جائیں گے۔ اور ہمارے قوانین کا ارتقا بڑی اچھی طرح ہو سکے گا۔

(ھ) فقہ جعفری اور شیعہ علماء کا اجتہاد اسی ملک میں نافذ کیا جا سکتا ہے جہاں شیعہ فرقے کی اکثریت ہو چنانچہ ایران میں وہ نافذ ہے لیکن پاکستان میں وہ شیعوں کے پرسنل لاء کی حیثیت سے ہی رہ سکتا ہے۔ سنی اکثریت پر اس کو نافذ کرنے کی کیسے کوشش کی جا سکتی ہے؟

سوال نمبر ۹

کیا "اجتہاد" جو کیا جائے گا وہ قرآن و حدیث و سابقہ اجتہادی احکام و قوانین جو خلفائے راشدین کے عہد میں نافذ کئے گئے تھے ان کے محض الفاظ پر ہی زور دے کر عمل کیا جائے گا یا آیت و حدیث کی صحیح اسپرٹ کو مدنظر رکھ کر کن اور کیسے دگرگوں حالات و ماحول و رجحان کے تحت وہ جاری ہوئیں؟

ا۔ آج موجودہ قانونی دفعات میں بھی الفاظ (Wording of the Section) کی بندش جتنی اہمیت رکھتی ہے اس سے زیادہ دیباچۂ قانون (Preamble) اہمیت رکھتا ہے جس کی روشنی میں آئین و قانون کی دفعات تک کالعدم قرار دے دی جاتی ہیں۔ فرض کیجئے جیسا کہ مسلمان روزہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک رکھتے ہیں لیکن نماز روزہ کے لئے اوقات کا تعین قطبین (Pollars) پر رہنے والے مسلمانوں کے لئے کیا ہوگا۔ جہاں مہینوں لمبی راتیں اور دن ہوتے ہیں؟

ب۔ اور فرض کیجئے کہ کسی خطہ میں قربانی کے لئے گائے، بیل، اونٹ، بھیڑ، بکری، دنبہ وغیرہ دستیاب نہ ہوتے ہوں اور مثلاً وہاں صرف سوّر، خرگوش، مچھلی، گینڈے، ہاتھی اور کتے وغیرہ موجود ہوں یا کچھ نہ ہوں تو وہاں قربانی کی کیا صورت ہوگی؟

ج۔ کیا قربانی کی صحیح اسپرٹ وا صل جذبے کے تحت جانور جتنی مالیت رقم کی صورت میں حکومتِ وقت کے بیت المال میں اگر جمع کردی جائے یا قوم کی فلاح وبہبود پہ خرچ کردی جائے تو کیا شریعت اس پر اکتفا کرے گی؟

جواب

اجتہاد کے لئے الفاظ اور سپرٹ دونوں ہی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے لیکن اسپرٹ کا سلسلہ خاصا پیچیدہ ہے اگر اسپرٹ سے مراد وہ چیز ہے جو بحیثیت مجموعی قرآن کی تعلیمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل، خلفائے راشدین کے عمل اور بحیثیت مجموعی فقہائے امت کے فہم سے ظاہر ہوتی ہے تو بلاشبہ یہ اسپرٹ ملحوظ رکھنے کے قابل ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر الفاظ قرآن اور سنت سے لئے جائیں اور اسپرٹ کہیں اور سے لائی جائے تو یہ سخت قابل اعتراض چیز ہے۔ اور ایسی اسپرٹ کو ملحوظ رکھنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ ہم خدا اور رسول کا نام لے کر ان سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں۔

قطبین کے متعلق روزہ اور نماز کے معاملہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا۔ کہ قرآن اور حدیث کی رو سے اصل مقصود خدا کی عبادت ہے یا ان دونوں عبادتوں کو ان خاص اوقات کے اندر ادا کرنا جن کی علامات قرآن اور سنت میں بتائی گئی ہیں۔ تمام دنیا کا یہ مسلم قاعدہ ہے کہ کسی حکم سے جو اصل مقصود ہو وہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور اگر اس حکم کے متعلقات میں سے کوئی چیز ایسی آجائے۔ جس کی پابندی کرنے کے ساتھ حکم کے مقصد کو پورا نہ کیا جاسکتا ہو تو مقصد میں ترمیم کرنے کے بجائے ان متعلقات میں ترمیم کی جائے گی۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ قرآن مجید اور سنت کی رو سے نماز ادا کرنا اور روزہ رکھنا اصل مقصد ہے اور جو اوقات ان عبادتوں کے لئے مقرر کئے گئے ہیں وہ زمین کی بہت بڑی آبادی کی سہولت کو ملحوظ رکھ کر مقرر کئے گئے ہیں۔ زمین کی آبادی کا بہت بڑا حصہ ان علاقوں میں

آباد ہے۔ جہاں رات دن کا الٹ پھیر چوبیس گھنٹوں میں ہو جاتا ہے۔ اور اُن علاقوں میں چونکہ اکثریت کے پاس ہر وقت گھڑی نہیں رہ سکتی۔ اس لئے ان کی سہولت کو مدِ نظر رکھ کر اوقات کے لئے وہ علامات بیان کی گئی ہیں۔ جو افق پر یا آسمان پر ظاہر ہونے والی ہیں۔ تاکہ ہر انسان اپنی عبادت کے لئے اوقات باسانی معلوم کر لے قطبین پر انسانی آبادی کا بہت چھوٹا حصہ آباد ہے۔ اس آبادی کو نماز اور روزے کے احکام پر عمل کرنے کیلئے اپنے حالات کے لحاظ سے اوقات مقررہ میں مناسب ترمیمیں کرنی ہوں گی کیونکہ ان اوقات کی پابندی اور عبادت کی ادائیگی دونوں ایک ساتھ نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے عبادت کے حکم کو اوقات کے حکم پر قربان نہیں کیا جا سکتا ہے۔

قربانی کے حکم پر عمل کرنے کے صرف دو اصول مدِ نظر رکھنے ہوں گے ایک تو یہ کہ جانور وہ ہو جو اسلام میں حرام نہیں کیا گیا ہے دوسرے یہ کہ جانور وہ ہو جو کسی آبادی میں مویشی (cattle) کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہو اس طرح قربانی کے حکم پر دنیا کی ہر آبادی میں عمل کیا جا سکتا ہے قربانی بہر حال جانور ہی کی ہونی چاہیئے اس کے بدلے میں کوئی مالی انفاق کی شکل اختیار نہیں کی جا سکتی میں اس موضوع پر تفصیلی بحث اپنے رسالے "مسئلہ قربانی" میں کر چکا ہوں۔

سوال نمبر ۱

موجودہ آزاد تمدنی دور میں بھی کیا غرباء و مساکین کے لئے امراء اور رؤسا سے زکوٰۃ فنڈ جبراً وصول کیا جانا مناسب ہو گا جبکہ وہ دیگر کئی ٹیکسوں کے علاوہ انکم ٹیکس بھی حکومتِ وقت ہی کو ادا کرتے ہوں؟

جواب

زکوٰۃ کے متعلق پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ یہ ٹیکس نہیں ہے بلکہ ایک عبادت اور رکن اسلام ہے جس طرح نماز، روزہ اور حج ارکان اسلام ہیں جس شخص نے بھی کبھی قرآنِ مجید کو آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ دیکھ سکتا ہے کہ قرآن بالعموم نماز

اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے۔ اور اسے اُس دین کا ایک رکن قرار دیتا ہے جو ہر زمانے میں انبیاء کرام کا دین رہا ہے۔ اس لئے اس کو ٹیکس سمجھنا اور ٹیکس کی طرح اس سے معاملہ کرنا پہلی بنیادی غلطی ہے۔ ایک اسلامی حکومت جس طرح اپنے ملازموں سے دفتری کام اور دوسری خدمات لے کر یہ نہیں کہہ سکتی کہ اب نماز کی ضرورت باقی نہیں کیونکہ انہوں نے سرکاری ڈیوٹی دے دی ہے اس طرح وہ لوگوں سے ٹیکس لے کر یہ نہیں کہہ سکتی کہ اب زکوٰۃ کی ضرورت باقی نہیں کیونکہ ٹیکس لے لیا گیا ہے اسلامی حکومت کو اپنے نظام اوقات لازماً اس طرح مقرر کرنے ہوں گے تاکہ اس کے ملازمین نماز وقت پر ادا کر سکیں۔ اسی طرح اس کو اپنے ٹیکسیشن کے نظام میں زکوٰۃ کی جگہ نکالنے کے لئے مناسب ترمیمات کرنی ہوں گی۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئیے کہ حکومت کے موجودہ ٹیکسوں سے کوئی ٹیکس ان مقاصد کے لئے اس طرح استعمال نہیں ہوتا ہے جن کے لئے قرآن میں زکوٰۃ فرض کی گئی ہے اور جس طرح اس کے تقسیم کرنے کا حکم ہے۔

سوال نمبر ۱۱

مسلمانوں کے جذبۂ "جہاد" کو زندہ رکھنے کے لئے آج بیسویں صدی میں کیا طریق کار اختیار کیا جائے گا۔ جبکہ آج کی جنگ شمشیر و سناں سے یا میدانِ جنگ میں صف آرا ہو کر دست بدست نبرد آزمائی سے نہیں ہوتی بلکہ سائنسی ہتھیاروں۔ دماغوں (Strategy) اور (espionage) سے لڑی جاتی ہے۔

اور آپ ایٹم بم، راکٹ، میزائل اور مشینی ایجادات وغیرہ کا سہارا لے کر اس سائنسی و ایٹمی دور میں "جہاد" کی تشریح کس طرح کریں گے۔

ب۔ کیا چاند مریخ و مشتری پر اترنے اور سٹیلائیٹ چھوڑنے یا فضا میں راکٹ سے پرواز کرنے اور نت نئی ایجادات کرنے والے مجاہدین کے زمرے

میں آسکتے ہیں؟

ج انتظامی امور اور ملکی نظام (Civil Administration) میں فوج کو کیا مقام دیا جاسکتا ہے؟ موجودہ دور کے فوجی انقلاب نے ملکی نظام میں فوج کی شمولیت اور افادیت بہت حد تک ثابت ہو چکی ہے کیوں نہ فوج کو دور امن میں بیٹھا کر کھلانے کے بجائے ہر فیلڈ میں قوم کی خدمت سپرد ہو؟۔

جواب

جہاد کے متعلق اولین بات یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ جہاد اور لڑائی کا پن میں بہت فرق ہے۔ اسی طرح قومی اغراض کے لئے جہاد اور چیز ہے اور جہاد فی سبیل اللہ اور چیز۔ مسلمانوں میں جس جذبہ جہاد کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے وہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک ان کے اندر ایمان ترقی کرتے کرتے اس حد تک نہ پہنچ جائے کہ وہ خدا کی زمین سے برائیوں کو مٹانے اور اس زمین میں خدا کا حکم بلند کرنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار نہ ہو جائیں۔ سردست تو ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ سب کچھ اس جذبے کی جڑ کاٹ دینے کے لئے کیا جا رہا ہے تعلیم وہ دی جا رہی ہے جو ایمان کے بجائے شک اور انکار پیدا کرے تربیت وہ دی جا رہی ہے جس سے افراد میں اور سوسائٹی میں وہ برائیاں پھیلیں جنہیں ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام کے نزدیک برائیاں ہیں۔ اس کے بعد یہ سوال لا حاصل ہے کہ مسلمانوں میں جذبۂ جہاد کیسے پیدا ہوگا۔ موجودہ حالت میں یا تو مسلمان کرائے کا سپاہی (Mercenary) بنے گا۔ یا حد سے حد قومی اغراض کے لئے لڑے گا۔ رہے سائنسی ہتھیار اور اسٹریٹیجی (Strategy) تو وہ اسباب ہیں جو جائز اغراض اور ناجائز اغراض سب کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں اگر مسلمان میں سچا ایمان موجود ہو اور اسلام کا نصب العین اس کا اپنا نصب العین بن جائے تو وہ پورے جذبے کے ساتھ تمام قابلیتیں اپنے اندر پیدا کرے گا۔ جو اس زمانے میں لڑنے کے لئے درکار ہیں اور تمام ان ذرائع اور

وسائل سے کام لے گا جو آج یا آئندہ جنگ کے لئے درکار ہوں۔

چاند اور مریخ اور مشتری پر اترنا اپنی نوعیت کے لحاظ سے کولمبس کے امریکہ پر اترنے اور واسکوڈے گاما کے جزائر شرق الہند پر اترنے سے زیادہ مختلف نہیں۔ اگر یہ لوگ مجاہد فی سبیل اللہ مانے جاسکتے ہیں تو چاند اور مریخ پر اترنے والے بھی مجاہدین بن جائیں گے۔

انتظامی امور اور ملکتی نظام (Civil Administration) میں فوج کا داخل ہونا فوج کے لئے بھی اور ملک کے لئے بھی سخت تباہ کن ہے۔ فوج بیرونی دشمنوں سے ملک کی حفاظت کرنے کے لئے منظم کی جاتی ہے ملک پر حکومت کرنے کیلئے منظم نہیں کی جاتی اس کو تربیت دشمنوں سے لڑنے کی دی جاتی ہے اس تربیت سے پیدا ہونے والے اوصاف ملک کے باشندوں سے معاملہ کرنے کے لئے موزوں نہیں ہوتے۔ علاوہ بریں ملکی معاملات کو جو لوگ بھی چلائیں خواہ وہ سیاست کار (Politician) ہوں یا ملکی نسق کے منتظم (Civil Administrator) ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ ملک میں بہت سے لوگ ان سے خوش بھی ہوتے ہیں۔ اور ناراض بھی، فوج کا اس میدان میں اترنا لامحالہ فوج کو غیر ہردلعزیز (Unpopular) بنانے کا موجب ہوگا۔ حالانکہ فوج کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ سارے ملک کے باشندے اس کی پشت پر ہوں اور جنگ کے موقع پر ملک کا ہر فرد اس کی مدد کرنے کے لئے تیار ہو۔ موجودہ دور کے فوجی انقلابات نے ملکی نظام میں فوج کی شمولیت کو مفید ثابت نہیں کیا ہے بلکہ درحقیقت تجربے سے اس کے برے نتائج ثابت ہو گئے ہیں۔

سوال نمبر ۱۲

کیا اس دور میں اسلامی حکومت خواتین کو مردوں کے برابر سیاسی و معاشرتی حقوق ادا نہ کرے گی۔ جبکہ اسلام کا دعویٰ ہے کہ اس نے سب سے

تاریک ترین دور میں بھی عورت کو ایک مقام (Status) عطا کیا؟

ا۔ کیا آج خواتین کو مردوں کے برابر اپنے ورثہ کا حصہ لینے کا حق دیا جا سکتا ہے؟

ب۔ کیا ان کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم یا مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے ملک و قوم کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کی اجازت نہ ہوگی؟

ج۔ فرض کیجئے۔ اگر اسلامی حکومت خواتین کو برابر کا حق رائے دہندگی دے اور وہ کثرت آراء سے وزارت و صدارت کے عہدوں کے لئے الیکشن لڑ کر کامیاب ہو جائیں۔ تو موجودہ بیسویں صدی میں بھی کیا ان کو منصب اعلیٰ سنبھالنے کا حق اسلامی احکام کی رو سے نہیں مل سکتا۔ جبکہ بہت سی مثالیں ایسی آج موجود ہیں۔ مثلاً سیلون میں وزارتِ عظمیٰ ایک عورت کے پاس ہے یا ہالینڈ میں ایک خاتون ہی حکمران اعلیٰ ہے برطانیہ پر ملکہ کی شہنشاہت ہے؟

د۔ سفارتی حد تک جیسے عابدہ سلطانہ دختر نواب آف بھوپال رہ چکی ہیں اور اب بیگم رعنا لیاقت علی خان ہالینڈ میں سفیر ہیں یا دیگر جس طرح مسز وجے لکشمی پنڈت برطانیہ میں ہائی کمشنر ہیں اور اقوام متحدہ کی صدر رہ چکی ہیں۔ اور بھی مثالیں جیسے نورجہاں۔ جھانسی کی رانی، رضیہ سلطانہ حضرت محل زوجہ واجد علی شاہ جو کہ Pride of Women کہلاتی ہیں۔ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف لکھنؤ میں جنگ کی کمانڈ کی وغیرہ اس طرح خواتین نے خود کو پورا اہل ثابت کر دیا ہے تو اگر آج محترمہ فاطمہ جناح صدارت کا عہدہ سنبھال لیں تو اسلامی اصول پاکستان کے اسلامی نظام میں اس کی اجازت نہ دیں گے؟

س۔ کیا آج بھی خواتین کو ڈاکٹر، وکلاء، مجسٹریٹ، جج، فوجی افسر یا پائیلٹ وغیرہ بننے کی مطلق اجازت نہ ہوگی؟

(س ب)۔ خواتین کا یہ بھی کارنامہ کہ وہ نرسوں کی حیثیت سے کس طرح مریضوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، قابلِ ذکر ہے۔ خود اسلام کی پہلی جنگ میں خواتین نے مجاہدین کی مرہم پٹی کی، پانی پلایا، اور حوصلے بلند کئے تو کیا آج بھی اسلامی حکومت میں آدھی قوم کو مکانات کی چار دیواری میں مقید رکھا جائے گا؟۔

جواب

اسلامی حکومت دنیا کے کسی معاملے میں بھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر کوئی کام کرنے کی نہ تو مجاز ہے اور نہ وہ اس کا ارادہ ہی کر سکتی ہے۔ اگر فی الواقع اسکو چلانے والے ایسے لوگ ہوں۔ جو اسلام کے اصولوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں عورتوں کے معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد عزّت و احترام کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اخلاقی معیار کے لحاظ سے بھی برابر ہیں لیکن دونوں کا دائرہ عمل ایک نہیں ہے سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اسی طرح کے دوسرے کام مرد سے تعلق رکھتے ہیں اس دائرے میں عورت کو گھسیٹ لانے کے دو بڑے نتیجے ہو سکتے ہیں یا تو یہ کہ ہماری خانگی زندگی بالکل تباہ ہو گی جس کی بیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں یا پھر عورتوں پر دوہرا بار ڈالا جائیگا کہ وہ اپنے فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً شریک نہیں ہو سکتا۔ اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں۔ عملاً یہ دوسری صورت ممکن نہیں ہے۔ لازماً پہلی صورت ہی رونما ہو گی اور مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے۔ وہ رونما ہو چکی ہے آنکھیں بند کر کے دوسروں کی حماقتوں کی نقل اتارنا عقل مندی نہیں ہے۔

اسلام میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وراثت میں عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو۔ اس باب میں قرآن کا صریح حکم مانع ہے نیز یہ انصاف کے بھی خلاف ہے۔۔ ---- کہ عورت کا حصہ مرد کے برابر ہو۔ کیونکہ اسلامی احکام کی رو سے خاندان کی پرورش کا سارا مالی بار مرد پر ڈالا گیا ہے بیوی کا مہر و نفقہ بھی اس پر واجب ہے اس کے مقابلہ میں عورت پر کوئی مالی بار نہیں ڈالا گیا ہے اس صورت میں آخر عورت کو مرد کے برابر حصہ کیسے دلایا

جا سکتا ہے۔

اسلام اصلاً مخلوط سوسائٹی کا مخالف ہے اور کوئی ایسا نظام جو خاندان کو اہمیت دیتا ہو اس کو پسند نہیں کرتا۔ عورتوں اور مردوں کی مخلوط سوسائٹی ہو، مغربی ممالک میں اس کے بدترین نتائج ظاہر ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے لوگ ان نتائج کو بھگتنے کے لئے تیار ہوں تو شوق سے بھگتتے رہیں۔ لیکن آخر یہ کیا ضروری ہے کہ اسلام میں ان افعال کی گنجائش زبردستی نکالی جائے جن سے وہ شدت کے ساتھ روکتا ہے۔

اسلام میں اگر جنگ کے موقع پر عورتوں سے مرہم پٹی وغیرہ کا کام لیا گیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امن کی حالت میں عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں اور کلبوں اور پارلیمنٹوں میں لا کھڑا کیا جائے۔ مرد کے دائرۂ عمل میں آکر عورتیں کبھی مردوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے کہ وہ ان کاموں کے لئے بنائی ہی نہیں گئی ہیں۔ ان کاموں کے لئے جن اخلاقی اور ذہنی اوصاف کی ضرورت ہے وہ دراصل مرد میں پیدا کئے گئے ہیں۔ عورت مصنوعی طور پر مرد بن کر کچھ تھوڑا بہت ان اوصاف کو اپنے اندر ابھارنے کی کوشش کرے بھی تو اس کا دہرا نقصان خود اس کو بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی۔ اس کا اپنا نقصان یہ ہے کہ وہ نہ پوری عورت رہتی ہے نہ پوری مرد بن سکتی ہے اور اپنے اصل دائرۂ عمل میں جس کے لئے وہ فطرتاً پیدا کی گئی ہے ناکام رہ جاتی ہے۔ معاشرہ اور ریاست کا نقصان یہ ہے کہ وہ اہل کارکنوں کے بجائے نااہل کارکنوں سے کام لیتا ہے۔ اور عورت کی آدھی زنانہ اور آدھی مردانہ خصوصیات سیاست اور معیشت کو خراب کر کے رکھ دیتی ہیں۔ اس سلسلہ میں گنتی کی چند سابقہ معروف خواتین کے نام گنانے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ جہاں لاکھوں کارکنوں کی ضرورت ہو کیا وہاں تمام خواتین موزوں رہ سکیں گی؟ ابھی حال ہی میں مصر کے سرکاری محکموں اور تجارتی اداروں نے یہ شکایت کی ہے کہ وہاں بحیثیت مجموعی ایک لاکھ دس ہزار خواتین جو مختلف مناصب پر کام کر رہی ہیں۔ بالعموم ناموزوں ثابت ہو رہی ہیں اور ان کی کارکردگی مردوں کی نسبت ۵۵ فیصدی سے زیادہ نہیں پھر مصر کے تجارتی اداروں نے یہ عام شکایت

کی ہے کہ عورتوں کے پاس پہنچ کر کوئی راز راز نہیں رہتا ۔ مغربی ممالک میں جاسوسی کے جتنے واقعات پیش آتے ہیں ۔ ان میں بھی عموماً کسی نہ کسی طرح عورت کا دخل ہوتا ہے ۔

عورتوں کی تعلیم سے اسلام ہرگز نہیں روکتا ۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ان کو دلوائی جانی چاہیئے لیکن چند شرطوں کے ساتھ اوّل یہ کہ ان کو وہ تعلیم خاص طور پر دی جائے جس سے وہ اپنے دائرہ عمل میں کام کرنے کے لئے ٹھیک ٹھیک تیار ہو سکیں ۔ اور ان کی تعلیم بعینہٖ وہ نہ ہو جو مردوں کی ہو ۔ دوسرے یہ کہ تعلیم مخلوط نہ ہو ۔ اور عورتوں کو زنانہ تعلیم گاہوں ہی سے تعلیم دلوائی جائے ۔ (مخلوط تعلیم کے مہلک نتائج مغربی ترقی یافتہ ممالک میں اس حد تک سامنے آچکے ہیں ۔ جو انسانیت کے لئے بدنما داغ ہیں ۔ مثلاً صرف امریکہ میں ۱۷ سال تک عمر کی لڑکیاں جو ہائی سکولوں میں پڑھتی ہیں ۔ مخلوط تعلیم کی وجہ سے ہر سال ان میں سے اوسطاً ایک ہزار حاملہ نکلتی ہیں ۔ گو ابھی یہ شکل ہمارے ہاں رونما نہیں ہوئی لیکن اس مخلوط تعلیم کے نتائج کچھ ہمارے سامنے بھی آنے شروع ہو گئے ہیں) تیسرے یہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین سے ایسے اداروں میں کام لیا جائے جو صرف عورتوں کے لئے ہی مخصوص ہوں مثلاً زنانہ ہسپتال اور زنانہ تعلیم گاہیں وغیرہ ۔

سوال نمبر ۱۳

کیا اسلامی حکومت خواتین کی بڑھتی ہوئی آزادی کو سختی سے روکے گی جیسے کہ ان کی زیبائش اور نیم عریاں لباس زیب تن کرنے اور فیشن کا رجحان اور جیسے آج کل نوجوان لڑکیاں نہایت تنگ و دلفریب سینٹ سے معطر لباس اور غازہ و سُرخی سے مزین اپنے ہر خدوخال و نشیب و فراز کی نمائش برسرِ عام کرتی ہیں ۔ اور آجکل نوجوان لڑکے بھی ہالی وڈ فلموں سے متاثر ہو کر ٹیڈی بوائز بن رہے ہیں ۔ تو کیا حکومت قانون (Legislation) کے ذریعہ سے ہر مسلم و غیر مسلم لڑکے و لڑکی کے آزادانہ رجحان کو روکے گی ۔ خلاف ورزی پر سزا دے گی والدین و

سر پرستوں کو جرمانہ کیا جا سکے گا؟ تو اس طرح کیا ان کی شہری آزادی پہ ضرب نہ لگے گی؟

ا۔ کیا حکومت گرلز گائیڈ اپوا (APWA) یا دیگر وائی ایم سی۔ آے Y.M.C.A اور وائی ڈبلیو سی اے (Y.W.C.A) جیسے ادارے اسلامی نظام میں گوارا کئے جا سکتے ہیں؟

ب کیا خواتین خواہ اسلامی عدلیہ سے ہی سہی خود طلاق لینے کی مجاز ہو سکیں گے اور مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کی پابندی آج جائز ہو گی؟

ج خواہ اسلامی عدالت کے روبرو ہی ان کو اپنی پسند سے Civil (Marriage) کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے؟

د۔ کیا خواتین کو یوتھ فیسٹیول، کھیلوں، نمائش، ڈراموں، ناچ، فلموں یا مقابلہ حسن میں شرکت یا Air Hostess وغیرہ بننے کی آج بھی اسلامی حکومت مخالفت کرے گی۔

س۔ ساتھ ہی قومی کردار تباہ کرنے والے ادارے مثلاً سینما، فلمیں، ٹیلی ویژن ریڈیو، پرفحش گانے، عریاں رسائل و لٹریچر، موسیقی، ناچ اور رنگ کی ثقافتی محفلیں وغیرہ کو بند کر دیا جائے گا۔ یا فائدہ اٹھانا ممکن ہوگا۔؟

جواب

اسلام معاشرہ کی اصلاح و تربیت کا سارا کام محض قانون کے ڈنڈے سے نہیں لیتا تعلیم نشر و اشاعت اور رائے عام کا دباؤ اس کے ذرائع اصلاح میں خاص اہمیت رکھتے ہیں ان تمام ذرائع کے استعمال کے بعد اگر کوئی خرابی باقی رہ جائے تو وہ قانونی وسائل اور انتظامی تدابیر استعمال کرنے میں بھی تامل نہ کرے گا۔ عورتوں کی عریانی اور بے حیائی فی الواقع ایک بہت بڑی بیماری ہے جسے کوئی بھی اسلامی حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بیماری اگر دوسری ... تدابیر اصلاح سے درست نہ ہو یا اس کا وجود باقی رہ جائے تو یقیناً اس کو زور سے قانون روکنا پڑے گا اس

کا نام اگر شہری آزادی پر ضرب لگتا ہے تو جواریوں کو پکڑنا اور جیب کتروں کو سزائیں دینا بھی شہری آزادی پر ضرب لگانے کے مترادف ہے اجتماعی زندگی لازماً افراد پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے افراد کو اس کے لئے آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات اور دوسروں سے سیکھی ہوئی برائیوں سے اپنے معاشرے کو برباد کریں۔ گرلز گائیڈز (Girl Guides) کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں اپوا (APWA) قائم رہ سکتی ہے بشرطیکہ وہ اپنے دائرہ عمل میں رہ کر کام کرے اور قرآن کا نام لے کر قرآن کے خلاف طریقے استعمال کرنا چھوڑ دے۔ Y.W.C.A عیسائی عورتوں کے لئے رہ سکتا ہے مگر کسی مسلمان عورت کو اس میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی مسلمان عورتیں تو (Y.W.M.A) بنا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ اسلامی حدود میں رہیں۔

مسلمان عورت اسلامی عدلیہ کے ذریعہ سے خلع حاصل کر سکتی ہے۔ فسخ نکاح (Nullification) اور تفریق (Judicial Seperation) کی ڈگری بھی عدالت سے حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ان میں سے کوئی ڈگری حاصل کرنے کی مجاز ہو۔ لیکن طلاق Divorce کے اختیارات قرآن نے صرف مردوں کو دیئے ہیں اور کوئی قانون مردوں کو اس اختیار سے محروم نہیں کر سکتا یہ اور بات ہے کہ قرآن کا نام لیکر قرآن کے خلاف قوانین بنائے جانے لگیں پوری اسلامی تاریخ عہد رسالت سے لے کر اس صدی تک اس تصور سے نا آشنا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار مرد سے سلب کر لیا جائے اور کوئی عدالت یا پنچایت اس میں دخل دے یہ تخیل سیدھا یورپ سے چل کر ہمارے ہاں درآمد ہوا ہے اور اس کے درآمد کرنے والوں نے کبھی آنکھیں کھول کر یہ نہیں دیکھا ہے کہ یورپ میں اس قانون طلاق کا پس منظر (Back ground) کیا ہے اور وہاں اس کے کیسے برے نتائج رونما ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں جب گھروں کے سکینڈل نکال کر بازاروں میں پہنچیں گے تو لوگوں کو پتہ چلے کہ خدا کے قوانین کی نافرمانی کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔

مردوں پر ایک سے زیادہ شادی کے معاملہ میں از روئے قانون پابندی عائد کرنے کا یا اس میں رکاوٹ ڈالنے کا تخیل بھی ایک بیرونی مال ہے جسے قرآن کے جعلی پرمٹ پر درآمد کیا گیا ہے یہ اصل سوسائٹی میں سے آیا ہے جس میں ایک ہی عورت اگر منکوحہ بیوی کے ساتھ داشتہ کے طور پر رکھی جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ قابل برداشت ہے بلکہ اس کے حرامی بچوں کے حقوق محفوظ کرنے کی بھی فکر کی جاتی ہے (فرانس کی مثال ہمارے سامنے ہے) لیکن اگر کسی عورت سے نکاح کر لیا جائے تو یہ جرم ہے۔ گویا ساری پابندیاں حلال کے لئے ہیں حرام کے لئے نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن مجید کی ابجد سے بھی واقف ہو تو کیا وہ یہ اقدار (Values) اختیار کر سکتا ہے؟ کیا اس کے نزدیک زنا قانوناً جائز اور نکاح قانوناً حرام ہونے کا عجیب و غریب فلسفہ برحق ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے قوانین بنانے کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں زنا کا رواج بڑھے گا۔ گرلز فرینڈز اور داشتائیں (Misstresses) فروغ پائیں گی اور دوسری بیوی ناپید ہو جائے گی یہ ایک ایسی سوسائٹی ہو گی جو اپنے خد و خال میں اسلام کی اصل سوسائٹی سے بہت دور اور مغربی سوسائٹی سے بہت قریب ہو گی۔ اس صورتِ حال کے تصور سے جس کا جی چاہے مطمئن ہو مسلمان کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سول میرج کا سوال ظاہر ہے کہ مسلمان عورت کے ساتھ تو پیدا نہیں ہوتا یہ سوال اگر پیدا ہوتا ہے تو مشرک عورت سے شادی کرنے کے معاملہ میں یا کسی ایسی عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کے معاملہ میں جو اسلامی قانون کے تحت کسی مسلمان سے نکاح کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اور مسلمان مرد اس کے عشق میں مبتلا ہو کر اس اقرار کے ساتھ شادی کرے کہ وہ کسی مذہب کا پابند نہ ہو گا۔ یہ کام اگر کسی کو کرنا ہی ہو تو اسے اسلام سے فتویٰ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسلام کیوں اپنے ایک پیرو کو اس کی اجازت دے۔ اور ایک اسلامی عدالت کا کام کب ہے

کہ مسلمانوں کی اس طریقہ پر شادیاں کروائے۔

اگر ایک اسلامی حکومت بھی یوتھ فیسٹیول (Youth Festival) اور کھیلوں کی نمائشوں اور ڈراموں اور رقص و سرود اور مقابلہ حسن میں مسلمان عورتوں کو لائے یا ایئر ہوسٹس (Air Hostess) بنا کر مسافروں کے دل موہنے کی کوشش کرے تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلامی حکومت کی ضرورت کیا ہے یہ سارے کام کفر اور کفار کی حکومت میں بآسانی ہو سکتے ہیں بلکہ زیادہ آزادی کے ساتھ ہوتے ہیں۔

سینما، فلم، ٹیلی ویژن اور ریڈیو وغیرہ تو خدا کی پیدا کردہ طاقتیں ہیں جن میں بجائے خود خرابی نہیں خرابی ان کے اس استعمال میں ہے جو انسانی اخلاق کو تباہ کرنے والا ہے۔ اسلامی حکومت کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ان ذرائع کو انسانیت کی فلاح کے لئے استعمال کرے اور اخلاقی فساد کے لئے استعمال ہونے کا دروازہ بند کر دے۔

سوال نمبر ۱۴

دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے آج اسلام کیا حل پیش کرتا ہے؟ و برتھ کنٹرول (پیدائش روکنے) کے لئے دواؤں کا استعمال فیملی پلاننگ وغیرہ کو کیا آج بھی غیر شرعی قرار دے کر ممنوع قرار دیا جائیگا۔

جواب

دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے اسلام صرف ایک ہی حل پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے اپنے رزق کے جو ذرائع پیدا کئے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور استعمال کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور جو ذرائع اب تک مخفی ہیں ان کو دریافت کرنے کی پیہم سعی کی جاتی رہے آبادی روکنے کی ہر کوشش خواہ وہ قتل اولاد ہو یا اسقاط حمل یا منع حمل، غلط ہے۔ اور بے حد تباہ کن۔ ضبط ولادت کی تحریک کے چار نتائج ایسے ہیں جن کو رونما ہونے سے کسی طرح

نہیں روکا جا سکتا۔

(i) زنا کی کثرت۔ (ii) انسان کے اندر خود غرضی اور اپنا معیار زندگی بڑھانے کی خواہش کا اس حد تک ترقی کر جانا کہ اسے اپنے بوڑھے ماں باپ اور اپنے یتیم بھائیوں اور اپنے دوسرے محتاج امداد رشتہ داروں کا وجود بھی ناگوار گزرنے لگے۔ کیونکہ جو آدمی اپنی روٹی میں خود اپنی اولاد کو شریک کرنے کے لئے تیار نہ ہو وہ دوسروں کو بھلا کیسے شریک کر سکے گا۔

(iii) آبادی کے اضافے کا کم سے کم مطلوب معیار بھی جو ایک قوم کو زندہ رکھنے کے لئے ناگزیر ہے برقرار نہیں رہتا۔ اس لئے کہ جب یہ فیصلہ کرنے والے افراد ہوں گے کہ وہ کتنے بچے پیدا کریں۔ اور کتنے نہ کریں۔ اور اس فیصلہ کا مدار اس بات پر ہوگا کہ وہ اپنے معیار زندگی کو نئے بچوں کی آمد کی وجہ سے گرنے نہ دیں تو بالآخر وہ اتنے بچے بھی پیدا کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ جتنے ایک قوم کو اپنی قومی آبادی برقرار رکھنے کے لئے درکار ہوتی ہے اس طرح کے حالات میں کبھی کبھی نوبت یہ بھی آجاتی ہے کہ شرح پیدائش شرح اموات سے کمتر ہو جاتی ہے چنانچہ یہ نتیجہ فرانس دیکھ چکا ہے حتیٰ کہ اس کو "بچے زیادہ پیدا کرو" کی تحریک چلانی پڑی اور انعامات کے ذریعہ سے اس کی ہمت افزائی کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔

(iv) قومی دفاع کا کمزور ہو جانا، یہ نتیجہ خصوصی طور پر کسی ایسی قوم کے لئے بے حد خطرناک ہے جو اپنے سے تیرہ گنی زیادہ دشمن آبادی میں گھرا ہوا ہو۔ پاکستان کے تعلقات ہندوستان و افغانستان کے ساتھ جیسے کچھ ہیں سب کو معلوم ہے اور امریکہ کی دوستی نے کمیونسٹ ممالک سے بھی اس کے تعلقات خراب کر دیئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ہندوستان، چین، روس، اور افغانستان کی آبادی ہم سے تیرہ گنی ہے ان حالات میں لڑنے کے قابل افراد کی تعداد گھٹانا جیسی کچھ عقلمندی ہے اسے ایک صاحب عقل آدمی خود سوچ سکتا ہے۔

سوال نمبر ۱۵

کیا ایک مسلمان زندگی میں اپنی آنکھیں عطیہ کر سکتا ہے کہ اس کی موت کے بعد کسی اندھے یا مریض کے استعمال ہو سکیں؟

أ۔ اس طرح بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے انسانی اعضاء کی قربانی روز قیامت سزا کی مستحق تو نہ ہوگی۔؟

ب موت کے بعد ایک مسلمان کی لاش کا پوسٹ مارٹم یا ریسرچ کیلئے چیر پھاڑ مذہبی نقطہ نگاہ سے کیا اہمیت رکھتی ہے؟

جواب

آنکھوں کے عطیہ کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی نہیں رہتا بہت سے دوسرے اعضا بھی مریضوں کے کام آسکتے اور ان کے دوسرے مفید استعمال بھی کر سکتے ہیں۔ یہ دروازہ اگر کھولا جائے تو مسلمانوں کا قبروں میں دفن ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا سارا جسم ہی چندے میں تقسیم ہونا شروع ہو جائے گا۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں ہے۔ اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مرنے سے قبل اپنے جسم کو تقسیم کرنے یا چندہ دینے کی وصیت کرے جسم اس وقت تک اس کے تصرف میں ہے جب تک وہ جسم میں خود رہتا ہے۔ اس کے نکل جانے کے بعد اس جسم پر اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ کہ اس کے معاملے میں اس کی وصیت نافذ ہو۔ اسلامی احکام کی رو سے اس کا جسم احترام کے ساتھ دفن کر دینا چاہیئے

اسلام نے انسانی لاش کی حرمت کا جو حکم دیا ہے وہ دراصل انسانی جان کی حرمت کا ایک لازمہ ہے۔ ایک دفعہ اگر انسانی لاش کا احترام ختم ہو جائے تو بات صرف اس حد تک محدود نہ رہے گی۔ کہ مردہ انسان کے بعض کارآمد اجزاء زندہ انسانوں کے علاج میں استعمال کئے جانے لگیں گے۔ بلکہ رفتہ رفتہ انسانی جسم کی چربی سے صابن بھی بننے لگیں گے۔ (جیسے کہ فی الواقع جنگ عظیم نمبر ۲ کے زمانے میں جرمنوں نے بنائے تھے) انسانی کھال بھی اتار کر اس کو دباغت دینے

کی کوشش کی جائے گی۔ تاکہ اس کے جوتے یا سوٹ کیس یا منی پرس بنائے جاسکیں (چنانچہ یہ تجربہ بھی چند سال قبل مدراس کی ایک ٹینری کر چکی ہے)۔ انسان کی ہڈیوں اور آنتوں اور دوسری چیزوں کو استعمال کرنے کی بھی فکر کی جائے گی حتیٰ کہ اس کے بعد ایک مرتبہ انسان پھر اس دور وحشت کی طرف پلٹ جائے گا جب آدمی آدمی کا گوشت کھاتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک دفعہ مردہ انسان کے اعضاء نکال کر علاج میں استعمال کرنا جائز قرار دے دیا جائے تو پھر کس جگہ حد بندی کر کے آپ اسی جسم کے دوسرے "مفید" استعمالات کو روک سکیں گے اور کس منطق سے اس بندش کو معقول ثابت کریں گے:-

انٹرویو کی تاریخ: ۸ اپریل ۱۹۷۵ء

پاکستان، تحریکِ اسلامی اور متعلقہ مسائل

سوال :- مولانائے محترم، آپ کی شخصیت دو پہلوؤں سے پاکستان اور عالم اسلام ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں بخوبی متعارف ہے۔ ایک تو آپ کے علمی تبحر، ادبی حیثیت اور دینی مقام کے اعتبار سے اور دوسرے ایک سیاسی قائد اور رہنما کی حیثیت سے۔ ان دونوں پہلوؤں پر الگ الگ گفتگو بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ آپ کے ایک عظیم سیاسی قائد ہونے کی حیثیت ایک لحاظ سے باقی تمام چیزوں پر بھی محیط ہو جاتی ہے اس لئے اگر اسی پہلو سے گفتگو کا آغاز کیا جائے تو غیر موزوں نہ ہو گا ——— اس ضمن میں گزارش یہ ہے کہ ایک چیز جو عام طور پر یہاں پاکستان میں موضوع گفتگو رہتی ہے اور اس کا آپ کی ذات سے بڑا گہرا تعلق ہے وہ ہے تحریک پاکستان کے مقاصد اور ان کے حصول و اثبات میں آپ کی جماعت کی خدمات اور یہ سوال بھی کہ آپ نظریۂ پاکستان سے کیا مراد لیتے ہیں! اس سلسلے میں آپ کیا کہنا پسند فرمائیں گے؟

جواب :- اگر ہم گفتگو کو "تحریک پاکستان" کے الفاظ اور اصطلاح تک محدود رکھ کر بات کریں تو میرا خیال یہ ہے کہ یہ اس موضوع کے ساتھ انصاف نہ ہو گا، کیونکہ ایک چیز تو ہے "پاکستان" کا لفظ اور اصطلاح، اور ایک چیز ہے وہ مقاصد جو اس بر صغیر کے مسلمانوں کے پیش نظر ایک زمانہ دراز سے تھے اور جنہوں نے بالآخر ان کو اس

مقام تک پہنچایا کہ وہ اس اصطلاح کے ساتھ ایک ملک حاصل کرنے کی جدوجہد کریں یہ مقاصد اسی وقت مسلمانان ہند کے سامنے ابھر کر آگئے تھے جب برصغیر میں مسلم حکومت کا زوال ہوا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ چونکہ وہ ایک خاص نظریہ حیات کے حامل اور ایک مخصوص تہذیب کے پیرو ہیں اس لئے وہ اپنا ملی تشخص اور قومی وجود صرف اسی صورت میں برقرار رکھ سکتے ہیں جبکہ اقتدار و حاکمیت ان کے ہاتھ میں ہو اگر اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں چلا جائے تو وہ اس ملک میں مسلمان کی سی زندگی بسر نہیں کر سکتے اور بحیثیت مسلمان کے ان کی کوئی زندگی نہیں ہو گی۔ یہ احساس ہندوستان میں حکومت کا زوال ہوتے ہی مسلمانوں کے اندر پیدا ہونا شروع ہو گیا اس احساس نے مختلف شکلیں اختیار کیں۔

کبھی اس نے یہ شکل اختیار کی کہ حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمعیل شہیدؒ ایک تحریک جہاد لے کر کھڑے ہوئے اور اسلامی حکومت و اقتدار کے لئے اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کر گئے ـــــ کبھی اس احساس نے یہ شکل اختیار کی کہ جگہ جگہ دینی تعلیم کے مدارس قائم کئے گئے تاکہ مسلمان اپنے دین کو بھول کر یورپ سے آنے والی بے خدا تہذیب اور ملحدانہ افکار و نظریات کے سیلاب میں نہ بہہ جائیں۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ آیا کہ انگریزی اقتدار نے یہاں پر قدم جمالئے اور انگریزوں نے رفتہ رفتہ یہاں اس طرز کی جمہوریت کو فروغ دینا شروع کیا۔ جس طرز جمہوریت پر ان کے اپنے ملک انگلستان میں نظام حکومت چل رہا تھا۔ انگریزوں کا تصور قومیت و جمہوریت یہ تھا کہ انگلستان کے تمام باشندے ایک قوم ہیں، اور ان کے اندر اکثریت کو حکومت کرنے کا حق حاصل ہے اسی اصول جمہوریت کو انگریزوں نے ہندوستان میں بھی رائج کرنا چاہا وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے باشندے بھی ایک قوم ہیں اور ان کے اندر بھی اکثریت کی حکومت کا اصول چل سکتا ہے اسی

چیز نے مسلمانوں کے اندر ریکایک یہ احساس پیدا کیا کہ اگر یہاں پر ایک ایسی اکثریتی حکومت کا قیام عمل میں آتا ہے جس میں ہماری حیثیت مستقلاً ایک اقلیت ہو جاتی ہے تو یہ چیز آخر کار ہماری تہذیبی و قومی انفرادیت کی نفی پر منتج ہوگی۔ کیونکہ اس حکومت کے اندر نہ ہم اپنے نقطۂ نظر کے مطابق قوانین بنانے پر قادر رہوں گے اور نہ حکومت کی انتظامی اور دوسری پالیسیوں ہی میں ہمارا کوئی عمل دخل ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں نہ صرف یہ کہ ہم اپنی تہذیب اور نظریۂ حیات کو بروئے کار نہ لاسکیں گے۔ بلکہ ایک کافرانہ تہذیب اور ایک باطل نظریۂ زندگی ہم پر حکومت کے زور سے مسلط ہو جائے گا۔

یہ تھی وہ صورت حال جو انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد ایک زبردست سوال اور چیلنج کی شکل میں ابھر کر مسلمانوں کے سامنے آئی اور اس کا جواب حاصل کرنے میں انہیں ایک عرصہ دراز لگا۔ ایک مدت دراز تک وہ اس مشکل سوال کا حل تلاش کرنے کی کوششیں کرتے رہے کہ ایک ایسے نظام میں جس میں ہندوستان کے باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے اکثریت کی حکومت کا طریقہ رائج کیا گیا ہو۔ اس میں اقلیت کے طور پر ہمارے لئے سیاسی، تمدنی اور تہذیبی تحفظ کی کیا شکل ہو سکتی ہے اس تحفظ کے حصول کی شکل اور اس کے تعین کے لئے مختلف چیزوں کا تجربہ کیا گیا ایک مرحلے پر اس غرض کے لئے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا گیا۔ پہلے اس مطالبہ کا رخ براہ راست انگریزوں کی جانب تھا۔ (وفد شملہ ۱۹۰۶ء) پھر اس کی بنیاد پر مسلم لیگ اور کانگریس میں مفاہمت عمل میں آئی (میثاق لکھنو ۱۹۱۶ء) کے بعد کے مراحل میں بھی مختلف تجاویز زیر غور آتی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس طرز کے جمہوری نظام میں کوئی آئینی تحفظ ان کے کام نہیں آسکتا۔ اس بات کا احساس شدت کے ساتھ انہیں اس وقت ہوا جب ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کے متعدد بڑے بڑے صوبوں کے اندر کانگریس کی حکومت قائم ہوئی اس وقت مسلمانوں کو براہ راست اس چیز کا تجربہ ہو گیا

کہ اس برصغیر میں حکومت اکثریتی قوم کے ہاتھ میں ہوتا اور مسلمانوں کا ایک اقلیت کی حیثیت سے اس کے ماتحت ہونا ایک ایسی صورت حال کو پیدا کرتا ہے جو رفتہ رفتہ ان کے قومی وجود کو ختم کر کے رکھ دے گی۔

یہ تجربہ حاصل ہونے کے بعد مسلمانوں نے اس طرز پہ سوچنا شروع کیا کہ اب تک مسئلے کو وہ جس رخ سے حل کرتے کی کوشش کرتے رہے ہیں وہ بے معنی اور غیر موثر ہے اس زمانے میں انہیں بار بار یہ یقین دلاتے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ ہندوستان کے مسلم اور غیر مسلم باشندے ایک قوم ہیں، لیکن یہ واقعہ تھا۔ کہ وہ ایک قوم نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ مسلمان جب سے اس ملک میں آئے تھے اس وقت سے وہ غیر مسلموں کے ساتھ کبھی ایک قوم کی حیثیت سے نہیں رہے تھے۔ ایک قوم ہوتے تو ان کے اندر وقتاً فوقتاً تصادم کیسے رونما ہوتے اور لڑائیوں تک نوبت کیوں پہنچی۔ ایک قوم ہوتے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان چھوت چھات کیوں کر ہوتی۔ ان کے ہیرو الگ الگ کیوں ہوتے۔ ان کی عقیدت کے مراکز مختلف کیسے ہوتے۔ ان کو انسپائر (INSPIRE) کرنے والی چیزیں ایک دوسرے سے جداگانہ کیونکر ہوتیں؟ اور فی الجملہ وہ عملاً ہندوؤں سے ایک الگ قوم بن کر کیسے رہتے؟ پس معلوم ہوا کہ درحقیقت وہ ایک قوم نہیں تھے اور اب ایک مفروضہ زبردستی ان پہ مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہ مفروضہ کسی طرح چلنے والا نہیں تھا۔ یہی چیز کانگریس کی اکثریتی حکومت قائم ہونے کے بعد آئینہ ہو کر سامنے آگئی اور خود انہی لوگوں نے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دے رہے تھے۔ اپنے عمل سے یہ ثابت کرایا کہ ہندو مسلم ایک قوم نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت یہ ایک سیاسی حربہ تھا۔ جس کے ذریعے سے وہ یہاں کی اقلیتی قوم —— مسلمانوں کو —— ایک غلام قوم بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ یہ وہ ایک زمانہ تھا جب میں نے ۱۹۳۷ء میں اپنا وہ سلسلۂ مضامین لکھنا شروع کیا جس

میں مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ آپ ایک غیر مسلم اکثریت کے ماتحت رہ کر کسی قسم کے آئینی تحفظ کے سہارے بھی اپنا قومی و ملی وجود برقرار نہیں رکھ سکتے

سوال: کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ تحریک پاکستان کے غیر محسوس تسلسل میں ایک نیا موڑ برصغیر میں پارلیمانی نظام کے قیام سے آیا اور اس وقت آپ نے اس کو محسوس کر کے اس پہ قلم اٹھایا۔؟

جواب: جی ہاں، اس وقت میں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ اس حالت میں کوئی آئینی تحفظ مسلمانوں کو نہیں بچا سکتا۔ اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کی کوئی دوسری صورت سوچی جائے میرے نزدیک دوسری صورت صرف یہ تھی اور اس کو میں نے بالکل واضح طور پہ پیش کر دیا تھا۔ کہ سب سے پہلے تو مسلمانوں کے اندر ان کے قومی و ملی تشخص کا احساس پوری طرح پیدا کیا جائے جس سے ان کو معلوم ہو کہ وہ فی الواقع کیا ہیں، ان کے اصول زندگی کیا ہیں، وہ کیونکر دوسری قوموں سے الگ اور مستقل بالذات قوم بلکہ ملت ہیں، اور ان کے اس قومی و ملی تشخص کو برقرار رکھنے کا راستہ کیا ہے؟

اس زمانے تک مسلمانوں کے اندر کوئی باقاعدہ تحریک موجود نہ تھی اور بالخصوص تحریک پاکستان کا، جس شکل میں وہ بعد میں ابھری، آغاز نہیں ہوا تھا اس کے برعکس مسلمانوں کے مختلف اہل دماغ ـــ جن کا انداز فکر بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا ـــ اپنی اپنی جگہ پر سوچ رہے تھے کہ جس پیچیدگی میں ہم پڑ گئے ہیں اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ اس وقت، جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا، سب سے مقدم چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کو اس متحدہ قومیت کے جال میں پھنسنے سے کیسے بچایا جائے جس کے حلقے ان کے گرد کسے جا رہے تھے۔

سوال: کیا اس وقت کچھ اور لیڈر حضرات بھی ایسے تھے جو ان خطوط پہ سوچ رہے

تھے اور ان کے خیالات بھی معرض اظہار میں آرہے تھے ؟

جواب :۔ جی ہاں، اور بھی بعض حضرات ان خطوط پر سوچنے والے موجود تھے اور انہوں نے اپنی تقاریر اور مضامین کے ذریعے سے اپنے خیالات پیش کئے ہیں بھی ان سے ایک تھا۔ اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں کے اندر جداگانہ قومیت کا احساس بیدار کرنے میں مَیں نے بھی مقدور بھر خدمت انجام دی ۔۔۔ میرے اس کام کا وزن کیا تھا۔ اس کا فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے، دوسرے لوگ خود دیکھ کر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں ۔

سوال :۔ مولانا، جس انداز سے آپ نے جداگانہ قومیت کا تصوّر مسلسل مضامین کی شکل میں پیش فرمایا کیا اس انداز کی کوئی دوسری کوشش بھی سامنے آئی ؟

جواب :۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کوئی باقاعدہ اور مسلسل آواز ایسی موجود نہ تھی

سوال :۔ گویا تحریک پاکستان کی ایک مخصوص شکل اس کے بعد ہی ظہور پذیر ہوئی ؟

جواب :۔ یہ بالکل صحیح ہے ۔ رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کے اندر یہ جداگانہ قومیّت کا تصور راسخ ہوتا گیا تو ان کے اندر اس ضرورت کا احساس بھی بڑھتا چلا گیا کہ کم از کم ہندوستان کے وہ خطے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ ایک الگ ریاست بن جائیں اس طرح تحریک پاکستان ایک باقاعدہ اور واضح شکل اختیار کرنے لگی ۔

اس موقع پر دو اہم سوال درپیش تھے ایک تو یہ کہ وہ خطے جن کے اندر مسلمانوں کی اکثریت تھی وہ ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر واقع تھے، ان کو باہم جوڑنے والی چیز کیا ہو گی ؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ تھا کہ یہ چیز اسلام کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی ۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ ہندوستان کا ایک بہت بڑا علاقہ ایسا تھا۔ جس میں مسلمان اقلیت میں تھے ۔ اگر وہاں پر جمہوری حکومت قائم ہو تو لامحالہ وہاں مسلمانوں کو اکثریت کی غلامی میں جانا ہو گا ۔ اس صورت میں ان کے تحفظ کی شکل کیا ہو گی ؟ کیونکہ پاکستان بنتے

کا فائدہ صرف انہی علاقوں کو پہنچنا تھا، جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس سوال کا کوئی واضح جواب موجود نہیں تھا۔ لیکن اس سے یہ بات بہرحال پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بالآخر مسلمانانِ ہند کو جس تخیل نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد کے لئے ابھارا اور ان کو مجتمع کیا وہ کوئی سیاسی و معاشی جذبہ ہرگز نہ تھا۔ بلکہ درحقیقت وہ ایک خالص دینی جذبہ تھا۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ مدراس یا بمبئی یا سی پی، یا یوپی کا کوئی مسلمان پاکستان کی حمایت کے لئے کھڑا ہوتا۔ جبکہ وہ کبھی یہ امید نہ کر سکتا تھا کہ اس کا علاقہ بھی پاکستان میں شامل ہوگا۔ اور یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ آگے چل کر جن علاقوں میں پاکستان قائم ہوا ہے وہاں تحریکِ پاکستان نے کبھی اتنا زور نہیں پکڑا جتنا ان علاقوں میں پکڑا تھا۔ جہاں مسلمان اقلیت میں تھے اس کا سبب اس کے سوا کیا تھا۔ کہ اس کا محرک خالص اسلامی جذبہ تھا۔ مسلمانوں کے اندر یہ احساس کارفرما تھا کہ چاہے، ہمارا حشر کچھ ہی ہو لیکن ہماری قربانیوں سے کم از کم اسلام کے نام پر ایک ایسی مملکت تو وجود میں آجائے گی جس میں اسلام کا بول بالا ہوگا۔ اور وہاں اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم ہو سکے گا۔ یہی وہ جذبہ اور احساس تھا جس نے اس نعرے کی شکل اختیار کی کہ

پاکستان کا مطلب کیا۔ لا إله إلا الله

اور دراصل یہی وہ نعرہ تھا۔ جس کو سن کر لوگ پروانہ وار اس پر لپکے اور اتنی بڑی اکثریت نے پاکستان کی حمایت کی کہ شاید برصغیر کے ایک دو فی صدی مسلمان ہی بمشکل اس سے الگ رہ گئے ہوں۔ چنانچہ میرے نزدیک نظریہ پاکستان کی دو ہی بنیادیں ہیں ایک یہ کہ ہم دنیا کی کسی دوسری قوم کا جز نہیں بلکہ الگ ایک قوم ہیں، اور ہم کسی دوسری قوم کے ساتھ مل کر کوئی مشترک قومیت نہیں بنا سکتے، اور دوسرے یہ کہ ہماری قومیت کی اساس ہمارا دین ہے اور اس کے سوا ہماری قومیت کی کوئی اور بنیاد نہیں ہے۔ میرے نزدیک نظریہ پاکستان کے یہی معنی ہیں!

سوال :- گویا آپ کے نزدیک اسی احساس اور جذبے نے دراصل مسلمانان ہند کو آزادی کی جدوجہد کے لئے ابھارا ؟

جواب :- یقیناً صرف یہی وہ چیز تھی جس نے مسلمانوں کو آزادی کی جدوجہد کے لئے ابھارا اور یہ آزادی ان کو پاکستان کی شکل میں مطلوب تھی، جہاں مسلمان اپنے دین کے مطابق اپنی زندگی کا نظام قائم کرنے کے لئے آزاد اور خود مختار ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ان علاقوں کے مسلمان تو کبھی پاکستان کا مطالبہ کرنے اور اس کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے پر آمادہ نہ ہوتے جن کو آزادی کے ثمرات میں سے کوئی ثمرہ ملنے والا نہ تھا وہ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے کر رہے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد الٹی ہماری شامت آئے گی اور ہمارا جینا دوبھر کر دیا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہر قسم کے خطرات کو انگیز کیا سوال یہ ہے کہ آخر کیوں ؟ کیا اسلام کے ساتھ والہانہ لگاؤ اور اسلامی حکومت کے قیام کے لئے ایک قومی داعیے کے سوا بھی اس کا کوئی اور محرک ہو سکتا ہے ؟۔ یہ ہماری تاریخ کا ایک ایسا دور ہے جس کے عینی شاہد آج بھی بکثرت یہاں موجود ہیں۔ تاریخ کی اس روشن شہادت کو آج کوئی شخص کیسے جھٹلانے کی جسارت کر سکتا ہے ؟

سوال :- مولانا! بعد میں جب تحریک پاکستان کا باقاعدہ آغاز ہوا تو اس کی قیادت مسلم لیگ کے ہاتھوں میں تھی اس دور میں اس تحریک کے لئے آپ کا (CONTRIBUTION) کیا رہا۔ ؟

جواب :- جب عملاً یہ تحریک اس اصطلاح اور نصب العین کے ساتھ شروع ہوئی تو جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے عرض کیا کہ اس کا اصل مقصود اسلامی حکومت کا قیام تھا اس چیز سے مجھے بھی اتفاق تھا، اور اسی مقصد کے لئے میں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی لیکن یہ تحریک شروع ہونے کے بعد جوں جوں آگے بڑھتی گئی میں نے یہ محسوس کیا کہ جس طرز پر یہ تحریک چلائی جا رہی ہے اور جن ہاتھوں سے وہ پروان چڑھ رہی ہے اس کے

نتیجے میں ایک قومی جمہوری ریاست تو وجود میں آسکتی ہے لیکن صحیح معنوں میں اسلامی ریاست نہ بن سکے گی اور یہ میرا اس وقت احساس تھا اور بعد کے حالات نے میرے احساس کی تصدیق ہی کی۔ نتیجہ اس سے مختلف شکل میں برآمد نہیں ہوا۔

سوال:۔ آپ کے اس احساس کی بنیادیں کیا تھیں؟

جواب:۔ دیکھئے جب کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم فلاں مقصد کے لئے کام کر رہے ہیں اور یہ ہمارا نصب العین ہے تو یہ دیکھا جائے گا کہ اس مقصد اور نصب العین کے ساتھ لگاؤ کی کیا علامات ان کی عملی زندگیوں میں پائی جاتی ہیں اگر وہ علامات واضح طور پر اور مطلوبہ معیار کے مطابق وہاں نہ پائی جاتی ہوں تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا متعین کردہ مقصد اور نصب العین کہاں تک پورا ہو سکے گا۔

سوال: یعنی اسلامی حکومت کے قیام کا مقصد اور نصب العین، جیسے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا تھا؟

جواب:۔ جی ہاں، اس تحریک کا مقصد واقعی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ تھا اور اسی کی خاطر برصغیر کے تمام مسلمان جمع ہوئے تھے۔ لیکن عام مسلمان اس بات کو نہیں سمجھ سکتے تھے اور نہ یہ ان کے بس کی بات تھی، کہ آگے چل کر اس تحریک کی شکل کیا ہو گی اور اس کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ قیام پاکستان کی تحریک جس انداز سے چل رہی ہے اس کے نتیجے میں ایک ریاست تو وجود میں آسکتی ہے لیکن عملاً وہ ایک سیکولر نیشنل ڈیموکریسی ہو گی جو صحیح اسلامی ریاست سے بہت دور ہو گی۔

سوال:۔ کیا اس وقت جماعت اسلامی موجود تھی؟

جواب:۔ نہیں، جماعت اسلامی اسی احساس کے بعد ہی تو بنائی گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان کا ریزولیوشن ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو پاس ہوا اور جماعت اسلامی کی تشکیل ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو ہوئی۔ میں اس دوران میں برابر لکھتا رہا کہ اگر آپ کو اسلامی

حکومت قائم کرنی ہے تو اس کے لئے کس قسم کا کیریکٹر مطلوب ہے اور اس کا طرز تنظیم کیا ہونا چاہیئے۔

سوال :۔ جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی اور آپ نے یہ دیکھا کہ آگے چل کر تحریک پاکستان کو چلانے والے کس قسم کی ریاست قائم کر سکیں گے تو آپ نے صحیح اسلامی ریاست کے قیام کے مقصد کے پیش نظر کن خطوط پر اپنی کوششوں کا آغاز کیا ؟

جواب :۔ میرے پیش نظر اس وقت یہ تھا کہ پورے برصغیر میں قیام پاکستان کی تحریک جس بڑے پیمانے پر شروع ہو چکی ہے اس کی وجہ سے اب اس کا رخ اور رنگ بدلنا مشکل ہے بلکہ اس کوشش میں کام الٹا اور خراب ہو سکتا ہے اس لئے بجائے اس کے کہ اب اس کوشش میں وقت صرف کیا جائے، زیادہ بہتر یہ ہے کہ یہ تحریک اپنے انداز میں کام کرتی رہے اور ہم ایک الگ جماعت بنا کر ایسے آدمی تیار کرنا شروع کریں جو پاکستان بننے کے بعد دونوں حصوں میں پیش نظر مقصد کے لئے کام کر سکیں، یعنی اس حصے میں بھی جہاں پاکستان بنتا ہے اور اس حصے میں بھی جہاں غیر مسلم حکومت قائم ہوتی ہے۔ ہمارے پیش نظر یہ تھا کہ قیام پاکستان سے پہلے اتنا تعمیری کام کر لیا جائے کہ اس کے قیام کے بعد پیشتر اس سے کہ اس کا نظام حکومت سیکولر بنیادوں پر قائم کرنے کے حالات پیدا کئے جائیں۔ اس میں فوری طور پر اسلامی نظام زندگی کے قیام کی بنیاد ڈالی جا سکے۔ اس غرض کے لئے صاحب کردار کارکن تیار کئے جائیں اور ان کی تعلیم و تربیت کے ذریعے سے ان کی ایسی تنظیم کر دی جائے کہ وہ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ علاوہ بریں ایسا لٹریچر تیار کیا جائے جو اسلامی حکومت کے حقیقی خدوخال متعین کر کے رکھ دے تاکہ جب عملاً یہاں اسلامی طرز حکومت کے قیام اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا سوال ابھرے تو یہ نہ کہا جا سکے کہ اسلامی حکومت کیا چیز ہے، یا اس جدید زمانے میں صدیوں پرانے اسلامی قوانین کا نفاذ کیسے ممکن ہے اور ایک مثالی اسلامی ریاست کیونکر وجود میں لائی جا سکتی ہے۔ یہ ہماری انہی کوششوں کا نتیجہ

تھا۔ کہ قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے فوراً بعد ہم ایسا لٹریچر تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس میں سوچنے سمجھنے والے ذہنوں کے اطمینان کا پورا سامان کر دیا گیا ہے، ہم نے اچھی طرح یہ بتا دیا ہے کہ اسلامی نظام حکومت کیا ہوتا ہے۔ اس کی معیشت کن بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس کی معاشرتی زندگی کیسی ہونی چاہیئے۔ اس کا نظام اخلاق کیا ہونا چاہیئے۔ اس کی سیاست کے اصول و ضوابط کیا ہوں گے۔ اس میں قانون سازی، نفاذ قانون اور عدالتوں کا نظام کن بنیادوں پر ہونا چاہیئے۔ یہ اور اس طرح کے جو مباحث اسلامی نظام حکومت کے قیام کے سلسلے میں پیدا ہو سکتے تھے۔ ان کے بارے میں ہم نے ضروری مواد فراہم کر دیا۔ دوسری طرف ہم نے ایسے مخلص اور صاحب کردار کارکن تیار کیئے جو غلبہ اسلام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دینے کا عزم رکھتے ہیں۔

سوال:۔ مولانا! اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والے لوگوں یا زیادہ صحیح لفظوں میں مسلم لیگ کے پیش نظر اور آپ کے پیش نظر دراصل ایک ہی نصب العین تھا، گو کہ طریق کار مختلف ہو گیا لیکن ایسا کیوں ہوا کہ دونوں تنظیموں کے درمیان مفاہمت یا تو پیدا نہ ہوئی یا کسی وجہ سے پس منظر میں چلی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک بعض لوگوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی تحریک پاکستان کی راہ میں مزاحم ہوئی، یا کم از کم یہ کہ اس نے اس تحریک کا ساتھ نہ دیا۔ ایک ہی سمت میں چلنے والوں کے بارے میں ایسا تاثر پیدا ہونے کے کوئی حقیقی اسباب تھے یا اس کے پس پردہ کچھ لوگوں کے اپنے مقاصد اور محرکات تھے؟

جواب:۔ میرے خیال میں اس قسم کا تاثر جان بوجھ کر پیدا کیا گیا اور ایسا کرنے والوں کے کئی مقاصد اور محرکات ہو سکتے ہیں۔ جن لوگوں نے از خود یہ تاثر لیا انھوں نے ہمارا لٹریچر پڑھے بغیر دور ہی سے ایک رائے قائم کر لی۔ لیکن ان کے برعکس کچھ وہ لوگ تھے جو یہ جانتے تھے کہ ہمارا طرز فکر کیا ہے، ہم کس مقصد کے لئے کام کر رہے ہیں اور ہمارے پیش نظر کیسا نظام قائم کرنا ہے۔ لیکن چونکہ یہ چیز ان کو پسند نہ تھی۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم اس مقصد میں کامیاب ہوں اس

لئے انہوں نے جان بوجھ کر ہمیں بدنام کرنے کے لئے ہمارے اوپر بہت سے الزامات چسپاں کئے جن میں سے ایک الزام تحریک پاکستان کی مخالفت کا تھا۔ لیکن ہم نے کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ ہمارے مخالفین ہمارے بارے میں کیا پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ ہم اپنا فرض جس کو سمجھتے تھے اسے انجام دیتے رہے ہمارا طرز فکر یہ تھا۔ کہ جب مسلمانوں کی اپنی ایک الگ مملکت قائم ہوتی ہے تو اس کا نظام اسلام ہی کی بنیادوں پر قائم ہونا چاہیئے اس کے لئے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، ہم نے علمی حیثیت سے کام کر کے یہ بتا دیا کہ اسلامی نظام حکومت کے خدوخال کیا ہوتے ہیں اور موجودہ دور میں اس کا قیام کس طرح ممکن ہے۔ اسلامی ریاست سے متعلقہ مباحث کے بارے میں ضروری مواد پیش کر دیا گیا تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ اسلامی نظام کا کوئی گوشہ تشنۂ وضاحت رہ گیا ہے۔

دوسری طرف ہم نے تعلیم و تربیت کے ذریعے سے ایسے کارکن بھی تیار کئے کہ اگر اس مقصد کے حصول کے لئے سیاسی جدوجہد کی ضرورت پیش آئے تو وہ یہ فریضہ بھی انجام دے سکیں۔ کیونکہ ہمارا خیال یہ تھا، کہ ملک تقسیم ہو جانے اور پاکستان قائم ہو جانے کے بعد ایسی کوئی جماعت منظم نہ کی جا سکے گی۔ بعد کے حالات نے یہ بتایا کہ ہمارا یہ اندازہ بالکل صحیح تھا اور اگر ہم نے اس وقت ایک الگ گوشے میں بیٹھ کر ایسے کارکنوں کی تربیت اور تنظیم نہ کر لی ہوتی تو پاکستان بننے کے بعد ہم یہ کام کسی طرح انجام نہ دے سکتے۔

سوال :- یہ رائے قائم کرنے کی کیا وجہ تھی کہ آپ قیام پاکستان کے بعد یہ کام نہ کر سکیں گے جبکہ پاکستان بننے کے بعد بھی مختلف جماعتیں وجود میں آئیں۔؟

جواب :- آپ کو معلوم ہے کہ حصول پاکستان کے بعد اسی جماعت نے، جس کے منشور میں یہ شامل تھا۔ کہ حصول آزادی کے بعد ہم سیفٹی ایکٹ جیسے غیر جمہوری قوانین کو منسوخ کر دیں گے، سیفٹی ایکٹ پاس کیا۔ اس کا مقصد اس کے سوا کیا تھا کہ کوئی شخص ان کی مرضی کے خلاف ملک میں کام نہ کر سکے۔ اس طرح کے اور بھی بعض اقدامات

کئے گئے جو اس چیز کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ میں عوام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں کیوں کہ وہ تو اپنے مقصد میں بہر حال مخلص تھے لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیارات آئے انھوں نے اسلامی حکومت کے قیام کے بنیادی تقاضوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ جس وقت ہم نے ۱۹۴۸ء میں اسلامی حکومت کے اصول پیش کر کے ان کو عملی جامہ پہنانے کا مطالبہ شروع کیا تو اس کو مسلسل ٹالا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد پہلا کرنے کا کام تو یہ تھا کہ ریاست کے مقاصد (OBJECTIVES) متعین کرنے والی قرار داد پاس کی جاتی جس میں اسلامی ریاست کے اصول و مقاصد آئینی زبان میں طے کئے جاتے آپ کو معلوم ہو گا کہ ہماری ہمسایہ ریاست ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی نے آزادی کے بعد سب سے پہلا کام ریاست کے مقاصد طے کرنے کا کیا۔ یہ ایک اصولی بات تھی۔ لیکن ہمارے اس مطالبے کو، جو در حقیقت پورے اہل پاکستان کا مطالبہ اور قیام پاکستان کا ایک فطری تقاضا تھا درخور اعتناء نہ سمجھا گیا۔ اس کو خوش آمدید کہنے کی بجائے انھوں نے اس کو اپنے لئے ایک خطرہ گردانا کو مختلف تاخیری حربے اختیار کئے اور آخر کار مجھے اور جماعت اسلامی کے دو اور ذمہ دار اصحاب کو گرفتار کر لیا۔ ان کا گمان شاید یہ تھا کہ اس طرح اس مطالبے کو دبایا جا سکتا ہے لیکن ان کا یہ خیال درست نہ تھا۔ کیونکہ یہ پاکستان کے لئے جدوجہد کرنے والے تمام لوگوں کے دلوں کی آواز تھا۔ ایک بہت ہی قلیل طبقہ ایسا موجود تھا۔ جس کو یہاں اسلامی حکومت کا قیام ناگوار تھا۔ اور وہ یہ خیالات رکھتا تھا کہ اگر یہاں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو وہ یہ ملک ہی چھوڑ کر چلا جائے گا، لیکن ملک کی بہت بڑی اکثریت یہاں اسلامی نظام کے سوا کوئی اور نظام نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

سوال:- مولانا، کیا آپ نے ایک الگ مسلم ریاست کے قیام یا ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے کوئی دوسری سیاسی تجاویز بھی پیش کی تھیں؟

جواب:- میں نے ایسی تین تجاویز پیش کی تھیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ

ابھی تحریک پاکستان باقاعدہ شروع نہیں ہوئی تھی۔

سوال:- کیا آپ کی تجاویز قراردادِ پاکستان کے منظور ہونے سے پہلے سامنے آئی تھیں؟

جواب:- جی ہاں، یہ تجاویز میں نے قراردادِ پاکستان سے تقریباً دو تین برس پہلے ۱۹۳۸ء میں پیش کی تھیں۔ پہلے یہ "ترجمان القرآن" میں چھپیں پھر "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ دوم کے نام سے چھپنے والی کتاب میں شائع ہوئیں اور اب وہ تحریک آزادی ہند اور مسلمان، حصہ اول میں شائع شدہ موجود ہیں ان میں سے ایک تجویز تو یہ تھی۔ کہ ہندوستان کی ریاست کسی ایک قوم کی ریاست نہ ہو بلکہ وہ مختلف قوموں کے ایک بین الاقوامی وفاق کی طرز پر ایک وفاقی حکومت ہو جس میں مسلمانوں کی تہذیبی خود مختاری (AUTONOMY CULTURAL) از روئے آئین اور از روئے قانون تسلیم کی جائے اور اس کے عملی حصول واثبات کے لئے مسلمانوں کے پاس حکومتی اختیارات اور ذرائع ووسائل (RESOURCES) موجود ہوں۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں کے الگ الگ علاقے طے کر دیئے جائیں جہاں وہ جمہوری طریق پر اپنی خود مختار ریاستیں بنا سکیں اور ان کے درمیان ایک خاص مدت تبادلہ آبادی کے لئے مقرر کر دی جائے تیسری تجویز یہ تھی۔ کہ اگر یہ دونوں تجاویز نہ مانی جائیں تو پھر ملک کو تقسیم کر کے مسلمانوں کی الگ خود مختار ریاست وجود میں لائی جائے۔

سوال:- پاکستان کے نظریاتی مخالفین یہ نعرہ لگاتے رہے ہیں اور اس نظریے کو عملاً بھی پیش کیا گیا کہ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان قائم کرنے کی تجویز دراصل انگریزی تسلط کو برقرار رکھنے کی ایک اسکیم تھی۔؟

جواب:- یہ تو ایک ایسا جھوٹ ہے جس میں ایک فی ہزار بھی سچائی نہیں ہے انگریزوں کے بارے میں جتنی تاریخی دستاویزات موجود ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملک کو آزاد کرنے کے لئے تیار تھے لیکن وہ اس کے لئے قطعاً تیار نہ تھے

کہ یہاں مسلمانوں کی ایک الگ اسلامی ریاست وجود میں آئے۔ اور اس برصغیر ہی کی بات نہیں وہ دنیا بھر میں کسی جگہ آزاد اسلامی حکومت کا وجود نہیں دیکھنا چاہتے تھے برطانوی حکومت کے ایک بہت بڑے ستون اور مدبر نے غالباً ۱۹۰۷ یا ۱۹۰۹ء میں یہ بات کہی تھی کہ مسلمان قومیں اگر آزادی چاہتی ہیں تو ہم اس کے لئے تیار ہو سکتے ہیں لیکن اگر وہ اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو ہم انہیں کبھی ایسا نہیں کرنے دیں گے یہ تصور تقریباً تمام مغربی قوموں کے دماغوں میں موجود رہا ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں نہیں آنا چاہیئے اور اگر کہیں ایسا ہو جائے تو اس کو قائم نہیں رہنے دینا ہے اس لئے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ انگریزوں نے یہاں اپنا کوئی BASE بنانے کے لئے تحریک پاکستان کو پنپنے اور پاکستان قائم ہونے کا موقع دیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر فی الواقع ان کی ایسی کوئی اسکیم تھی تو پھر انھوں نے پاکستان میں اپنا کونسا BASE بنایا؟

سوال:۔ قیام پاکستان کے بعد ایک مرحلے پر نظریہ پاکستان کی تعبیر معاشی حوالے سے بھی کی گئی اور کہا گیا کہ پاکستان کا قیام مسلمانوں کو ہندوؤں کے معاشی استحصال سے نجات دلانے کے لئے عمل میں لایا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ اس سے مقصود محض سیاسی آزادی تھی۔ آپ اس سلسلے میں کیا فرمائیں گے۔؟

جواب:۔ یہ بات پہلے وضاحت سے بیان کر چکا ہوں کہ قیام پاکستان کا واحد محرک جذبہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کی محبت اور ایک اسلامی ریاست کے قیام کی خواہش تھی۔ ایک بڑا سیدھا سادا سوال ہے کہ اگر قیام پاکستان سے محض مسلمانوں کی سیاسی یا معاشی آزادی مقصود ہوتی تو پھر تحریک پاکستان میں ہندوستان کے ان علاقوں کے مسلمانوں کو شامل ہونے کی کیا ضرورت تھی جن کو پاکستان میں شامل نہیں ہونا تھا۔ وہ کیوں ایسے پاکستان کے لئے اپنی جانیں کھپاتے جس کی سیاسی

آزادی اور معاشی فائدوں میں سے کوئی حصہ ان کو ملنے والا نہیں تھا۔

سوال :۔ ابھی مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے نصب العین کے سلسلے میں کچھ گفتگو ہو چکی ہے اسی ضمن میں ایک اور سوال یہ ہے کہ جب جماعت اسلامی اور تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والی جماعت مسلم لیگ کے مقاصد ایک ہی تھے تو کیا ان دونوں جماعتوں کے درمیان کبھی کوئی رابطہ یا تعاون موجود رہا۔ اگر رہا تو کس شکل میں رہا اور اگر نہیں رہا تو اس کے اسباب کیا تھے؟

جواب :۔ یہ رابطہ و تعاون موجود رہا اور اس کی کئی شکلیں تھیں ان میں سے ایک شکل یہ تھی کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کے اثبات میں اور متحدہ قومیت کے کانگریسی نظریے کے خلاف جتنا کچھ میں نے لکھا اور مسلمانوں کو جس طریقے سے میں نے یہ بات سمجھائی کہ ایک غیر مسلم حکومت کے تحت لادینی جمہوری نظام کے اندر مسلم اقلیت کا حشر کیا ہو گا اس کو مسلم لیگ نے بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا کیونکہ اس طرح کا کوئی مدلل لٹریچر مرتب شکل میں کہیں اور موجود نہیں تھا۔

سوال :۔ کیا مسلم لیگ کے پاس بھی موجود نہیں تھا؟

جواب :۔ یہی تو میں بتا رہا ہوں کہ نہیں تھا اس سلسلے میں دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب مسلم لیگ کے قائدین نے اس بات کو محسوس کیا کہ مسلمان بہرحال ایک اسلامی حکومت کے طالب ہیں اور اسی کے لئے وہ جدوجہد کر رہے ہیں تو انہوں نے ضروری سمجھا کہ اسلامی حکومت کا کوئی اب خاکہ اور عملی ڈھانچہ مرتب کیا جائے جس کے مطابق آگے چل کر کام کیا جا سکے اور تحریک پاکستان کے مؤیدین کا اطمینان بھی اس سے ہو سکے اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس کے اندر مجھے بھی مدعو کیا گیا میں نے اس میں بڑی خوشی سے شرکت کی لیکن پھر معلوم نہیں ہو سکا کہ بعد میں اس کام کو کیوں ختم کر دیا گیا۔ اس کمیٹی کے قیام کے لئے نواب چھتاری نے کوشش

کی تھی اور انہی کی دعوت پر میں اس شریک ہوا تھا۔ اس وقت میری یہ دلی خواہش تھی کہ اسلامی حکومت کے تمام خدوخال پوری طرح واضح کر دیئے جائیں تاکہ آئندہ پاکستان بننے کے بعد کبھی یہ مسئلہ پیدا نہ ہو کہ یہاں پر کیسی حکومت بنائی اور چلائی جائے اسی مقصد کے پیشِ نظر میں نے اس کمیٹی کو اپنا تعاون پیش کیا۔

سوال:۔ مولانا، کیا مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش میں آپ کے شائع شدہ خیالات علامہ اقبالؒ تک بھی پہنچے تھے؟

جواب:۔ نہیں افسوس ہے کہ علامہ اقبالؒ کا انتقال اپریل ۱۹۳۸ء میں ہو گیا تھا۔ اور سیاسی کش مکش حصہ دوم کے مضامین جن کا میں نے ذکر کیا ہے، ان کے انتقال کے بعد لکھے گئے یہ مضامین میں نے نومبر، دسمبر ۱۹۳۸ء میں لکھے تھے

سوال:۔ انڈین نیشنل کانگرس کے بارے میں آپ کے خیالات کیا تھے؟

جواب:۔ کانگرس کے بارے میں میری رائے تو ۱۹۲۴ء ہی میں واضح طور پر اس کے خلاف ہو گئی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں جب شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش پیدا کی اور اس کے نتیجے میں جگہ جگہ فسادات ہوئے تو اس زمانے میں مسلمان لیڈروں نے گاندھی جی اور بعض دوسرے ہندو لیڈروں سے مل کر یہ بات کی کہ تصادم اور فسادات کی جو آگ جگہ جگہ بھڑک اٹھی ہے اس کو روکا جائے اس کی واحد صورت یہ ہے۔ کہ جہاں مسلمانوں کی زیادتی ہو، وہاں ہم مسلمانوں کی مذمت کریں اور جہاں ہندوؤں کی زیادتی ہو، وہاں آپ ہندوؤں کی مذمت کریں۔ اس بات پر اتفاق کیا گیا لیکن اس کے بعد جب کوہاٹ میں ہندو مسلم فساد ہوا تو گاندھی جی نے بڑے زور سے مسلمانوں کی مذمت میں بیان دیا اور ہندوؤں کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بولے اس کے بعد بھی ایسے واقعات رونما ہوئے کہ جہاں بھی ہندوؤں

کی طرف سے زیادتی ہوئی وہاں گاندھی جی بالکل خاموش رہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر کانگریس کے بارے میں میرے خیالات مستقل طور پر ایسے بدلے کہ پھر کبھی ان میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس گروہ اور اس کے لیڈروں کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں رکھی جاسکتی پھر میں نے کانگریس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی پوری تاریخ کا مطالعہ کیا اس ضمن میں تمام دوسری متعلقہ چیزوں کا مطالعہ کرکے میں نے اس کے مرض کی پوری تشخیص کرلی اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لی کہ اس پارٹی کی حقیقت کیا ہے اور اس کے عزائم کیا ہیں۔

سوال:۔ کیا کانگریس کے بارے میں آپ کے کچھ مضامین شائع بھی ہوئے۔

جواب:۔ جی ہاں، "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ دوم کو آپ دیکھئے میں نے اس میں کانگریس کے حقیقی چہرے کو بالکل بے نقاب کرکے رکھ دیا یہ کتاب اب "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" حصہ اوّل میں شامل شدہ موجود ہے۔

سوال:۔ برصغیر کے رہنماؤں اور لیڈروں میں ملاقاتوں اور مراسلت کا ایک طریق رائج رہا ہے کیا آپ نے بھی کبھی اس طریقے سے مختلف رہنماؤں سے رابطہ قائم کیا۔؟

جواب:۔ ہاں ایسا بارہا ہوا ۔۔۔۔ جہاں تک مسلم لیگی رہنماؤں سے رابطہ کا تعلق ہے جب جماعت اسلامی قائم ہوئی تو میں نے اس کے پہلے جنرل سیکرٹری قمرالدین خاں صاحب کو قائداعظم محمد علی جناح سے ملاقات کے لئے بھیجا تاکہ وہ انہیں بتادیں کہ یہ تحریک آپ کے مقابلے میں یا آپ کے خلاف نہیں اٹھائی گئی ہے بلکہ اس کا ایک خاص مقصد اور نصب العین ہے۔ وہ مقصد اور نصب العین بھی درحقیقت وہی ہے جو آپ کا ہے۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ آپ مسلمانوں کے لئے ایک ملک حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک کو ایک حقیقی اسلامی ریاست بنانے کے لئے کام کرسکیں۔ موجودہ حالات میں یہی ایک قابل عمل شکل ہمارے سامنے آئی

ہے کہ آپ جس انداز سے حصول پاکستان کی کوشش کر رہے ہیں وہ آپ کریں، ہم اس میں کسی طرح کی خلل اندازی درست نہیں سمجھتے لیکن بعد کے حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس دور کی طوفانی سیاست سے الگ رہ کر ایسے تربیت یافتہ کارکن اور علمی مواد فراہم کر سکیں جو آگے چل کر کام آئیں۔ قائداعظم علیہ الرحمتہ نے اس بات کو توجہ سے سنا اور اس پر اپنی پسندیدگی اور اطمینان کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد پھر مجھے کسی اور شخص سے اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی، کیونکہ تحریک پاکستان کی اصل ذمہ دار اور فیصلہ کن شخصیت قائداعظمؒ ہی تھے اور ان کو صحیح صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا۔ قمر الدین خاں صاحب نے یہ بات اپنے ایک مضمون میں بھی بیان کر دی ہے۔ جو تھنکر (THINKER) میں شائع ہوا تھا۔

سوال :۔ کانگرسی رہنماؤں اور ان کے ہم خیال مسلمان علماء سے بعد میں کبھی آپ کی کوئی اہم ملاقات یا خط و کتابت ہوئی ہے؟

جواب :۔ ان میں سے بعض حضرات کے ساتھ میرے بہت پرانے تعلقات تھے ایک زمانے میں میں مسلسل چار سال تک (۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۸ء) جمعیتہ علمائے ہند کے اخبار الجمعیتہ کا ایڈیٹر رہا اس دور میں جمعیت علمائے ہند کے ساتھ میرا قریبی رابطہ رہا اور وہ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے تھے اور میں ان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن جب ۱۹۳۷ء میں میں نے اپنے مضامین لکھنے شروع کئے۔

سوال :۔ کیا متحدہ قومیت کے خلاف؟

جواب :۔ جی ہاں متحدہ قومیت کے خلاف اور کانگرس کے ساتھ تعاون کرنے کے نقصانات اور دوسرے متعلقہ مباحث پر، جن میں میں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے لئے کام کرنے کا ایک بالکل جداگانہ راستہ ہے

تو اسی حلقے کے بعض حضرات نے، جن کو میرے خیالات و افکار اور میری شخصیت کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی، اپنے اخبار میں یہ لکھا کہ سر سکندر حیات نے پچاس ہزار روپے دے کر مجھے پنجاب میں بلایا ہے، تو اس کے بعد میں ان لوگوں سے مایوس ہو گیا اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں

سوال:- کیا اس سلسلے میں آپ کی کوئی خط و کتابت بھی ہوئی ؟

جواب:- جی ہاں، بعض حضرات سے میری خط و کتابت بھی ہوئی ؟ جماعت اسلامی کی تشکیل کے وقت میں نے تقریباً ۵، علماء کو خطوط لکھے تھے جن میں میں نے یہ کہا تھا کہ اوّل تو یہ آپ حضرات کے کرنے کا کام تھا۔ اچھا ہوتا کہ آپ اس کے لئے آگے بڑھتے اور ہم آپ کے پیچھے چلتے، لیکن اب چونکہ آپ نے اس کام کی طرف توجہ نہیں دی اور میں نے اس کام کو شروع کر دیا ہے تو اب آپ حضرات آگے بڑھ کر اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیجئے اور ہرگز یہ مت سمجھئے کہ میں ہی اس کا امیر بن کر بیٹھنا چاہتا ہوں۔ آپ اس مقصد کے لئے اٹھیں، آپ کی رکاب تھام کر چلنا میرا کام ہے۔ لیکن اکثر حضرات نے تو میرے خطوط کا جواب ہی نہ دیا اور بعض حضرات نے جو جواب دیے وہ کچھ اس طرح کے تھے کہ کوئی مہدویت کا دعویٰ لے کر اٹھنے والے ہو اور یہ بات ہے اور وہ بات ہے تو پھر اس کے بعد میں نے ان کی طرف کوئی قدم بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کی وہ مراسلت ہجرت کے وقت پٹھان کوٹ ہی میں رہ گئی۔ اس لحاظ سے تو افسوس ہوتا ہے کہ ایک تاریخی ریکارڈ ضائع ہو گیا لیکن اس لحاظ سے خوش بھی ہوں کہ خوش شدہ، برباد شدہ !

سوال:- مولانا، کیا علماء کے ایک طبقے کی طرف سے اب تک آپ کی جو مخالفت کی جا رہی ہے اس کی وجہ یہی تو نہیں ہے کہ آپ نے متحدہ وطنیت کے فلسفے کی مخالفت کی تھی ؟

جواب :- میں تو یہی سمجھتا ہوں متحدہ قومیت اور نسلی وطنیت کے خلاف جو دلائل میں نے دیئے تھے ان کا کوئی رد تو ان علمائے کرام کے پاس تھا نہیں، البتہ میرے خلاف اپنی ناراضی کا اظہار کرنے میں وہ آزاد تھے اور مجھے اس سے کوئی بحث نہ تھی کہ ایک خالص دینی اور ملی مسئلے کے بارے میں معقول طریقے سے اپنا موقف بیان کرنے کے بجائے انہوں نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک سربرآوردہ شخصیت نے صاف صاف یہ انداز استدلال اختیار کیا کہ چونکہ انگریز سوشلزم سے ڈرتا ہے اس لئے پہلے یہاں سوشلزم لانا چاہیئے اس کے بعد اسلام کے لئے راستہ خود بخود ہموار ہو جائے گا میں نے اس پر تنقید کرتے ہوئے یہ لکھا کہ یہ مدار استدلال تو بڑی آفت ہے۔ کیا اس طرح ہم ہر اس چیز کو اختیار کرتے چلے جائیں گے جس سے انگریز ڈرتا ہے -؟ اسی طرح ایک اور صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا کہ اس زمانے میں اسلامی نظام نہیں چل سکتا، اس زمانے میں سوشلزم ہی چل سکتا ہے اس پر بھی میں نے بڑی سخت تنقید کی کہ کیا اب علمائے کرام کا کام باطل نظاموں کی حمایت کرنا ہی رہ گیا ہے ؛ اگر اسلامی نظام قائم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تو کم از کم کفر کو تو تقویت نہ پہنچایئے۔

سوال :- جس طرح بھارت کی دستور ساز اسمبلی نے آغاز ہی میں OBJECTIVES RESOLUTION پاس کیا تھا اس قسم کا ریزولیوشن پاکستان میں کب پاس ہوا ؟

جواب :- اس قسم کا ریزولیوشن پاکستان میں مارچ ۱۹۴۹ء میں پاس ہوا جسے ہم قرارداد مقاصد کہتے ہیں۔ اس زمانے میں میں حکومت پاکستان کی قید میں تھا۔

سوال :- کیا جماعت اسلامی نے اس کی منظوری کے سلسلے میں کوئی تحریک بھی چلائی تھی ؟

جواب :- میں پہلے بیان کرچکا ہوں کہ ہم نے ۱۹۴۸ء میں مطالبۂ نظام اسلامی کی ایک تحریک چلائی تھی جس میں تمام اہل پاکستان دل و جان سے شریک تھے جب یہ مطالبہ مسلسل جاری رہا تو اکتوبر ۱۹۴۸ء میں مجھے اور میاں طفیل محمد صاحب اور امین احسن اصلاحی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا لیکن ہمارے جیل چلے جانے کے باوجود جماعت برابر یہ کام کرتی رہی یہاں تک کہ حکومت کو اس مطالبے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

سوال :- اس قرارداد کی منظوری تک کیا کیا مراحل پیش آئے ؟

جواب :- اوّل اوّل تو یہ کوشش کی گئی کہ کسی طرح یہ قرارداد دستور ساز اسمبلی میں پیش نہ ہو سکے۔ اسمبلی کے اندر ایک اچھا خاصا گروہ ایسا تھا جو ایسی قرارداد کے منظور ہونے کا مخالف تھا۔ جس سے پاکستان کا اسلامی تشخص آئینی طور پر طے ہو سکے۔ بہت سے ایسے حضرات تھے جو یہ کہتے تھے کہ اگر ہم نے پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنایا تو ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے لیکن جب نظام اسلامی کا مطالبہ روز بروز شدت اختیار کرتا چلا گیا تو بالآخر مارچ ۱۹۴۹ء میں "قرارداد مقاصد" اسمبلی میں پیش اور منظور کی گئی اور اس میں تقریباً وہ سارے نکات آ گئے جو میں نے ۱۹۴۸ء میں مطالبہ نظام اسلامی کے سلسلے میں اپنی لا کالج لاہور کی تقریر میں بیان کئے تھے۔ اس قرارداد کی منظوری کے بعد حکومت کا طرزِ عمل سامنے آیا اس پر میں سوچتا رہا کہ یہ قرارداد کس نیت سے پاس کی گئی ہے۔ اگر اس کے پیچھے واقعی یہ نیت کارفرما ہے کہ اب اس کو عملی جامہ پہنانا ہے تو پھر اس کے بعد مجھے اور میرے ساتھیوں کو قید رکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن جب اس کے بعد ہماری نظربندی میں توسیع کی گئی تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کس غرض کے لئے پاس کی گئی ہے۔ چنانچہ اپنی رہائی کے بعد جو پہلی تقریر میں نے کی تھی اس میں میں نے یہ کہا

تھا۔ کہ یہ قرارداد ایک ایسی بارش ہے کہ نہ جس سے پہلے کوئی گھٹا اٹھی اور نہ جس کے بعد کوئی روئیدگی ہوئی۔ بس ایک واقعہ تھا جو ہو گیا۔ بغیر کسی علت کے اور بغیر کسی نتیجے کے اب آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ قرارداد مقاصد پاکستان کے ہر دستور کا دیباچہ بنتی چلی آ رہی ہے لیکن کام اس کے مطابق کبھی نہیں کیا گیا۔

سوال:۔ آپ نے دستور ساز اسمبلی کے ارکان کو علمی اور سیاسی سطح پہ متاثر کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ اسمبلی میں آپ کے ہم خیال ارکان کی تعداد کتنی تھی؟

جواب:۔ ایسے ارکان کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد تھی خود مولانا شبیر احمد عثمانی جیسی محترم شخصیت اسمبلی میں موجود تھی جو اندر اور باہر اس مقصد کے لئے کوشاں تھی ان کے علاوہ ڈاکٹر عمر حیات صاحب اور بعض دوسرے حضرات ایسے تھے جو اس معاملے میں جدوجہد کر رہے تھے ایسے حضرات بھی تھے جو دل سے اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ یہ کام کرنا چاہیئے لیکن ایک دوسرا اچھا خاصا بااثر گروہ ایسا موجود تھا جو اس کو آخر وقت تک روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ بہر حال جب حکومت چلانے والے ذمہ دار لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ مطالبہ اب اتنا زور پکڑ چکا ہے کہ اگر اس کو مزید ٹالا گیا تو معاملات بگڑ جائیں گے تو یہ قرارداد منظور کر لی گئی لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اس کو منظور کرنے کے بعد جو کچھ کرنا چاہیئے تھا وہ نہیں کیا گیا میں اس کو بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ جس چیز نے پاکستان کو وجود بخشا تھا اس کو یہاں تقویت پہنچانے کی بجائے مسلسل کمزور کیا گیا اور اسی کا نتیجہ ہم نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں بھگتا۔ مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے ساتھ ملا کر رکھنے والی چیز اسلام کے سوا کیا تھی۔ لیکن ذرا برابر اس امر کی کوشش نہیں کی گئی کہ اسلام کے ذریعے سے دونوں خطوں میں جو رابطہ ہے اس کو مضبوط بنایا جاتا اس کے برعکس کیا یہ گیا کہ ناچنے گانے والے طائفوں کے تبادلوں کو ثقافتی روابط

کا ذریعہ ٹھہرایا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں کے لوگ مغربی پاکستان سے بدظن ہوتے چلے گئے اور وہ حقیقی تعلق جو دونوں حصوں کے درمیان موجود تھا روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا۔ ناعاقبت اندیشی اور بدتدبیری کی حالت یہ تھی کہ وہاں بعض تعلیمی اداروں میں اسلامیات پڑھانے والے استاد ہندو تھے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ حکمران طبقے کی غفلت کس درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔ ادھر ہندوستان سے ایسا لٹریچر وہاں بارش کی طرح برسایا جا رہا تھا جو مشرقی پاکستان کے پڑھے لکھے طبقے کے اندر یہ زہر گھول رہا تھا کہ تمہاری قومیت کی بنیاد مذہب نہیں ہے۔ بلکہ بنگلہ زبان اور بنگلہ نسل ہے بنگال میں پیدا ہونے اور بنگالی بولنے والے ہندو اور مسلمان ایک قوم (بنگلہ قوم) ہیں اور یہ اردو بولنے والے مسلمان مہاجر ایک دوسری قوم ہیں اس زہریلے لٹریچر کا سد باب کرنے کے لئے مطلق کوئی قدم نہ اٹھایا گیا بلکہ اس کو پھیلنے کی پوری آزادی دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ نوجوان نسل بنگالی قومیت کے فتنے کا شکار ہوتی چلی گئی اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمان نے مسلمان کی آبرو لوٹی اور اس کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے یہ سب کچھ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔

سوال:۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد جماعت اسلامی کے بارے میں اس وقت کے حکمرانوں کا جو رویہ سامنے آیا اس کے اسباب آپ کے خیال میں کیا تھے۔؟

جواب:۔ فوراً بعد ایسا نہیں ہوا۔ جب پاکستان قائم ہوا تو اس کے بعد مجھے بار بار ریڈیو پاکستان پر بلایا گیا۔ میری وہ سلسلہ تقاریر اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا جو بعد میں "اسلام کا نظام حیات" کے نام سے شائع ہوا۔ ان تقاریر میں نے اسلام کے اخلاقی، روحانی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کے موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد ریڈیو پاکستان سے ایک مباحثہ بھی اس موضوع پر

نشر کیا گیا کہ آیا پاکستان کو ایک اسلامی ریاست ہونا چاہیئے یا نہیں - ایک صاحب مخالف جانب سے اسلامی حکومت کے خلاف اپنے دلائل دے رہے تھے اور میں نے ان میں سے ایک ایک چیز کا مدلل جواب دے کر یہ بات ثابت کی کہ یہاں صرف اور صرف اسلامی حکومت ہی قائم ہونی چاہیے۔ اور اس کے بارے میں جتنے شکوک وشبہات اور اعتراضات ہیں وہ سب بے وزن اور بے حقیقت ہیں اس طرح مجھے ریڈیو پاکستان سے مکمل کر اسلامی حکومت کے حق میں استدلال کرنے کا موقع دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد یہ رویہ تبدیل ہو گیا اور یہ تبدیلی اس وقت سامنے آئی ہے جب ۱۹۴۸ء میں مجھے اور جماعت اسلامی کے دو اور ذمہ دار لیڈروں کو گرفتار کیا گیا۔

سوال :- کیا آپ کے علم میں اس کا کوئی ایک سبب ہے ؟

جواب :- ہوسکتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ قائداعظمؒ جب تک زندہ تھے ان کو یہ گفتگو یاد رہی ہو جو میری جانب سے جماعت اسلامی کے قیام کے موقع پر جماعت کے سیکرٹری جنرل نے ان سے کی تھی اور جس سے انہوں نے اتفاق اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور سبب ہو لیکن بہر حال یہ بات واضح ہے کہ حکومت کے رویئے میں یہ صریح تبدیلی قائداعظمؒ کی وفات کے بعد ہی واقع ہوئی۔

سوال :- کیا آپ کے خیال میں اس کو سیاسی رقابت کا شاخسانہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب :- میں تو نہ کبھی کسی کا رقیب پہلے تھا نہ اب ہوں اگر کچھ لوگوں نے خود رقابت کا کوئی احساس اپنے اوپر طاری کر لیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔ میرے پیش نظر تو کبھی یہ نہیں رہا کہ میں کسی کو مسند حکومت سے ہٹا کر خود اس پر بیٹھ جاؤں میرے پیش نظر ہمیشہ جو چیز رہی اور آج بھی ہے وہ یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے پاکستان بنایا گیا

ہے اس کو پورا کیا جائے اور اس کی تکمیل انہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہو جو حکومت پر فائز ہیں تو چشم ما روشن دل ما شاد!

میں نے بارہا اپنی تقریروں میں یہ بات کہی ہے کہ جو کوئی بھی قیام پاکستان کا مقصد پورا کرے میں اس کے ساتھ چپڑاسی بن کر کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے کوئی عہدہ اور منصب نہیں چاہیئے۔ مگر نہ معلوم کیوں برسر اقتدار حضرات کے دماغ یہ سوچنے سے قاصر رہے کہ کوئی شخص بے لوث ہو کر بھی اس مقصد کے لئے کام کر سکتا ہے۔

سوال :- کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قیام پاکستان سے قبل اور بعد آپ نے اور آپ کی جماعت نے جو کام کیا وہ بے نتیجہ نہیں رہا؟ کیا آپ کے خیال میں آپ کی تحریک ناکام نہیں رہی ہے؟

جواب :- نہیں ہماری تحریک ناکام نہیں رہی ہے۔ اصل میں یہ تحریک ایک فطری تدریج چاہتی ہے یہ تحریک اسی وقت صحیح معنوں میں کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت اس کی ہم خیال بن جائے۔ اس وقت تک ہم ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت کو ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں ملک کے عام باشندوں کی اکثریت کو شعوری طور پر اپنا ہم خیال بنانے میں ابھی وقت لگے گا۔ جب ایسا ہو جائے گا تو اس وقت کوئی طاقت اس نظام کو برپا ہونے سے نہیں روک سکے گی جس کو برپا کرنے کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں

سوال :- ہمارے سامنے اس قسم کی مثالیں موجود ہیں کہ بعض نظریاتی ریاستوں کا وجود ایسی حالت میں عمل میں آیا جبکہ وہاں کے عام باشندے اس عام نظریے کے حامی و قائل نہ تھے۔ لیکن اقتدار پر قابض ہو کر با اختیار گروہ نے لوگوں کو نظریاتی رنگ میں رنگ کر کامیابیاں حاصل کیں۔ کیا آپ کے نزدیک اسلام کی سربلندی کے لئے نظریاتی

انقلاب کا یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔؟

جواب:۔ نہیں، ہم اس قسم کے طور طریقے اختیار نہیں کر سکتے۔ جن لوگوں کی طرف آپ کا اشارہ ہے وہ پہلے لوگوں کو یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ ہم ورکرز کی حکومت قائم کریں گے۔ لیکن جب ان کے ہاتھوں سے " ورکرز کی ڈکٹیٹر شپ" قائم ہوتی ہے تو اس کے اندر خود ورکرز سے بڑھ کر مظلوم و مقہور اور مجبور و بے بس طبقہ کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دھوکہ بازی ہم نہیں کر سکتے۔ ہم تو لازماً عوام کا ذہن اور ان کے خیالات کو تبدیل کر کے ہی اسلامی نظام قائم کریں گے۔

سوال:۔ اقتدار میں آنے کے بعد کیا حکومتی ذرائع و وسائل کو بروئے کار لا کر عملاً یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے نظریات ہی زیادہ قابل عمل اور صحیح و سود مند ہیں؟ کیا یہ زبانی تبلیغ اور کتابیں پڑھنے اور پڑھوانے سے زیادہ موثر طریقہ نہیں ہے؟

جواب:۔ اقتدار پر پہنچنے کے لئے آپ کونسا راستہ تجویز کرتے ہیں۔

سوال:۔ نیک اور اعلیٰ مقاصد کے لئے، ہم اسلامی تاریخ میں دیکھتے ہیں، کہ جہاد بھی ہوتا رہا ہے، اور اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک سیاسی لیڈر کے سوچنے کا کام ہے کہ وہ طریقہ کیا ہو۔؟

جواب:۔ جس ملک میں ہم کام کر رہے ہیں اس کے اندر ہمارے نزدیک صحیح طریقۂ کار یہی ہے کہ ہم جمہوری ذرائع ہی سے اسلامی انقلاب لانے کی کوشش کریں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں خواہ کتنی مرتبہ ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جائے اس کو کبھی استحکام نصیب نہیں ہو گا۔ وہ بار بار یہاں ناکام ہو گی اور بالآخر یہاں جمہوریت ہی کا طریقہ رائج ہو گا اور اسی کے ذریعے سے ہم یہاں اسلامی نظام کے قیام کی راہ ہموار کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ ہم برابر لوگوں کے ذہنوں کو تیار کرنے کا کام کرتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ ان کے اندر یہ پیاس اور تڑپ پیدا ہو جائے کہ وہ کسی غیر اسلامی نظام کو قبول اور برداشت

کرنے کے لئے تیار نہ رہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے یہ طریقۂ کار اس بنا پر اختیار کیا ہے کہ اگر عام لوگوں کا ذہن اسلامی حکومت کے نظام کو بخوشی قبول کرنے پر تیار نہ ہو اور وہ زبردستی اوپر سے لا کر ان پر مسلط کر دیا جائے تو یہ نظام چل نہیں سکتا اور اس طرح کی حکومتیں قائم بھی ہو سکتی ہیں اور چل بھی سکتی ہیں ۔ لیکن اسلامی حکومت نہیں چل سکتی اسلامی حکومت کے کامیابی کے ساتھ چلنے کا انحصار جہاں ایک طرف اس بات پر ہے کہ اس کو چلانے والے ہاتھ صالح اور خدا ترس ہوں وہاں دوسری طرف اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں پر خدا کا قانون جاری کیا جائے وہ بھی اس قانون کے مطابق ڈھلنے پر تیار ہوں ۔ اسلامی حکومت دراصل ایک ایماندار اور خدا ترس معاشرہ چاہتی ہے ۔ اگر ایک بددیانت اور خوف خدا سے عاری معاشرے میں اسلامی قوانین نافذ کر دیئے جائیں تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ان قوانین کا کیا حشر ہو گا ۔ جس معاشرے میں قانون کی رکھوالی کرنے والی پولیس بے ایمان اور حکومت کے اہل کار رشوت خور اور بدعنوان ہوں وہاں کیا زبردستی اسلامی قوانین نافذ کر کے آپ اسلام کو کھلوانا بنائیں گے ۔ اس بنا پر ہمارے نزدیک اسلامی نظام کے قیام کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی ایک عام طلب اور پیاس لوگوں کے اندر پیدا کی جائے ۔ علاوہ بریں رائے عام کو اس کے حق میں اس حد تک ہموار کر دیا جائے کہ کوئی غیر اسلامی نظام یہاں پنپ نہ سکے اور صرف وہی لوگ قیادت کے منصب پر آگے آ سکیں جو نیک نیتی سے اسلامی نظام کو قائم کرنا چاہتے ہوں ۔ ریاست پاکستان کی شکل میں مسلمانوں کو ایک اچھا موقع ضرور اس بات کا ملا تھا کہ وہ حکومت کے ذرائع و وسائل کو کام میں لا کر یہاں صحیح معنوں میں ایک اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت کی تشکیل کریں لیکن اس موقع کو اب تک جس طرح ضائع کیا گیا اس کی تفصیل میں مجھے جانے کی ضرورت نہیں ان سب حالات سے آپ بھی باخبر ہیں ۔

سوال :- اس کی کیا وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند اسلامی نظام قائم کرنے کی غرض سے ملک پاکستان حاصل کرنے میں تو سات آٹھ سال میں کامیاب ہو گئے لیکن اس کے بعد آپ کے خیال کے مطابق اسلامی حکومت کا قیام آج تک عمل میں نہیں آسکا۔؟

جواب :- اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان جس چیز پر متحد ہوئے اس کے اندر ایک جذباتی اپیل تھی چنانچہ ایک الگ ملک حاصل کرنے میں وہ ایک مختصر مدت میں کامیاب ہو گئے لیکن اس کے بعد جو اصل تعمیری مرحلہ تھا اس کے لئے جس تیاری کی ضرورت تھی اور جو دماغی صلاحیتیں اور عملی قابلیتیں درکار تھیں وہ بڑی حد تک مفقود تھیں۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سے اس مرحلے کی تکمیل ہوتی تھی وہ خود اس کے لئے پروش اور مستعد نہیں تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں صحیح ارادہ ہی مفقود تھا تو وہ بھی غلط نہ ہوگا، کیونکہ انہوں نے اپنے عمل سے یہ بات ثابت کی۔ اگر یہاں پہ نیک نیتی کے ساتھ نظام تعلیم کی اصلاح وتشکیل نو کر دی جاتی۔ نظام معیشت اور نظام عدالت اور حکومت کے دوسرے شعبوں کو صحیح خطوط پہ استوار کر دیا جاتا تو ایک ایسا معاشرہ وجود میں آسکتا تھا جو اسلامی معاشرہ ہوتا اور جس مقصد کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا وہ شرمندۂ تعبیر ہو جاتا لیکن اس سمت میں کوئی مثبت اقدام کیا ہی نہیں گیا۔ بلکہ اس کے برعکس یہاں مسلسل وہ حالات پیدا کئے گئے جن میں مسلمانوں کی حقیقی منزل نظروں سے اوجھل اور دور تر ہوتی گئی اس صورت حال کو بدلنے کے لئے جو کچھ جدوجہد ہم کر سکتے تھے وہ برابر کرتے رہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ لیکن اب تک جتنی حکومتیں برسر اقتدار آئی ہیں۔ انہوں نے کبھی نہ خود اسلامی نظام کے قیام کے لئے دیانت داری سے کام کیا اور نہ ان لوگوں کو کرنے دیا جو خلوص نیت سے یہ کام کرنا چاہتے تھے اور اسی میں پاکستان کی بقاء اور ترقی کو مضمر جانتے تھے۔ اعلیٰ سطح پر اس غلط روش کے نتائج

یہ نکلے کہ عوام الناس کے اندر رہ جذبہ کمزور ہوتا چلاگیا اور آج ہمارہ معاشرہ جس مقام پر کھڑا ہے اس کی حقیقی کیفیت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کی اصلاح میں اقتدار کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی میں پھیلنے والی خرابیوں کے بعد جو چیز حائل ہورہی ہے وہ تعلیم کی کمی ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جس کی اکثریت تعلیم سے بے بہرہ ہے اپنے لٹریچر اور تبلیغ و تقریر کے ذریعے سے جو کام کرنا ہمارے لئے ممکن ہے وہ کر رہے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اتنے محدود وسائل کے ساتھ کوئی بڑا اور فوری نتیجہ نکال کر دکھا دینا مشکل ہے۔

سوال:۔ قیام پاکستان کے بعد سے مختلف حکومتوں کا جو رویہ آپ کی جماعت کے بارے میں رہا ہے ابھی ہم اس کا ذکر کر رہے تھے۔ غالباً کل چھ سات حکومتیں اس سارے عرصے میں بنی ہیں آپ نے اس سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی اور مختلف برسر اقتدار آنے والی حکومتوں کے درمیان کوئی واضح مفاہمت نہیں ہوسکی۔ بلکہ ایک طرح مزاحمت کی صورت رہی ہے جب کہ اس دوران میں بعض ایسے افراد بھی ذمہ داری کے منصب پر رہے جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر آپ کے ہم خیال تھے لیکن پھر بھی یہ مستقل کشمکش کی فضا کیوں رہی ہے؟ کیا اس پر آپ روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے۔؟

جواب:۔ بات دراصل یہ ہے کہ حکومتیں تو ضرور بدلتی رہی ہیں۔ لیکن ایک خاص طبقہ ایسا رہا ہے جو حقیقت میں اقتدار کا حامل تھا۔ اور حکومتیں تبدیل ہونے سے اس طبقے کے اختیارات میں کوئی کمی نہیں آئی۔ حکومت کا کاروبار بیشتر اسی طبقے کی منشاء کے مطابق چلتا رہا ہے۔ یہ بات مجھے بھی معلوم ہے کہ بعض ایسے اصحاب ملک کی وزارت عظمیٰ پر فائز رہے ہیں۔ جو اسلامی نظام کے حامی تھے۔ لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اس اونچے منصب پر ہوتے ہوئے بھی کس قدر بے اختیار تھے۔ ایک

زمانے میں جب ہم مطالبہ نظام اسلامی کی مہم پورے زور سے چلا رہے تھے تو اس وقت کے وزیر اعظم صاحب نے مجھے کہلا بھیجا کہ مجھے آپ کے مقصد سے پورا اتفاق ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں نے اس کو عملی شکل دینے کی کوشش کی تو میں اپنی جگہ پر نہ رہ سکوں گا۔ اور فی الواقع ان کے ساتھ ہوا بھی یہی! ایک اور صاحب بھی تھے جو ملک کے سب سے بڑے انتظامی منصب پر رہے اور ان کے خیالات بھی ہمارے علم میں تھے لیکن وہ بھی اس معاملے میں بالکل بے بس تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کو ملک کی صدارت پر لانے کے لئے مجبور تھے۔ جس کو اسلام کے نام سے چڑ تھی۔ صدارت پر فائز ہونے کے بعد اس شخص نے اسلامی نظام کی کوششوں کو مفلوج کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پھر ملک کی وزارت عظمٰی پر ایک ایسے صاحب فائز ہوئے جنہوں نے جداگانہ انتخاب کا اصول ختم کرا کے مخلوط انتخاب کا طریقہ زبردستی نافذ کرایا اور اس طرح مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد رکھ دی میں نے اسی زمانے میں صاف طور پر کہہ دیا تھا، جو لکھا اور چھپا ہوا موجود ہے کہ مخلوط انتخاب کے تحت پہلا انتخاب ہی پاکستان کی قسمت کا فیصلہ کر دے گا۔ دوسرے انتخاب کی نوبت ہی نہ آسکے گی۔ اب یہ واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ تو اس طرح کے لوگوں سے ہمیں سابقہ پیش آتا رہا اور ہماری جو مزاحمت آغاز ہی میں ہمارے سامنے آگئی تھی وہ برابر کسی نہ کسی شکل میں باقی رہی کیونکہ کسی ایک آدمی کا صدر یا وزیر اعظم ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حکومت چلانے والا اصل طبقہ ایک ہی رہا ہے اور اسلام کے بارے میں اس کا رویہ بھی ایک جیسا رہا ہے۔ اس طبقہ کو اسلام کا غلبہ پسند نہیں اور اس مقصد کے لئے وہ ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا رہا ہے اب خدا کا شکر ہے کہ آہستہ آہستہ اس طبقے میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو اسلامی نظام کو پسند کرتے ہیں اور امید ہے انشاءاللہ دیر یا سویر حالات بدلیں گے۔

سوال:- آپ کی ذات اور جماعت اسلامی کے بارے میں ارباب اقتدار کی مخالفت کے سلسلے میں ایک واقعہ اس طرح یاد آتا ہے کہ جب آپ کا موقف پاکستان کے قومی مفاد سے متصادم ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہنا چاہیں گے۔؟

جواب:- اس معاملے میں کوئی بات کہنے سے پہلے میں ایک بات پوچھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر فرض کیجئے کہ پاکستان کے کسی سیاسی رہنما کی جانب سے کوئی ایسی بات کہی جائے جو جہاد کشمیر کے خلاف ہو تو اس بات کو اچھالنا اور بڑے پیمانے پر اس کی اشاعت کرنا پاکستان کے قومی مفاد میں ہے یا اس کو دبا دینا قرین مصلحت و حکمت ہے۔

سوال:- ظاہر ہے کہ اس کو دبا دینا پاکستان کے مفاد میں ہے۔؟

جواب:- مگر ہوا یہ کہ ایک شخص پشاور میں میرے پاس آ کر یہ کہتا ہے کہ علیحدگی میں ایک بات آپ سے کرنا چاہتا ہوں۔ وہ لوگ زندہ موجود ہیں جن کے سامنے وہ میرے پاس آیا۔ میں نے کہا بسم اللہ تشریف لائیے ان صاحب نے کہا کہ پاکستان کشمیر میں جو جہاد کر رہا ہے۔ آپ اس میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟ میں نے کہا: بھئی پاکستان اگر واقعی جہاد کرے تو میں اس سے پیچھے رہنے والا نہیں ہوں لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ پاکستان بھی جہاد کر رہا ہے اور نہیں بھی کر رہا ہے۔ یو این او کے اندر پاکستان کا نمائندہ یہ بیان دیتا ہے کہ ہم کشمیر میں نہیں لڑ رہے ہیں اور اگر قبائلی لشکر کشمیر میں گئے تو ہم ان کا مواجب بند کر دیں گے۔ دوسری طرف آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کشمیر میں لڑ رہا ہے۔ تو یہ اسلامی جہاد کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ سیدھی طرح سے اسلامی جہاد کیجئے۔ ہم اس میں جان و مال سے حاضر ہیں، یہ ہمارا قومی اور ملکی مسئلہ ہے ہم اس سے پہلو تہی کیوں کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ صاحب تشریف لے گئے۔ اگلے روز پشاور کے اخبارات میں یہ دیکھتا ہوں کہ ان صاحب نے مجھ سے اپنی گفتگو کی یہ رپورٹ شائع کرائی کہ میں نے جہاد کشمیر

کو حرام قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ جو لوگ وہاں لڑائی میں مارے جائیں گے۔ وہ حرام موت مریں گے ــــ اس کے فوراً بعد ہی اس من گھڑت رپورٹ کو ریڈیو پاکستان سے براڈکاسٹ کرنا شروع کیا گیا اور تمام اخبارات میں ایک زبردست پروپیگنڈہ مہم میرے خلاف شروع کردی گئی۔ میں حیران تھا کہ یہ سب کیا کھیل ہو رہا ہے۔ اگر فرض کیجئے کہ میں نے وہی کچھ کہا ہو جو انہوں نے میری طرف سے منسوب کیا تو سیدھا سا سوال یہ تھا کہ کیا یہ چیز خود ریڈیو پاکستان کو نشر کرنی چاہیئے تھی کہ ابوالاعلیٰ مودودی نام کا ایک شخص جسے بہرحال پاکستان کے اندر اور باہر لوگ کسی نہ کسی حیثیت سے جانتے ہیں وہ کشمیر میں جہاد کرنے کے خلاف ہے؟ اس سے پاکستان کا کون سا مفاد پورا ہوتا تھا اور خود کشمیر کے اندر لڑنے والوں کو اس سے کیا تقویت پہنچی تھی کہ انہیں اس شک میں مبتلا کرنا ضروری سمجھا گیا کہ ایک شخص ان کی جنگ کو جہاد نہیں سمجھتا! یہ کھیل اس معاملے میں کھیلا جا رہا تھا۔ میں پشاور سے واپس لاہور آیا۔ میں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ایک سراسر غلط بات مجھ سے منسوب کی جا رہی ہے۔ مجھے موقع دیا جائے کہ میں ریڈیو پاکستان پر آ کر خود اس کی تردید کروں۔ لیکن انکار کر دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ حکومت اور پاکستان کے مفاد میں تھا یا اس کے خلاف تھا؟ اب آپ خود ہی بتایئے کہ اس کے محرکات کیا تھے۔؟

سوال:۔ اس وقت کے اخبارات کے بارے میں تو یہ تاثر نہیں تھا کہ وہ حکومت کے دباؤ کے سامنے بے بس اور مجبور ہیں۔ کیا کسی اخبار یا اخبار نویس نے اس سلسلے میں آپ سے کوئی رابطہ قائم کیا جس سے آپ کی تردید سامنے آسکتی؟

جواب:۔ کسی اخبار کی طرف سے کوئی شخص میرے پاس رابطہ قائم کرنے کے لئے نہیں آیا۔ ہمارا اپنا اخبار "تسنیم" تھا۔ جس کے ذریعے سے ہم اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے تھے لیکن اس کو بھی بند کر دیا گیا تا کہ ہم اپنی بات لوگوں کے سامنے نہ

رکھ سکیں ۔ دوسرے اخبارات کا ہم ذکر فرما رہے ہیں۔ میری بات شاید کسی کو تلخ لگے مگر ہے واقعہ یہی کہ اس زمانے میں اخبارات پر مسلم لیگ کا تعصب طاری تھا اور ان کا طرزِ فکر یہ تھا کہ جو مسلم لیگ سے تعلق نہیں رکھتا وہ ضرور گردن زدنی ہے اس حالت میں ہماری بات جتنی کچھ لوگوں تک پہنچ سکتی تھی ۔ اس کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں ۔

سوال :۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ سارا پروپیگنڈا آپ کے خلاف کسی اقدام کی تمہید کے طور پر تھا ۔

جواب : ۔ حالات آپ کے سامنے ہیں ۔ جس زمانے میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا میں دیکھ رہا تھا کہ میرے رفقاء اس سے پریشان ہیں ۔ لیکن میں نے انہیں اطمینان دلایا اور وہ میرے رفقاء خدا کے فضل سے اب بھی موجود ہیں جن سے میں نے یہ بات کہی تھی کہ آپ بالکل پریشان نہ ہوں ۔ ہمارے خلاف جو کچھ کیا جا رہا ہے ۔ اس کا ہمیں ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچے گا ۔ جو کچھ یہ لوگ کرنا چاہتے ہیں کر لیں ۔ انشاء اللہ ہمارے قدم آگے ہی بڑھیں گے ۔ اور امر واقع یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمیں بدنام کرنے کی ان ساری کوششوں کے باوجود ہمارے قدموں کو آگے بڑھنے سے کبھی نہیں روکا جا سکا

سوال :۔ کیا وہ صاحب جنہوں نے جہادِ کشمیر کے سلسلے میں وہ بات آپ سے منسوب کی تھی ۔ آپ سے بعد میں کبھی معافی مانگنے بھی آئے تھے ۔ ؟

جواب :۔ جی ہاں ، یہ امر واقع ہے کہ ان صاحب نے مجھ سے آکر معافی بھی مانگی لیکن بعد میں جا کر خود ہی اس کی تردید بھی کر دی ۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ صاحب کس اثر کے تحت میرے پاس آئے تھے اور پھر کس اثر کے تحت انہوں نے جا کر اس کی تردید بھی کر دی ۔ لیکن میں نہ کبھی اس بات کا خواہش مند تھا کہ وہ آکر مجھ سے معافی مانگیں اور نہ مجھے اس کی کوئی پروا ہوئی کہ انہوں نے جا کر اس کی تردید کر دی ۔!

سوال : ۔ مخلوط انتخاب کی مضرتوں کے بارے میں آپ کی جو رائے تھی وہ تو بہر حال

اب ایک امر واقعہ ہے لیکن اس سے پہلے پاکستان میں بعض جزوی نوعیت کے انتخابات ہوتے رہے جن میں جماعت اسلامی نے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ عوام وخواص سے رابطے کی دوسری شکلیں بھی جماعت اختیار کرتی رہی ہے جن میں لٹریچر اور اجتماعات وغیرہ بھی شامل ہیں اور جماعت کا ایک اچھا خاصا حلقہ اثر ملک کے اندر محسوس کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے خیال میں اس کا کیا سبب رہا کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جماعت کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اتنی کامیابی بھی نہیں ہوئی جتنی بعض سیاسی جماعتوں کو بھی حاصل ہوئی جن کا عوامی رابطہ جماعت کی سطح کا بہرحال نہیں تھا۔؟

جواب:- اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ جماعت اسلامی محض انتخاب جیتنے کو اصل کام قرار نہیں دیتی۔ وہ اصل کام اس کو سمجھتی ہے کہ عام لوگوں کی ذہنی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ وہ ایک صحیح وصالح نظام کے طالب بنیں اور اس نظام کو چلانے کے قابل ہو سکیں۔ اس بناء پر جماعت لوگوں سے غلط قسم کے وعدے نہیں کر سکتی اور نہ لوگوں کو غلط قسم کی توقعات دلا سکتی ہے۔ جماعت اسلامی نے اب تک جس انداز سے ملک میں کام کیا ہے اس کی وجہ سے لوگ اس کے بارے میں ایک واضح رائے رکھتے ہیں۔ جماعت سے کوئی شخص یہ توقع نہیں کر سکتا کہ اگر اس کا کوئی آدمی کسی جرم کی پاداش میں پکڑا جائے گا تو جماعت کا کوئی ایم پی اے یا ایم این اے اس کو قانون کی گرفت سے چھڑوانے جائے گا۔ خدا کا فضل ہے کہ جماعت اسلامی ایک بے داغ اور کھری جماعت ہے۔ وہ سیدھے سیدھے اپنے مقاصد اور اصول لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس کے پیش نظر کبھی یہ نہیں رہا کہ وہ کسی نہ کسی طرح انتخاب جیت جائے۔ وہ چاہتی ہے کہ اگر وہ انتخاب میں کامیاب ہو تو صحیح طریقے سے ہو اور اس بات کا انحصار اس چیز پر بھی ہے کہ انتخاب صحیح اصول اور صحیح شرائط و حالات کے مطابق ہو۔ آج تک یہاں کوئی انتخاب صحیح طریقے

پر (FAIR) نہیں ہوا۔ جس وقت ۱۹۵۰ء میں پنجاب میں پہلے انتخابات ہوئے ہیں اس وقت بدعنوانیوں کے نئے ریکارڈ قائم کئے گئے۔ اس زمانے کے پولیس سپرنٹنڈنٹس کو بلاکر یہ ہدایات دے دی گئیں کہ فلاں فلاں حضرات کو جتانا ہے یہ ابتداء تھی اس ملک میں جمہوری تجربے کی۔ اس کے بعد جو آیا اس نے پچھلے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اور مزید تحقیقات کر کے ان میں اضافہ کیا اور یہ اضافہ برابر چل رہا ہے۔

سوال:۔ لیکن ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بارے میں یہ واضح تاثر پایا جاتا ہے پاکستان کے اندر بھی اور باہر بھی کہ یہ انتخابات واقعی آزادانہ تھے آپ کی اس تاثر کے بارے میں کیا رائے ہے۔

جواب:۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے وہاں انتخابات ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ (UNFAIR) ہوا۔ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کو بالکل کھلی چھٹی دے دی گئی تھی کہ انتخاب میں جو دھاندلی اور زیادتی وہ کر سکتی ہے کر گزرے جگہ جگہ جبر و تشدد سے کام لیا گیا۔ بہت سے مقامات پر ان لوگوں نے دوسری جماعتوں کے پولنگ ایجنٹس کو پولنگ بوتھس میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔ ان کے بکس تک جلا ڈالے گئے۔ خیمے اکھاڑ دیئے گئے۔ مسلمان عورتوں کو ووٹ ڈالنے کے لئے گھروں سے تقریباً نکلنے ہی نہیں دیا گیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ کوئی شریف آدمی ان کی اس دھاندلی کو روکنے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس ہندو عورتیں اس طرح ووٹ ڈالنے کے لئے جاتی رہیں جس طرح چیونٹیوں کی قطار چلتی ہے۔ اس طرح کے ہتھکنڈے انہوں نے پوری آزادی سے اختیار کئے جس کے نتیجے میں یہ ممکن ہی نہ رہا کہ مجیب الرحمٰن کے خلاف عوامی رائے کا کوئی صحیح اظہار ہو سکتا۔ جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ یہاں پہلے کے مقابلے میں زیادہ FAIR انتخابات ہوئے لیکن اگر آپ حالات کا ناقدانہ جائزہ لیں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہاں بھی انتخابات

صحیح نہیں ہوئے دو تین چیزیں یہاں بھی انتخاب کا صحیح نتیجہ برآمد ہونے پر اثر انداز ہوئیں تعلیم یافتہ طبقے کی حد تک بعض خاص قسم کے گروہوں کو چھوڑ کر، اکثریت نے ووٹ ہمارے حق میں ڈالے، لیکن ان پڑھ طبقے کے مختلف گروہ دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی نے ان کو یہ فریب دیا کہ اگر ہم برسراقتدار آ گئے تو ہم تمہیں اتنے ایکڑ فی کس کے حساب سے زمین دیں گے، جو ٹیکسی تم چلاتے ہو اور جس مکان میں تم رہتے ہو اس کے تم مالک بنا دیئے جاؤ گے۔ یہ پرچی لے جاؤ، جب ہم کامیاب ہو جائیں گے تو آ جانا ہم تمہیں فی کس ساڑھے بارہ ایکڑ زمین دیں گے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس طرح سے ان کے فریب میں آ گئی۔ باقی لوگوں کو مختلف طریقوں سے بہکانے کا کام کچھ دوسرے حضرات نے کیا، میں ان کے نام کیا لوں۔ جب کسی قوم کے عمال اس کو دھوکا دینے اور بیوقوف بنانے پر اتر آئیں تو اس کا جو انجام ہو سکتا ہے وہ آپ سمجھ سکتے ہیں اور وہ عملاً سب کے سامنے موجود ہے۔ ہمیں اس کا کوئی افسوس نہیں کہ ہم اس طرح کے ہتھکنڈے اختیار کر کے ان انتخابات میں کامیابی حاصل نہ کی۔ ہم صرف صحیح طریقے سے اپنی کوشش کرتے چلے جائیں گے۔ اور اس وقت تک یہ کوشش کرتے رہیں گے کہ جب تک کہ ہم اپنی قوم کے ذہن اور مزاج کو نہ بدل دیں۔

سوال :۔ اسی انتخاب کے بارے میں ایک سوال اور۔ غیر منصفانہ انتخاب ہونے کا ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ حکومت انتخابات کو کسی خاص ڈھب پر لے جانا چاہتی ہے اور ایک شکل وہ ہے جو آپ نے بیان فرمائی کہ انتخاب جیتنے کے لئے غلط طریقے اختیار کئے جائیں جہاں تک ہمارا خیال ہے کہ اس وقت کی حکومت ان انتخابات کو کسی خاص ڈھب پر نہیں لے جانا چاہتی تھی اس لئے ان کو غیر منصفانہ کہنا مشکل ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے۔؟

جواب :۔ ہم یہ چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے ہم نے تجاویز بھی پیش کی تھیں کہ انتخابات کو غیر جانبدارانہ اور منصفانہ و آزادانہ بنانے کے لئے انتخابات کا ایک

قانون بنایا جائے جس میں انتخاب جیتنے کے مختلف ناروا طریقوں کو ممنوع قرار دیا جائے اور اس میں اس چیز کا اہتمام رکھا جائے کہ اگر کوئی فرد ایسے ناروا طریقے اختیار کرے تو اس پر الیکشن پٹیشن کی جا سکے ۔ اسی طرح قانون میں اس امر کی رعایت بھی ملحوظ رکھی جائے کہ اگر کسی پارٹی کے امیدوار دوسری پارٹی یا اس کے لیڈروں پر جھوٹے الزامات لگا کر ان کو بدنام کرنے کی کوشش کریں تو ان الزامات کے خلاف واقعہ ثابت ہوتے یا ان کا ثبوت مہیا نہ ہو سکنے کی صورت میں اس طرح انتخاب جیتنے والوں کا انتخاب کالعدم قرار دیا جا سکے ۔ علاوہ ازیں جھوٹا پروپیگنڈا کرنے کو بھی انتخابی قانون کے تحت قابل گرفت بنایا جائے تاکہ رائے عامہ کو گمراہ نہ کیا جا سکے ۔ اسی طرح کے بعض اور اقدامات بھی ہم نے تجویز کئے تھے جو منصفانہ انتخابات کی ضمانت بن سکتے تھے لیکن ان میں سے کسی کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک بھر میں پوری انتخابی مہم ایک نہایت غلط اور ناپسندیدہ فضا میں چلتی رہی اور بداخلاقی، بدعنوانی اور غنڈہ گردی کو پورا عروج نصیب ہوا ۔ ہمارے خلاف دن رات جھوٹا پروپیگنڈہ کیا گیا اور ہر سیت اور او چھا ہتھیار لوگوں کو ہم سے بدظن کرنے کے لئے استعمال کر ڈالا گیا لیکن کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو اس بدعنوانی کے سدباب کی دیانتدارانہ کوشش کرتی ۔ ہر چیز کھلی چھوڑ دی گئی ۔ اس فضاء میں یہ توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ لوگ موزوں اور مخلص نمائندوں کا انتخاب بے لاگ طریقے سے کر سکیں گے ۔ اسی بناء پر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ انتخابات بھی کسی طرح صحیح اور FAIR انتخابات کی تعریف میں نہیں آتے ۔ ہمارے نزدیک یہ بات غلط ہے کہ کوئی برسراقتدار گروہ طاقت کے ذریعے سے انتخابات جیتے، یہ بھی غلط ہے کہ کوئی فرد روپے کے زور سے انتخاب میں کامیابی حاصل کرے اور یہ بھی غلط ہے کہ کوئی شخص عوام کو دھوکہ دے کر انتخابات کا نتیجہ اپنے حق میں برآمد کرے ۔

سوال :۔ ایک چند سوالات اس موضوع سے ہٹ کر مولانا، آپ نے پاکستان کی حد تک تو اپنی تحریک۔ تحریک اسلامی کے بارے میں بڑی وضاحت سے معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اسلامی تحریک جغرافیائی حدود کے اندر پابند نہیں ہو سکتی اس لئے اس کے کچھ عالمی اثرات بھی رونما ہوئے ہوں گے یا آپ نے بطور خاص اس رُخ پر کام کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ کیا آپ پاکستان سے باہر اپنی تحریک کے اثرات پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔ ؟

جواب :۔ دیکھئے دنیا کے حالات ایسے ہیں کہ مسلمان کسی تحریک کو بین الاقوامی پیمانے پر نہیں چلا سکتے۔ دوسری قومیں عالمی سطح پر اپنی تنظیمیں اور ادارے (INSTITUTIONS) قائم کر سکتی ہیں کیونکہ ان کے پیچھے بعض عالمی طاقتیں کام کرتی ہیں۔ لیکن اسلام کے لئے کام کرنے والوں کے لئے یہ ممکن نہیں۔ غیر مسلم ممالک کا معاملہ پھر بھی مختلف ہے۔ خود مسلمان ممالک بھی اس بات کو برداشت نہیں کرتے کہ ان کے اندر کوئی بین الاقوامی تنظیم قائم ہو۔ اس لئے ہم نے جماعت اسلامی کو بحیثیت جماعت اسلامی پاکستان رکھا ہے اور کسی دوسرے ملک میں اس کی شاخ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ ہمارا لٹریچر وسیع پیمانے پر دنیا کے مختلف حصوں میں پہنچ رہا ہے۔ اب تک بہت سی غیر ملکی زبانوں میں ہماری متعدد کتابوں کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح ہمارے افکار دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ ہمارے لٹریچر میں یہ دعوت موجود ہوتی ہے کہ جو لوگ ہمارے خیالات سے متفق ہوں وہ اپنے طور پر اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے اپنی کوششوں کو بروئے کار لائیں۔ لیکن ہم کسی جگہ اپنی جماعت کی شاخ قائم کرنے کی دعوت نہیں دیتے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض ممالک میں "جماعت اسلامی" کے نام سے بالکل جداگانہ تنظیمیں وجود میں آ چکی ہیں۔ جن کا نام تو جماعت اسلامی ہی ہے۔ لیکن ان کا تنظیمی قسم کا تعلق ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ مثلاً پاکستان بنا تو جماعت اسلامی کے

جو ارکان ہندوستان میں رہ گئے۔ انہوں نے جماعت اسلامی ہی کے نام سے اپنی الگ تنظیم قائم کر لی۔ اسی طرح سیلون میں جماعت اسلامی کی دعوت سے متاثرہ لوگوں نے اپنی جماعت بنائی اور اس کا نام جماعت اسلامی رکھ لیا۔ نیپال میں ایک تنظیم جماعت اسلامی کے نام سے قائم ہو چکی ہے۔ لبنان میں ایک جماعت کا نام الجماعۃ الاسلامیۃ ہے۔ ان سب جماعتوں کا ہمارے ساتھ کوئی تنظیمی تعلق تو نہیں ہے۔ البتہ وہ ہمارے لٹریچر سے استفادہ کرتی ہیں بعض دوسرے مقامات پر مختلف گروہ دعوت اسلامی کا کام کر رہے ہیں اور وہ بھی ہمارے لٹریچر سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ الاخوان المسلمون بھی ہمارے لٹریچر سے استفادہ کرتے رہے ہیں اور خود اخوان کے لٹریچر سے دنیا کے مختلف ممالک میں دعوت اسلامی کا کام کرنے والے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

سوال :۔ مولانا، آپ کے نزدیک اسلامی دنیا میں اسلام کا مستقبل کیا ہے ؟

جواب :۔ اسلام کا مستقبل تو ہمیشہ اچھا ہی رہا ہے اور وہ کبھی خراب نہیں ہو سکتا البتہ مسلمانوں کے مستقبل کا سوال اس سے مختلف ہے مسلمانوں کا مستقبل تو صرف اور صرف اسلام کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر یہ سیدھے سچے اور پکے مسلمان بنیں تو ان کا مستقبل بہت اچھا ہے، لیکن اگر یہ مسلمان بھی رہیں اور کام نا مسلمانوں کے سے کریں تو ان کو خدا کی طرف سے سزا ضرور ملتی ہے اور وہ مل رہی ہے۔

سوال :۔ پاکستان سے باہر اسلامی ممالک میں سے کونسا ملک ایسا ہے۔ جہاں آپ سمجھتے ہیں کہ وہاں تحریک اسلامی کے اثرات زیادہ قوی پائے جاتے ہیں، اور وہاں اسلامی نظام کے قیام کے امکانات زیادہ ہیں ؟

جواب :۔ اس کی وضاحت کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا!

سوال :۔ مولانا، آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہونے سے پہلے آپ کی تصانیف الجہاد

فی اسلام، پردہ، رسالہ دینیات اور بعض دوسری کتابوں کی وجہ سے آپ کی شخصیت علمی لحاظ سے اچھی طرح متعارف ہو چکی تھی۔ بعد کے دور میں جب آپ کی عملی سیاسی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا تو اس زمانے میں بھی آپ نے اپنی بہت سی دوسری تصانیف کے علاوہ اپنی تفسیر قرآن "تفہیم القرآن" کی تکمیل فرمائی۔ کیا آپ اس پر روشنی ڈالیں گے کہ ایک طویل سیاسی جدوجہد کے ساتھ آپ نے تفہیم القرآن کی تکمیل کے لئے کس طرح وقت نکالا اور اس دوران کیا مراحل درپیش رہے؟

جواب:۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میں نے یہ کام کس طرح کیا تو خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ کام کیسے کر گیا۔ بس اسے اللہ تعالیٰ کا فضل ہی سمجھنا چاہیئے کہ اس نے مجھے اتنی ہمت اور توفیق بخشی۔ تفہیم القرآن لکھنے کا کام میں نے جماعت اسلامی کی تشکیل کے چند ماہ بعد ہی شروع کر دیا تھا۔ اور یہ زمانہ وہ تھا جب میری زندگی کا سب سے طوفانی دور شروع ہوا۔ یعنی ایک طرف مجھے علمی کام کرنا پڑ رہا تھا۔ اور دوسری جماعت کی تنظیم و تربیت کا مسئلہ درپیش تھا۔ جماعت کی تنظیم و توسیع کے لئے مجھے دورے بھی کرنے پڑتے تھے اور کارکنوں کی تربیت کے طویل و محنت طلب پروگرام بھی نبھانے پڑتے تھے۔ تحریک کے تعارف کے لئے اور اس ضمن میں پیش آمدہ سوالات کے جوابات بھی خطوط کی شکل میں لکھنے پڑتے تھے۔ بلکہ ابتداء میں تو ایک وقت ایسا تھا کہ حساب کتاب جیسے کام بھی مجھے خود ہی انجام دینے پڑتے تھے اور ان ساری مصروفیات کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری تھا۔ جو تحریک ہم لے کر اٹھ رہے تھے وہ اس بات کی متقاضی تھی کہ اس کے پیچھے ایسے تشفی بخش لٹریچر کی طاقت بھی موجود ہو جو اس دور کے ذہنوں کو اسلام کی حقانیت اور احیائے اسلامی کی ضرورت پر مطمئن کر سکے بلکہ ان کے اندر اس کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دینے کا جذبہ اور عزم و حوصلہ بھی پیدا کر سکے۔ متعدد کتابیں میں نے اس عالم میں لکھیں کہ رات کو عشاء کی نماز کے بعد لکھنے کے لئے بیٹھتا تھا

اور صبح کی اذان کے ساتھ اٹھتا تھا۔ پوری پوری رات مطالعہ وتحریر میں گزر جاتی بس ایک وقت تھا۔ جب جسم میں طاقت تھی اور میں یہ سارے کام کر لے گیا، میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسے کر لے گیا، لیکن اب میری صحت کا جو حال ہے وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ میں نے اپنے جسم سے کتنا کام لیا ہے۔ اب میرا جوڑ جوڑ اور عضو عضو مجھ سے اس کا حساب پوچھتا ہے کہ تم نے ہم سے اتنا سخت کام کیوں لیا۔

سوال :۔ مولانا کبھی کیا اس چیز کا حساب لگایا گیا ہے کہ آپ نے کتنا لکھا ہے اور روزانہ کا اوسط کیا رہا ہے ؟

جواب :۔ کوئی اندازہ نہیں۔ میں بس لکھتا گیا ہوں اور حساب لگا کر نہیں دیکھا کہ کتنا لکھا ہے۔

سوال :۔ ویسے تو آپ کی تصانیف کا تعلق اصولی طور پر علوم دینی کی تبلیغ و توضیح سے ہے، لیکن کیا اس موضوع سے ہٹ کر بھی آپ نے کبھی کچھ لکھا ہے۔ ؟

جواب :۔ میں نے اس موضوع سے ہٹ کر کبھی نہیں لکھا، اور نہ ہر طرح کے موضوعات پر لکھنا میرے پیش نظر تھا۔

سوال :۔ ویسے تو علوم دینیہ پر لکھنے والوں کے لئے سب سے بڑا اطمینان یہی ہو سکتا ہے کہ ان کا کام خدا کے ہاں مقبول ہو لیکن ہمارے ہاں بعض ایسے مصنف بھی ہیں جو یہ گمان بھی رکھتے ہیں کہ انہوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں جو محنت کی وہ ان کی توقع کے مطابق اہمیت و مقبولیت حاصل نہیں کر سکی۔ اس پہلو سے آپ کا ذاتی تاثر کیا ہے ؟

جواب :۔ میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ میری کتابوں کو جس طرح مقبول ہونا چاہئیے تھا وہ مقبول ہوئی ہیں۔ ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی !

سوال :۔ ملک کے باہر آپ کی کونسی تصانیف زیادہ شوق سے دیکھی گئی ہیں۔ ؟

جواب :۔ ملک کے باہر ان کتابوں کی پذیرائی اور قبولیت کا زیادہ تر انحصار

اس بات پر تھا کہ ان کے تراجم باہر کی زبانوں میں کس حد تک ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ تراجم عربی زبان میں ہوئے ہیں۔ اس کے بعد فارسی، ترکی اور انگریزی زبان میں ہوئے ہیں بعض دوسری زبانوں میں ایک ایک دو دو کتابوں کے تراجم ہوئے ہیں مثلاً فرانسیسی، جرمنی، اطالوی اور جاپانی وغیرہ میں۔ عربی تراجم سے ترکی اور فارسی میں اور انگریزی تراجم سے بعض یورپی زبانوں اور جاپانی وغیرہ میں ترجمے کئے گئے ہیں۔ سب سے زیادہ زبانوں میں اور سب سے زیادہ تعداد میں چھپنے والی کتاب رسالہ" دینیات" کہی جاسکتی ہے۔

سوال :- ایک تاثر یہ ہے کہ آپ نے اسلامی نظریۂ حیات کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے دوسرے نظریات پر جو تنقید کی ہے اس میں بالخصوص سوشلزم کے ردّ میں بہت کچھ لکھا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر اس نظریے کے مخالفین کو اپنے مؤقف کے حق میں دلائل جمع کرنے ہوں تو وہ آپ کی تحریروں سے رابطہ کرتے ہیں۔ اسی سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بعض لوگ آپ پر الزام رکھتے ہیں کہ آپ سرمایہ داری کے حامی ہیں اور جماعت اسلامی نے انتخابات میں یا عام ملکی سیاست میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو سہارا دیا ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہنا پسند فرمائیں گے۔ ؟

جواب :- اوّل تو یہ کہنا غلط ہے کہ میں نے غیر اسلامی نظریات اور نظاموں پر تنقید کرتے ہوئے صرف سوشلزم کو ردّ کیا ہے، اتنی ہی سخت تنقید میں نے سرمایہ داری پر کی ہے۔ اگر کوئی شخص دیانت داری سے میرے صحیح مؤقف کو جاننا چاہے تو وہ میری کتابوں سے اس کو بآسانی معلوم کر سکتا ہے۔ سردست اس ضمن میں میں صرف اپنی کتاب "سود" کا حوالہ دینا کافی سمجھتا ہوں۔ جہاں تک عام ملکی سیاست یا انتخابات کا تعلق ہے تو میرا سوال یہ ہے کہ اگر ملک کے جاگیردار، زمیندار اور دوسرے سرمایہ دار مجھ سے خوش تھے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ انتخابات میں انہوں نے میرا ساتھ نہیں دیا

اس کے برعکس انہوں نے تو ساتھ ان لوگوں کا دیا جو سوشلزم کی باتیں کر رہے تھے یا تو وہ بیوقوف تھے کہ انہوں نے اپنے "دشمنوں" کا ساتھ دینا پسند کیا۔ یا اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ اس بات کو خوب جانتے تھے کہ اگر اقتدار جماعت اسلامی کے ہاتھ میں آیا تو ان کی یہ زمینداریاں اور جاگیرداریاں اور یہ بڑی بڑی سرمایہ داریاں سب ختم ہو جائیں گی۔ ایک بار میں نے اپنی تقریر میں ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب تمہاری سرمایہ داری زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکیں گی۔ اب تمہارے سامنے دو راستے ہیں، ایک راستہ اسلام کا ہے اور دوسرا سوشلزم کا۔ ایک طرف ڈاکٹر کا نشتر ہے اور دوسری طرف ڈاکو کا خنجر۔ ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو چنانچہ انہوں نے یہ خیال کر کے ڈاکو کے خنجر سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے، ڈاکو کے ساتھ مل جاؤ۔ وہ اپنا خنجر تمہارے ہی حوالے کر دے گا۔ چنانچہ وہ گئے اور انہوں نے بڑھ کر ان لوگوں کا پرچم تھام لیا جو سوشلزم کا نعرہ بلند کر کے عوام الناس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا گر استعمال کر رہے تھے ـــــــ ہمارا ساتھ کس سرمایہ دار یا جاگیردار نے دیا ہے۔؟

سوال :۔ مولانا، ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ آپ نے اپنی زندگی میں بڑی محنت اور ریاضت سے کام کیا ہے۔ یہاں تک کہ صحت پر اس کے شدید اثرات پائے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آج کل اپنی صحت کے موجودہ عالم میں آپ اپنے معاملات اور لکھنے پڑھنے کے کاموں کے ساتھ خود کو کیسے ADJUST کر رہے ہیں۔؟

جواب :۔ اصل میں اللہ تعالیٰ ہی نے ADJUST کر دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے کوئی ایسی بیماری نہیں دی ہے جس میں میں اس کے دین کا کام نہ کر سکوں بس ایسی بیماریاں دی ہیں جو صرف میری ذات کو تکلیف دینے والی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان سے میرے گناہ ہی معاف ہوں گے۔ مثلاً اب میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام

کرتا ہوں اور مجھے کوئی تکلیف یا نقصان لاحق نہیں ہوتی لیکن کھڑا ہوں یا چلوں تو قدم قدم پر تکلیف محسوس کرتا ہوں۔ ڈیڑھ منٹ سے زیادہ میں کھڑا نہیں رہ سکتا اور زیادہ دور تک چل نہیں سکتا کیونکہ کسی لمحے بھی سہارے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

سوال :- مولانا، آج کل آپ کیا تصنیف فرما رہے ہیں ؟

جواب :- آج کل میں سیرت پاک پر کام کر رہا ہوں۔

سوال :- یہ کام آپ نے تفہیم القرآن کی تکمیل کے بعد شروع کیا ہے ؟

جواب :- جی ہاں، تفہیم القرآن کی تکمیل بھی بڑے غیر یقینی حالات میں ہوئی اس کا آخری حصہ میں نے دل کا حملہ ہونے کے بعد صحت بحال ہوتے پر لکھا۔ بعض اوقات تو یوں لگتا تھا کہ شاید میں اسے مکمل نہ کر سکوں گا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس کی تکمیل کی طاقت بخش دی۔ اب اس کے بعد سیرت پاک پر کام کر رہا ہوں۔ بہت شروع سے میرا یہ احساس رہا ہے کہ تفسیر قرآن کے بعد دوسری چیز لازماً سیرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جس کی اہمیت ہے اور اسے لکھنا چاہیئے کیونکہ اس کا قرآن مجید کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہ لکھ رہا ہوں۔ چنانچہ توقع ہے کہ اگر لوگ اس کو تفہیم القرآن کے ساتھ ملا کر پڑھیں گے تو ان شاء اللہ اس سے دین اور دعوت اسلامی کی فہم میں مزید مدد ملے گی۔ بلکہ سیرت و کردار کی تعمیر کے لئے بہت مفید ہوگی۔

سوال :- یہ کام کس حد تک ہو چکا ہے ؟

جواب :- مکی دور مکمل کر چکا ہوں اور آج کل مدنی دور کے لئے مواد فراہم کر رہا ہوں۔

سوال :- اس نشست میں آج ہماری گفتگو میں تحریک پاکستان۔ قیام پاکستان کے بعد کے حالات اور جماعت اسلامی کی تحریک اور جدوجہد کے ضمن میں خاصی معلومات ہمارے

سامنے آئی ہیں اگر ان سب چیزوں کی روشنی میں سوال کیا جائے کہ اگر جماعت اسلامی پاکستان میں سرگرم عمل نہ ہوتی تو کیا حالات ہوتے تو اس سلسلے میں آپ کیا ارشاد فرمائیں گے؟

جواب :- یہ سوال تو کچھ ایسا ہی ہے کہ آپ کسی سے پوچھیں کہ کھیتی تو پیدا نہ ہوا ہوتا تو کیا ہوتا ؟ ....

سوال :- پھر بھی، ایک تحریک یا جماعت کے بارے میں یہ سوال پیدا تو ہو سکتا ہے

جواب :- جس وقت جماعت اسلامی کی تشکیل کی گئی اور برصغیر کے حالات ایک خاص رخ پر آگے بڑھ رہے تھے۔ اُس وقت میرا یہ اندازہ تھا کہ تحریک پاکستان کے نتیجے میں اگر ملک تقسیم ہوا تو ایک علاقہ تو وہ ہوگا۔ جہاں پاکستان بنے گا اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے گی۔ وہاں اس علاقے کو ایک حقیقی اسلامی مملکت میں ڈھالنے کا مرحلہ درپیش ہوگا اور دوسرا علاقہ وہ ہوگا۔ جہاں ہندوؤں کی حکومت ہوگی اور اس میں مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد آباد ہوگی۔ ان کے اندر اسلام کے لئے کام کرنے والوں کی ایک منظم جماعت موجود ہونی چاہیئے۔ اسی چیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے جماعت اسلامی کی تشکیل کی گئی اور تھوڑے عرصے کے بعد ہی ہیں اندازہ ہو گیا کہ اگر اس وقت جماعت کی تشکیل و تنظیم نہ کرلی گئی ہوتی تو تقسیم ملک کے بعد نہ ہندوستان کے اندر وہ کام کیا جاسکتا جو بعد میں ہوا، اور نہ پاکستان کے اندر وہ کام ہو سکتا جو بعد میں کیا گیا۔ کوئی دوسری جماعت اس مقصد کے لئے منظم میدان میں موجود نہیں تھی میں سمجھتا ہوں کہ اگر قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی نے بروقت ایک منظم طریقے سے اسلامی دستور کا مطالبہ نہ اٹھایا ہوتا تو اس بات کا امکان تھا کہ پاکستان کو ایک سیکولر نیشنل ڈیموکریٹک سٹیٹ قرار دے دیا جاتا کیونکہ بعض ذمہ داران حکومت کی طرف سے مطالبہ دستور اسلامی کی مزاحمت جس انداز سے ہوئی وہ اس امر کی غمازی کرتی تھی کہ ان کے پیش نظر پاکستان کو غیر مذہبی (SECULAR) حکومت بنانا

تھا، اسی وجہ سے وہ اسلامی حکومت کے نام سے متوحش ہوتے تھے۔ چنانچہ اگر ایک دفعہ پاکستان کی کوئی سیکولر دستوری بنیاد طے کر دی جاتی تو پھر اس کو بدلوانا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہو جاتا۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جماعت اسلامی نے اپنی جدوجہد سے اس نوزائیدہ مملکت کو غلط دستوری بنیاد پر تعمیر ہونے سے روکا بلکہ اس کو مثبت طور پر اسلامی ریاست بنانے کے حق میں رائے عام کو منظم کیا اور بالآخر قرارداد مقاصد کی منظوری کی شکل میں اس کا اسلامی تشخص متعین ہو گیا بصورت دیگر یہ خدشہ تھا کہ وہ مقصد ہی فراموش کر دیا جاتا۔ جس کے لئے پاکستان کا وجود عمل میں آیا تھا۔

سوال:۔ مولانا، آپ اپنی کمزور صحت کی بنا، پر جماعت اسلامی کی قیادت سے دستبردار ہو چکے ہیں اور اس اعتبار سے عملی سیاست سے بھی الگ ہو چکے ہیں، اب اس کے بعد جماعت کی امارت اور قیادت دوسرے اصحاب کے ہاتھ میں ہے اور اس پر بھی خاصا وقت گزر چکا ہے، اس لحاظ سے اب آپ سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا آپ جماعت کی موجودہ کارکردگی سے مطمئن ہیں اور کام آپ کی توقعات کے مطابق ہو رہا ہے۔ ؟

جواب:۔ میں آپ کو پہلے یہ بتا چکا ہوں کہ جماعت اسلامی تقسیم ملک سے بہت پہلے قائم ہو چکی تھی۔ اس وقت میں ہی اس کا امیر تھا۔ میں نے ہی اس کو منظم کیا اور کارکنوں کی تربیت کی۔ تقسیم کے بعد جماعت اسلامی ہندوستان ستائیس اٹھائیس سال سے میرے بغیر ہی وہاں پر کام کر رہی ہے اور خدا کے فضل سے بہت اچھا کام کر رہی ہے۔ یہاں پاکستان میں بھی اب کئی سال سے جماعت دوسرے لوگوں کی قیادت میں کام کر رہی ہے اور میں اس کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ خدا کے فضل سے یہ ایک خود کار نظام ہے اور انشاء اللہ یہ نظام ٹھیک بنیادوں پر ہی قائم رہے گا۔

سوال:۔ قیام پاکستان کے ۲۴ سال بعد مشرقی پاکستان کا سقوط ہماری ملی تاریخ

کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ شاید سب سے بڑا۔ اس سے لوگوں میں سیاسی اور دینی اعتبار سے ایک مایوسانہ تاثر پایا جاتا ہے۔ اس المیہ کو روکنے کے لئے محب وطن عناصر نے جو بیش بہا قربانیاں دیں۔ بالخصوص جماعت اسلامی اور البدر کے نوجوانوں نے وہ بھی ہماری تاریخ کا ایک قیمتی باب ہیں لیکن ہمارے ہاں ایک ایسا عنصر بھی پایا جاتا ہے جو جماعت اسلامی اور دوسری دینی تنظیموں پر نظریاتی تشدد کا الزام رکھتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس نظریاتی تشدد نے بھی وہاں کے علیحدگی پسندوں کے لئے سازگار فضا فراہم کی ——— آپ کی کیا رائے ہے۔؟

جواب :۔ ہماری طرف سے کوئی نظریاتی تشدد نہیں ہوا۔ یہ قطعاً ایک بے اصل بات ہے۔ اصل صورت یہ تھی کہ عوامی لیگ مسلسل وہاں غنڈہ گردی کررہی تھی اس نے پوری کوشش کی کہ اسلام کا نام لینے والوں کو دبا دیا جائے اور اس مقصد کے لئے اس نے ہر او چھا حربہ اختیار کیا۔ قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ ہمارے بے شمار کارکن ان کے تشدد کا شکار ہوئے۔ طالب علم رہنما عبدالمالک کو شہید کیا گیا۔ اس کے قاتل نشاندہی کے باوجود قانون کی گرفت سے محفوظ دندناتے پھرتے رہے اسی طرح اور بھی بہت سے افراد شہید کر ڈالے گئے اور ان سب کا جرم یہ تھا کہ وہاں اسلامی اقدار کو بلند دیکھنا چاہتے تھے ——— جماعت اسلامی وہاں جو کام کر رہی تھی وہ یہ تھا کہ اس نے تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام سے روشناس کرانے کے لئے بنگلہ زبان میں اسلامی لٹریچر تیار کیا کیونکہ بنگلہ زبان میں اس کی شدید کمی تھی۔ ہم نے تقریباً ۸۰ کتابیں شائع کیں۔ تب وہاں خدا کے فضل و کرم سے تعلیم یافتہ طبقے میں ایک خاصا گروہ ایسا تیار ہوگیا۔ جو اسلامی نظام کا حامی تھا اور پاکستان کو متحد دیکھنا چاہتا تھا اس طرح طلبہ کے اندر بھی اسلام کے پرستار نوجوانوں کی ایک اتنی بڑی جماعت تیار ہوگئی کہ طالب علموں کی دوسری بہت سی تنظیمیں مل کر بھی تعلیمی اداروں کے انتخابات

میں ان کو شکست نہ دے سکیں۔ اس کے بعد یعنی ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد جب وہاں ایک سیاسی طوفان آ ہی گیا تو جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں نے مشرقی پاکستان کو ہندوستان کی گود میں جانے سے بچانے کے لئے اپنی جانیں لڑا دیں۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں افراد جام شہادت نوش کر گئے۔ یہ ایک ایسی کھلی شہادت ہے جس کی کوئی انصاف پسند آدمی تردید نہیں کر سکتا۔ متحدہ پاکستان کو بچانے کی اس مجاہدانہ سرفروشی کو اگر کوئی شخص نظریاتی تشدد کا نام دیتا ہے تو یہ اس کے اپنے دماغ کی کجی ہے یا فریب کاری ہے، اصل حقیقت پر اس سے پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ پاکستان کے دفاع کے لئے جو کچھ ہم کر سکتے تھے۔ وہ ہم نے کیا اور ہم اس پر مطمئن ہیں کہ ہم نے اپنا فرض انجام دیا۔

سوال :۔ مولانا، ہم اس پر مایوسانہ تاثر کا ذکر کر رہے تھے۔ جو سقوط مشرقی پاکستان کے بعد یہاں پیدا ہوا، اس سلسلے میں بعض لوگ یہ بھی کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ یہاں بھی اسی قسم کے حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ جس قسم کے مشرقی پاکستان میں ہوئے تھے آپ کا کیا خیال ہے ؟

جواب :۔ ہو نہیں رہے ہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ پیدا کئے جا رہے ہیں

سوال :۔ دونوں صورتوں میں بات ایک ہی ہے !

جواب :۔ نہیں، دونوں صورتوں میں فرق ہے۔ اگر ایسے حالات پیدا ہو رہے ہوں تو ان کا علاج آسانی سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر پیدا کئے جا رہے ہوں اور پیدا کرنے والے وسائل اور اختیارات بھی رکھتے ہوں تو پھر علاج آسان نہیں رہتا۔ اگر کچھ لوگ ملک میں علیحدگی پسندی کے رجحانات کو ابھار رہے ہوں اور جو لوگ ان رجحانات کو دبانے کی کوشش کر رہے ہوں ان کو تشدد کا نشانہ بننا پڑے اور سرکاری مشینری اس کی مؤثر روک تھام کے لئے تیار نہ ہو، تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ

نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علیحدگی پسندی کے رجحانات کو ابھرنے اور تقویت پکڑنے کے پورے مواقع دیئے جارہے ہیں اور ایک طرح سے ان کی سرپرستی کی جارہی ہے۔ اس طرح پاکستان کی بنیادوں میں ایک آتش گیر مادہ داخل کیا جارہا ہے۔ جو معلوم نہیں بھڑک اٹھے۔

سوال :۔ مولانا، آپ ان لوگوں سے یقیناً واقف ہیں۔ جو یہاں حکومت بدلنے کے لئے "انقلاب بندوق کی نالی سے جنم لیتا ہے" جیسے نظریات رکھتے ہیں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہاں ابھی ہمارا مطلوبہ انقلاب آیا نہیں، اس کو لانا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سازگار فضا موجود ہے؟

جواب :۔ ہم اپنی حد تک کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے۔ جس سے فتنے کی آگ بھڑک اٹھے۔ لیکن اگر ایسی آگ بھڑکانے کی کوشش کی گئی تو ہم اس کو بجھانے کے لئے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ یہاں اس قسم کے حالات پیدا نہ ہوں۔ جیسے مشرقی پاکستان میں پیدا ہوئے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو ہم ان کا ہر طرح مقابلہ کریں گے اور اس سرزمین میں ہم نے دعوت اسلامی کے جو بیج ڈالے ہیں وہ جل نہیں جائیں گے۔ انشاء اللہ وہ ضرور بار آور ہوں گے آپ کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ جو شراب مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو پلائی تھی۔ وہ عارضی طور پر تو اس سے کام لے گئے لیکن متحدہ پاکستان سے علیحدگی کے بعد یکایک ! لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اس کے بعد بڑے بڑے بنگلہ دیشی جو بنگالی نیشنلزم کے علمبردار تھے وہ جماعت اسلامی کے لوگوں کے پاس آکر یہ کہتے ہیں کہ تم جو بات کہہ رہے تھے۔ وہ بالکل برحق تھی۔ یہ احساس اب روز بروز ان کے اندر تقویت پکڑ رہا ہے اور اللہ نے چاہا تو وہاں حالات بدلیں گے۔

سوال:- ایک زمانے میں آپ کے خلاف یہ پروپیگنڈا کیا جاتا رہا کہ آپ مجددیت یا مہدویت کا دعویٰ کرنے والے ہیں اور اس کے جواب میں آپ نے کہیں یہ لکھا تھا کہ میں اس قسم کے کسی دعوے سے بھی اپنا دامن پاک رکھتے ہوئے خدا کے ہاں حاضر ہو جاؤں گا۔ اور پھر دیکھوں گا کہ اس طرح کی بے سروپا الزام تراشیاں کرنے والے حضرات خدا کو کیا جواب دیتے ہیں پھر ایک موقع پہ آپ کے مخالفین کی طرف سے کچھ ایسا تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ جماعت اسلامی ایک فرقہ ہے یا فرقہ بن جائے گی۔ اس طرح کی باتیں شاید اس وجہ سے کی جاتی رہی ہیں کہ جماعت اسلامی کے قیام کے بعد سے آپ ہی مسلسل اس کے امیر چلے آتے ہیں۔ اب چند سالوں کا عرصہ چھوڑ کر جب کہ آپ امیر نہیں رہے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کیا ارشاد فرمائیں گے؟

جواب: جماعت اسلامی کو فرقہ مشہور کرنے یا اس پر یہ الزام چسپاں کرنے کی کوشش تو ہندوستان میں اس کے باوجود کی جاتی رہی ہے کہ میں وہاں کی جماعت کا امیر نہیں تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ بعض تنگ نظر مذہبی طبقوں کے خاص ہتھکنڈے ہوتے ہیں کسی فرد یا گروہ کو بدنام کرنے کے لئے مثلاً کسی کے اوپر یہ الزام چسپاں کر دیا جائے کہ وہ کوئی دعویٰ کرنے والا ہے یا کسی گروہ یا جماعت کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جائے کہ وہ ایک فرقہ بن رہی ہے۔ یہ کچھ اس طرح کے ہتھکنڈے ہیں جس طرح کمیونسٹ اپنے مخالفین کو بدنام کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کو امریکہ کا ایجنٹ کہہ دینا، کسی کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں وغیرہ کا ایجنٹ اور وظیفہ خوار کہہ دینا اور اس طرح کی بعض دوسری مخصوص پھبتیاں جو اپنے مخالفین کو عوام کی نظروں میں گرانے کے لئے کسی جاتی ہیں ایسے میں ہم بہت سے بے سروپا اتہام ہم پر بھی لگائے جاتے رہے ہیں اور ان کے مسکت جوابات ہماری طرف سے سامنے آجانے کے باوجود ان کو دہرایا جاتا رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی بعض حضرات نے یہ مشغلہ اپنا رکھا ہے اور یہاں بھی لیکن خدا کے فضل سے جو لوگ جماعت اسلامی کی دعوت اور طریقہ کار سے واقف

ہیں وہ ان ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ جب تک جماعت اسلامی کے کارکن اور متفقین عام مسلمانوں کے ساتھ مسجدوں میں نمازیں ادا کر رہے ہیں اس وقت تک کوئی معقول آدمی جماعت اسلامی پر الزام چسپاں نہیں کر سکتا کہ وہ ایک فرقہ بن رہی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی پر فرقہ بننے کا الزام وہ لوگ رکھتے ہیں جنہوں نے خود اپنی الگ الگ مسجدیں بنا رکھی ہیں اور اپنے مسلک کے خلاف مسلک رکھنے والوں سے اپنی نمازیں الگ کر لی ہیں۔ جب کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے لوگ عام مسجدوں میں سب کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

سوال:- مولانا آپ جمہوری طریقوں پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں اور آپ کے اس یقین میں تبدیلی کا کوئی امکان آپ کے طریق کار کو دیکھتے ہوئے نہیں سمجھا جاتا آپ کا کیا خیال ہے کہ جس رفتار سے تحریک اسلامی کا کام ہو رہا ہے اس کے پیش نظر اسلامی نظام کے قیام کا کب تک امکان ہو سکتا ہے؟

جواب:- ہو سکتا ہے اس کام میں دس سال لگیں۔ ہو سکتا ہے بیس سال لگیں اور ہو سکتا ہے پچاس سال لگیں۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ تحریک اسلامی فطری رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے اور اپنے وقت پر اس کے نتائج ظہور پذیر ہو کر رہیں گے۔ اگر ہم جلد بازی میں غیر فطری رفتار اختیار کرنے کی کوشش کریں گے۔ تو اس کے اثرات البتہ اچھے نہیں ہوں گے۔

سوال:- جمہوری طریق کار پر آپ کے پختہ یقین کو دیکھ کر آپ کے بعض مخالف یہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے آپ ایک بڑے عالم دین ہیں لیکن آپ کو سیاست نہیں آتی۔؟

جواب:- میں نے تو کبھی اس کا دعویٰ نہیں کیا۔

سوال:- دعوے کی بات اور ہے۔ لیکن کیا آپ کی سیاست ان لوگوں سے مختلف کوئی چیز ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ آپ کو سیاست نہیں آتی، یا ان کے نزدیک سیاست کسی

اور چیز کا نام ہے ۔؟

جواب :۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو سیاست داں ہونے کے مدعی ہیں وہ سیاست کو ذرا کم ہی جانتے ہیں ۔ مجھے معلوم ہے اصل سیاست داں کون ہوتے ہیں ۔ میں نے سیاست دانوں کے حالات بھی پڑھے ہیں اور ان کے کارنامے بھی، اور ان لوگوں کے کارنامے بھی میری نظر میں ہیں جو سیاست داں ہونے کے مدعی ہیں ۔ اس بناء پر میری رائے یہ ہے کہ فی الواقع وہ لوگ سیاست داں نہیں ۔ جو یہ دعویٰ رکھتے ہیں ۔ مجھے خود اپنے سیاست داں ہونے کا دعویٰ نہیں ہے ۔ میں تو در اصل خدا کے دین کو غالب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اس مقصد کے لئے حقیقی سیاست مطلوب ہے وہ میں جانتا ہوں ۔ اس کے سوا کوئی سیاست ہے تو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے ۔

سوال :۔ کیا یہ ایک فطری امر نہیں ہے کہ ایک انسان جس مقصد کے لئے کام کر رہا ہو وہ اس کے نتائج کو بھی دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے ۔؟

جواب :۔ خدا کے دین کا کام بڑا صبر چاہتا ہے ۔

سوال :۔ تو گویا آپ اپنے متفقین اور معتقدین کو اقتدار کی نہیں بلکہ صرف آخرت کے اجر کی توقع دلاتے ہیں ؟

جواب :۔ اصل چیز تو وہی ہے ۔ باقی رہی دنیا کی کامیابی، تو وہ بھی ہو سکتی ہے اور ایسا نہیں کہ وہ نہ ہو سکے ۔ لیکن بہرحال اس کی کچھ شرائط ہیں ۔ وہ شرائط جب پوری ہو جائیں گی، تو دنیا میں بھی انشاء اللہ کامیابی حاصل ہو جائے گی ۔ لیکن ایک سچے مسلمان کے سامنے دنیا کی کامیابی اصل چیز نہیں ہے ۔ اصل اور مقدم چیز تو آخرت کی کامیابی ہے اور ایک مسلمان کو اسی کے پیش نظر کام کرنا چاہیئے ۔

سوال :۔ مولانا، ہم آپ کی تصانیف کا ذکر اتنی دیر کرتے رہے ہیں ۔ لیکن آپ کا ایک مقام ایک بلند پایہ مقرر کی حیثیت سے بھی ہمارے سامنے ہے ۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں غالباً

۸ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو موچی دروازے میں آپ کی ایک تقریر کی رپورٹنگ کر رہا تھا۔ وہاں سے اخبار کے دفتر میں پہنچ کر میں اس خبر کو مرتب کر رہا تھا۔ اس میں آپ نے فرمایا تھا، کہ اگر ملکی حالات اسی رخ پر آگے بڑھتے رہے تو کوئی عجب نہیں فوج اقتدار پر قابض ہو جائے۔

جواب:۔ میں نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے یہ انقلاب آج رات ہو جائے۔

سوال:۔ جی ہاں ہم یہ تقریر لکھ رہے تھے اور اسی دوران میں یہ خبر آگئی کہ ملک کا اقتدار فوج نے سنبھال لیا ہے۔ آپ کی اس سیاسی بصیرت اور بلند مقررانہ مقام کو دیکھتے ہوئے بعض وقت یہ خیال آتا ہے کہ جماعت اسلامی میں اس پائے کے اور کوئی مقرر نہیں ابھر سکے۔ جبکہ آپ نے جماعت کی تربیت پر خاصی محنت صرف فرمائی ہے۔

جواب:۔ اللہ نے چاہا تو ایسے آدمی ضرور تیار ہوں گے اور اس وقت بھی خدا کے فضل سے جماعت کے اندر بہت سے اچھے مقرر موجود ہیں۔ میں نے جو کچھ کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے اندر ایسے مقررین تیار ہوں جو ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوئے بات کریں۔ ایک ایک لفظ یہ سمجھتے ہوئے زبان سے نکالیں کہ قیامت کے روز اس کی جوابدہی کرنی ہے۔ گالیاں اور غیر سنجیدہ باتیں ان کی زبان سے ادا نہیں ہوتی چاہئیں۔ ان کو دوسروں پر جھوٹے الزام نہیں رکھتے ہیں۔ لوگوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ نہیں بنانا ہے۔ عوام کو بیوقوف بنانے کی کوشش نہیں کرنی ہے بلکہ ان کے پیش نظر صرف یہ ہونا چاہئے کہ بالکل ایمانداری اور معقولیت کے ساتھ نہایت بچے تلے الفاظ میں اپنا موقف لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے، ان کو اپنی بات خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کرنی ہے۔ اوّل اوّل بعض حضرات کا یہ خیال تھا۔ کہ ہماری یہ روکھی پھیکی تقریریں لوگوں کو متاثر نہیں کر سکیں گی۔ کیونکہ وہ چٹخارے دار تقریریں سننے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن ہم نے یہ بات عملاً ثابت کی ہے کہ لوگ سنجیدہ اور پر مغز تقریریں بھی پورے انہماک سے سن سکتے ہیں اور وہ ہمارے

جلسوں میں اس طرح جم کر بیٹھتے ہیں کہ (PINDROP SILENCE) کی کیفیت ہوتی ہے۔ جب تک ہماری بات ختم نہیں ہوتی وہ اٹھ کر نہیں جاتے (MOBLEADERS) کی تقریروں میں تو وہ اکثر کھڑے رہتے ہیں۔ بلکہ چلتے پھرتے رہتے ہیں لیکن جس طرح کی ذمہ دارانہ اور سنجیدہ تقریریں ہمارے سٹیج سے ہوتی ہیں وہ بڑے انہماک اور دلچسپی سے سنتے ہیں۔ ہم اسی انداز خطابت کو دراصل اپنے مقصد کے لیے مفید سمجھتے ہیں اور اسی سے لوگوں کی ذہنی تربیت کا کام لیا جاسکتا ہے۔

سوال:۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ آپ کی تقریر کا انداز بڑا دھیما اور غیر ضروری تشبیب وفراز سے منزہ ہوتا ہے اور اس میں دلائل ایک خاص منطقی ترتیب سے سامنے آتے ہیں۔ تجربہ یہ ہے کہ اگر آپ کی کسی تقریر کو احتیاط کے ساتھ نوٹ کر کے مرتب کیا جائے تو وہ ایک مربوط مضمون کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کیا آپ اپنی تقریر سے پہلے اس کو خصوصی طور پہ تیار کرتے ہیں۔؟

جواب:۔ میں اپنی تقریر کے نکات اور مدارج بس اپنے ذہن میں مرتب کر لیتا ہوں۔ جب کوئی چیز میرے ذہن میں مرتب ہو جاتی ہے تو پھر چاہے اس کو کاغذ منتقل کرتا ہوں یا تقریر کی شکل میں پیش کرتا ہوں وہ اس ترتیب سے بیان کر دیتا ہوں۔ صرف پہلے سوچ کر اسے اپنے ذہن میں مرتب کرنا ہوتا ہے۔

سوال:۔ مولانا آپ کی تقریریں کافی حد تک غیر جذباتی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود نوجوان آپ سے بہت زیادہ متاثر ہیں جبکہ ان کے جذبات بہت شدید ہوتے ہیں اور وہ ٹھوس تقریریں سننے یا علمی تحریریں پڑھنے کے زیادہ عادی نہیں ہوتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب:۔ اچھا ہوتا کہ آپ یہ سوال انہی سے کرتے کہ وہ کیوں متاثر ہیں۔ شاید سودا کے بقول یہ بات ہو کہ

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے ہاں کا ہر طالب علم گہرے اسلامی جذبات لئے ہوئے شعور کی منزل میں داخل ہوتا ہے۔ بچپن ہی سے اسلام اس کے رگ وپے میں سرایت کئے ہوتا ہے۔ تعلیم کی اعلیٰ منازل میں جا کر، یعنی سکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر جب وہ ایسی چیزیں دیکھتا ہے۔ جو اسے دین سے برگشتہ اور منحرف کرتے والی ہوتی ہیں تو وہ آسانی سے ان سے متاثر نہیں ہو جاتا کیونکہ اس کا ضمیر اس کو اسلام سے دور جانے سے روکتا ہے۔ اس عالم میں اگر اس کو کوئی ایسا شخص مل جائے یا ایسے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع مل جائے۔ جو اسے معقول طریقے سے اسلام کی حقانیت سے آگاہ کر دے تو پھر وہ پورے اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ اسلام پر جم جاتا ہے اور ہر چیز کو رد کر دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جو اس کو اسلام سے پھیرنے والی ہو۔ میرے خیال میں یہی بنیادی سبب ہے نوجوانوں کے اسلام سے گہری وابستگی کا، یا آپ کے لفظوں میں مجھ سے متاثر ہونے کا۔ کیونکہ ایک غیر صحتمند ماحول اور غلط نظریات کے اثرات سے دامن بچا کر جب ایک نوجوان شعوری طور پر اسلام پر پختہ ایمان لے آتا ہے تو اس کا یہ ایمان ہی اسے ہمارے ساتھ وابستہ رکھتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم نے اس کی ایک قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔

سوال :۔ مولانا، یہ بات باعث تعجب ہے کہ ہمارے انحطاط پذیر معاشرے میں طالب علموں کے اندر ایسا پاکیزہ عنصر موجود ہے۔ جبکہ نوجوانوں کے بارے میں عام تاثر یہی پایا جاتا ہے کہ ان کے اطوار اچھے نہیں ہیں اور دین و اخلاق سے بیگانگی بڑھ رہی ہے اس پر سنجیدہ فکر حضرات بجا طور پر تشویش کا اظہار کرتے رہتے ہیں اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے۔؟

جواب :۔ ہمارے معاشرے میں نوجوانوں کی جس کیفیت کا ذکر آپ کر رہے ہیں۔ یہ اس سے دس گنی زیادہ ہوتی ۔ اگر اسلام کے حق میں منظم طریقے سے

کام کرنے کے لئے تحریک اسلامی میدان عمل میں موجود نہ ہوتی۔ پاکستان کے اندر غیر اسلامی رجحانات کو روکنے کے لئے جماعت اسلامی اوّل روز سے یہاں کام کر رہی ہے۔ طالب علموں کے اپنے دائرہ عمل میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان گزشتہ چھبیس ستائیس سال سے سرگرم کار ہے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں طلبہ کا ایک گروہ تو یہ ہے جس نے اپنی زندگیوں کو اسلامی طرز پر ڈھال لیا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے۔ جس کے خیالات کی اصلاح تو ہو چکی ہے۔ لیکن ابھی وہ ماڈرن تہذیب کے اثرات سے پوری طرح آزاد نہیں ہوا۔ تاہم توقع ہے کہ آہستہ آہستہ اس کے اندر بقیہ مطلوبہ تغیر بھی پیدا ہو جائے گا اور وہ پوری طرح اسلام کے رنگ میں رنگ جائے گا۔ اور ایک گروہ ایسے نوجوانوں کا ہے اور یہ امر اطمینان بخش ہے کہ یہ ایک قلیل عنصر ہے، جو واقعی بے دین ہیں اور ان کو بے دینی کی طرف لے جانے والی چیز وہ بداخلاقی ہے۔ جس میں مختلف عناصر ان کو مبتلا کرنے کا کام کر رہے ہیں۔ لیکن خدا کا فضل ہے کہ ایسے لوگ اقلیت میں ہیں اور اسلام سے محبت رکھنے والے اور اسلام پر کاربند نوجوانوں کی اکثریت ہے اور انشاء اللہ وہ اقلیت بھی آہستہ آہستہ اس اکثریت میں مدغم ہوتی چلی جائے گی۔

سوال:۔ مولانا ہمارا خیال ہے کہ ہم نے آپ کا دو گھنٹے سے زیادہ وقت بلکہ ڈھائی گھنٹے کے لگ بھگ وقت لے لیا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کی صحت کمزور ہے اور آپ نے اس دوران دوا بھی استعمال فرمائی ہے۔ غالباً یہ آپ کے دوا کے استعمال اور آرام کا وقت تھا اس پر ہم دلی معذرت کے خواستگار ہیں اور آپ کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں کہ آپ نے ہمیں اتنا وافر وقت عنایت فرمایا۔ توقع ہے کہ آپ کے یہ خیالات سننے والوں کے لئے بہت دلچسپی اور افادے کا موجب ہوں گے اور وہ ان سے بہت کچھ حاصل کر سکیں گے۔ آپ کے معمولات اور آرام میں جو خلل اس طویل گفتگو

سے واقع ہوا ہے۔ اس پر ہم ایک دفعہ پھر معذرت خواہ ہیں۔ اب اجازت عطا فرمائیے

جواب :۔ میں آپ حضرات کا بہت شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے خیالات
اس شرح وبسط کے ساتھ پیش کرنے کا موقع دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ایک خدمت
ہے۔ جو مجھے انجام دینی چاہیئے تھی

اسلام اور عالم اسلام کے مسائل

سوال

"مولانا" اسلام کے پورے نظامِ حیات کو اس کے اصلی خط و خال اور وسیع مفہوم کے ساتھ سمجھنے میں قرآن و حدیث کے علاوہ آپ کو اور کون سی کتابوں نے مدد دی؟"

جواب :-

"ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی کتابوں نے میرے ذہن کو پختہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔"

سوال :-

"اسلام کے موضوعات اور مسائل پر لکھنے کا خیال آپ کے ذہن میں کیونکر آیا؟

جواب :-

" اسلام کے موضوعات اور مسائل پر لکھنے کا خیال دو باتوں کی بنا پر پیدا ہوا۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں شدھی تحریک کا بانی سوامی شردھانند ایک مسلمان کے ہاتھ سے قتل ہوا جس پر اسلام کے دشمنوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور انہوں نے مسلمانوں اور اسلامی تعلیمات کے خلاف الزامات کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ جذبۂ قومیت نے مجھے ان بہتان تراشیوں اور دشنام طرازیوں کے خلاف لکھنے پر اکسایا۔ انہی دنوں مولانا محمد علی جوہر جامع مسجد دہلی میں جمعے کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ میں باقاعدگی کے ساتھ ہر جمعے ان کی تقریر سننے کے لئے آتا تھا۔ ایک

جمعے کے خطبے میں مولانا نے فرمایا کہ "اس وقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ کوئی خدا کا بندہ اسلام کے صحیح تصورِ جہاد پر ایک مبسوط کتاب لکھے جس میں جہاد کے خلاف اٹھائے ہوئے تمام اعتراضات اور الزامات کے مدلل جوابات دیئے گئے ہوں" میں نے دورانِ تقریر ہی میں یہ فیصلہ کرلیا کہ میں جہاد کے موضوع پر کتاب لکھوں گا۔ اس طرح اس کام کا آغاز جذبۂ قومیت سے ہوا لیکن آگے چل کر یہ جذبہ اسلام کی وسعتوں میں جذب ہو کر رہ گیا۔

سوال :۔

"مولانا، آپ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت کے بارے میں کیا تاثر رکھتے ہیں؟ ایک طبقے کی یہ رائے ہے کہ وہ سادگی سے گاندھی جی کا فریب کھاتے رہے"۔

جواب :۔

"ایک شخص کے مرنے کے بعد آپ جو چاہیں اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں، لیکن در حقیقت مولانا محمد علی جوہر مسلمانوں کے لئے سب سے گہرا درد رکھتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد سے پھر سچا دینی جذبہ رکھنے والا لیڈر پیدا نہیں ہوا۔ انہوں نے غلطیاں کی ہوں گی، لیکن میں نے بہت ہی کم لوگ ایسے دیکھے ہیں، جو اسلام کے لئے اتنا گہرا اخلاص رکھتے ہیں۔ یہ ان جیسے لوگوں ہی کے کردار کا اثر تھا کہ کسی کے لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اسلام کی تعلیمات اور اس کی شعائر کا احترام اور ان پر عمل پیرا ہوئے بغیر وہ سیاسی لیڈر بن سکے۔

سوال :۔

"مولانا، دین اور مذہب میں کیا فرق ہے؟

جواب :۔

"شریعت میں مذہب کا لفظ مکتبِ خیال (SCHOOL OF THOUGHT) کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے لیکن دین سے مراد پورا ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جو خدا اور اس کے رسول ؐ نے ہمیں دیا ہے"۔

سوال:۔

"زندگی مسلسل متحرک ہے، یہ بڑھتی، گھٹتی اور پھیلتی رہتی ہے اس کے خول میں بے پناہ لچک ہے اگر اسلام ایک ہی نظامِ زندگی ہے تو کیا اس میں بھی لچک موجود ہے؟

جواب:۔

"اس میں وہ فطری لچک موجود ہے جس کا تقاضا زندگی کرتی ہے۔ اجتہاد اسی لچک کا دوسرا نام ہے۔ اجتہاد کے ذریعے سے اسلام زندگی کے ہر گلِ تازہ کی آبیاری کرتا ہے اور ہر نئے ابھرنے گوشے کو روشنی فراہم کرتا ہے۔ اسی بناء پر اسلام میں اجتہاد کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور ہر زمانے میں اس کی ضرورت رہی ہے یہ اور بات ہے کہ اجتہاد کو متضاد مقاصد کے لئے استعمال کیا جانے لگا ہے"۔

سوال۔

"مولانا، وہ متضاد مقاصد کیا ہیں؟"

جواب:۔

"اجتہاد کا ایک مقصد تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو نئے حالات پیش آئیں ان پر اسلام کے اصول اور احکام منطبق کئے جائیں دوسرا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے جو کچھ مخصوص نظریات اور خواہشات ذہن میں پہلے سے موجود ہوں، ان کے مطابق اسلام کو ڈھالا جائے پہلی قسم کا اجتہاد صحیح معنوں میں اجتہاد ہے اور ہر دور میں علماء اس اجتہاد کے قائل رہے ہیں، لیکن موخر الذکر اجتہاد نہ تو اسلامی اصطلاح کے مطابق اجتہاد ہے اور نہ کوئی مسلمان اس اجتہاد کا قائل ہے، غضب یہ ہے کہ اجتہاد کا نازک کام آج کل وہ لوگ اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں جو اس کام کے سرے سے اہل ہی نہیں۔ اجتہاد کے لئے خاص قسم کی صلاحیتوں اور اہلیتوں کی ضرورت ہے"۔

سوال:۔

"مولانا، اجتہاد کے لئے کس نوعیت کی صلاحیتیں درکار ہیں آخر ہر شخص اجتہاد کیوں نہیں کر سکتا؟"

جواب:۔

"اس کام کے لئے بہت سی صلاحیتیں درکار ہیں لیکن کچھ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد کے لئے مغربی قوانین، معاشیات، اقتصادیات کا علم کافی ہے اور انگریزی ترجموں سے قرآن پڑھ کر اور حدیث و فقہ کو بالائے طاق رکھ کر بڑی کامیابی سے اجتہاد کیا جاسکتا ہے اس طرح کا اجتہاد کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جس کے دل میں خدا کا کچھ خوف ہو یا جو اخلاص کے ساتھ مسلمان رہنے کا خواہش مند ہو۔ صحیح معنوں میں اجتہاد کا اہل وہ شخص ہو سکتا ہے جو عربی میں مہارت رکھتا ہو، زبان کی نزاکتوں کو سمجھ سکتا ہو، قرآن کو اس کی اصل زبان میں نہ صرف سمجھنے کے قابل ہو بلکہ اپنی عمر کا غالب حصہ اس نے فہم قرآن کی نزاکتوں میں صرف کیا ہو حدیث پر وسیع نگاہ رکھتا ہو، فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے اصولوں اور مختلف ادوار کے فقہا کے کام سے واقف ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وقت کے مسائل زندگی پر بھی نگاہ رکھتا ہو"۔

سوال:۔

"مولانا، اگر ایک گروہ دوسرے قسم کا اجتہاد کرنے لگے اور اسے ملک میں نافذ کرنے پر بھی مصر ہو، تو پھر قوم کو کیا کرنا چاہیئے۔

جواب:۔

"پوری قوت سے مزاحمت کرنی چاہیئے کیونکہ اس گروہ کا طرز عمل لازمی طور پر ملک کو انتشار اور تباہی کے گرداب میں پھینک دے گا یہ مختصر سا مغرب زدہ گروہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آگیا ہے ایک نیا دین قوم پر زبردستی ٹھونستا رہے گا اور قوم اس کو دفع کرنے

کے لیے زور لگاتی رہے گی اور اس کشاکش میں ترقی کے راستے پر ہمارا قدم ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکے گا۔ ترکی اس کا تجربہ کر چکا ہے اور اس تجربے کے برے نتائج وہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہیں۔ اب پاکستان بھی آنکھیں بند کر کے اسی راستے پر چلنے لگا ہے انجام پہلے ہی سے صاف نظر آ رہا ہے"

سوال۔

"کیا ان حالات میں علماء پر بھاری ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟"

جواب:۔

"مجھے آپ کے جذبات کی شدت کا احساس ہے مگر یہ تو سوچیئے کہ علماء اس سوسائٹی ہی کے تو فرد ہیں جس کی اخلاقی حس قریباً مر چکی ہے ایسے معاشرے میں حق گو، جرأت مند، باضمیر اور ایثار کیش علماء کہاں سے آئیں۔ اگرچہ علماء کا طبقہ دوسرے طبقوں کی نسبت اب بھی کئی اعتبار سے بلند ہے لیکن دین کے لئے جان کی بازی لگانے کا جذبہ بڑی حد تک سرد پڑ چکا ہے کم ہمت معاشرے میں یہ جذبہ زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔

سوال:۔

"کچھ ماہرین قانون کی رائے ہے کہ چونکہ سزاؤں کے تعین کے بارے میں فقہا میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں اس لئے اسلام کا تعزیراتی نظام قابل عمل نہیں ہے اس موضوع پر آپ کے تاثرات کیا ہیں؟"

جواب۔

اگر آپ کوئی کام نہ کرنا چاہیں تو اس میں ہزاروں کیڑے ڈال سکتے ہیں اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اس بات پہ اتفاق کریں کہ ہم اسلام کا قانونِ تعزیرات رائج کرنا چاہتے ہیں اسلام کے قانونِ تعزیرات کی بنیادیں ۔۔۔۔ قرآنِ مجید کے احکام، رسول اللہ کے ارشادات اور خلافتِ راشدہ کے نظائر ہیں۔ فقہاء کے درمیان اختلافات کی نوعیت ویسی ہی ہے جیسی

اس زمانے میں قانون دان اور ججوں میں اختلافات ہوتے ہیں باوجود اس کے کہ قانون ایک ہے اگر یہ اختلافات موجودہ زمانے کے قانون پر عمل کرنے میں مانع نہیں ہیں تو قدیم زمانے کے قانون دانوں اور قاضیوں کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں وہ آخر اصل قانون کو نافذ کرنے میں کیسے مانع ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً اصل قانون یہ ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے۔ اب اختلافات جو ہو سکتے ہیں وہ اس میں ہو سکتے ہیں کہ چور کی تعریف کیا ہے؟ کس حالت میں ایک شخص کو اس چوری کا مرتکب قرار دیا جائے جس پر شارع نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے؟ اس کے لئے کیا شہادت ملنی ضروری ہے؟ کون سا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ کس جگہ سے کاٹا جائے گا؟ ان امور میں جتنے اختلافات بھی ہیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر فقیہہ نے اصل قانون کے الفاظ اور عہدِ نبوی اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے نظائر سے اپنی رائے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے اور جو کچھ جس کے نزدیک ثابت ہوا ہے اس کو اس نے اپنی فقہ میں درج کیا ہے ان چیزوں کا جو شخص بھی باقاعدہ علمی مطالعہ کرے گا اس کو محسوس ہو جائے گا کہ جس طرح ان ماخذ سے قدیم زمانے میں قانون اخذ کیا جا سکتا ہے اسی طرح آج بھی کیا جا سکتا ہے اور جب تک کوئی شخص اس اصل قانون کے ماخذ سے استنباط کر رہا ہے اس کا اجتہاد اسلام کے دائرے ہی میں مانا جائے گا مغربی تہذیب اور اس کے تصورات سے مغلوب زدہ لوگ جب قدیم فقہا کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں اور "اجتہاد" کی باتیں کرتے ہیں ان کا اصل مدعا اسلامی قانون سے فرار ہوتا ہے ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگوں کے اجتہاد کو ہم کس طرح تقسیم کر سکتے ہیں ، اجتہاد کی اولین شرط یہ ہے کہ آدمی اسلام کو سچے دل سے حق مانتا ہو اور اخلاص کے ساتھ اس کی پیروی کا ارادہ رکھتا ہو جس "صاحب" میں یہ بنیادی شرط نہیں پائی جاتی وہ اگر اجتہاد کریں گے تو اسلام کے قانون کو مسخ کریں گے ۔"

سوال ۔

"یہ بین الاقوامیت کا دور ہے اس عہد میں مختلف تہذیبوں کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا

بالکل فطری عمل ہے ان حالات میں اگر ہم مغربی تہذیب سے مصالحت
(ADJUSTMENT) کریں تو کیا حرج ہے ؟"

جواب :-

"تہذیبوں" کے میل جول سے فعالیت اور انفعالیت کا عمل ضرور شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک تہذیب اثر ڈالتی ہے اور دوسری تہذیب اثر قبول کرتی ہے دیکھنا یہ ہے کہ ان دو صورتوں میں سے کون سی صورت ہمارے لئے قابلِ قبول ہے۔ تہذیبیں برابر کی سطح پر رہ کر کبھی سفر نہیں کرتیں۔ ایک تہذیب غالب ہوتی ہے اور دوسری مغلوب۔ اس عمل میں کوئی درمیانی راہ موجود نہیں۔ اگر ہم اپنی تہذیب کو غالب رکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں "مدافعت" کی سوچ ترک کر کے بجائے جارحانہ قدم اٹھانا ہوگا۔ وہ تہذیبیں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہا کرتیں جو اپنی حفاظت کے لئے اپنے چاروں طرف قلعے تعمیر کر لیتی ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی تہذیب میں دنیا کی غالب تہذیب بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں اب اس کا انحصار مسلمان پر ہے کہ وہ اسے غالب تہذیب بنانے کے لئے کیا کچھ کرتے ہیں میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ کوئی غیور اور آزاد قوم تہذیب کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا کرتی قوم کی تہذیبی انفرادیت ختم ہو گئی تو پھر اس میں باقی ہی کیا رہ گیا؟ اور جو لوگ اپنی تہذیب کو چھوڑ کر دوسروں کی تہذیب کو اپناتے ہیں ان کی حیثیت خس و خاشاک سے زیادہ کی نہیں ہے۔

سوال :-

"آپ جب اسلامی ثقافت کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو منفی رویہ اختیار کرتے ہیں یعنی آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں چیزیں اسلامی ثقافت میں داخل نہیں ہیں آپ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ اسلامی ثقافت میں کیا کیا داخل ہے اور اس کے تفصیلی خدوخال کیا ہیں ؟"

جواب:۔

"بات یہ ہے کہ اسلام انسانی زندگی کے لئے کچھ حدود مقرر کر دیتا ہے اور انسانی آزادی کو ان حدود میں محدود رہنا چاہیئے حدود ہمیشہ منفی ہوتی ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ حدود میں صرف یہ بتا دیا جاتا ہے کہ صرف یہ کچھ نہیں کیا جا سکتا اس کے بعد جو کچھ ممنوع نہیں ہے وہ مباح ہے، ان حدود میں رہتے ہوئے ایک فرد اپنے حسنِ ذوق کا اظہار اور نشوونما کے لئے راہیں تلاش کر سکتا ہے۔ اسلام نے انسان کے فطری داعیوں اور تقاضوں پر قدغن نہیں نہیں لگائی ہے بلکہ صحت مند نشوونما کی راہیں متعین کر دی ہیں مثال کے طور پر اسلامی شریعت نے حیوانوں اور انسانوں کی تصاویر کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اب اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آرٹ کا ارتقاء بند ہو گیا، بلکہ مسلمانوں میں جو حسن کاری کا جذبہ تھا اس نے تصویر کا راستہ چھوڑ کر خطاطی، نقش ونگار، پچی کاری اور ایسے ہی دوسرے راستے اختیار کر لئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان راستوں میں مسلمانوں نے جو آرٹ کے کمالات دکھائے ہیں وہ کسی طرح بھی مجسمہ سازی کے کمالات سے کم تھے یا ان میں حسن کاری نہ تھی یا ایسا ہی دوسرے میدانوں میں ہوا۔"

سوال۔

"بعض تصویریں اپنے رنگوں کے امتزاج اور فن کار کے خونِ جگر کی آمیزش کے باعث نظر کو بالیدگی اور تازگی بخشتی ہیں۔ کیا اسلام ان کی بھی اجازت نہیں دیتا؟۔

جواب:۔

"جی نہیں، اسلام جو حدود قائم کرتا ہے وہ اتنے واضح ہوتے ہیں کہ جن پر ہر شخص پہنچ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ میں اس کے آگے نہیں جا سکتا تصویر کو ایک مرتبہ جائز کرنے کے بعد پھر کوئی خط کسی مقام پر بھی نہیں کھینچا جا سکتا کہ اس نوعیت کی تصاویر جائز ہیں اور اس نوعیت

کی نہیں۔ ایک شخص عورت کی ننگی تصویر کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہے کہ اس سے اس کی روح کو بالیدگی ملتی ہے۔ یوں تو پھر آپ کو عریانی کے تمام مظاہر کو جائز قرار دینا پڑے گا۔

سوال:

"کیا اسلامی ریاست میں سینما کو اصلاحی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکے گا؟

جواب:-

"سینما کی موجودہ شکل تو نہایت ہی اخلاق سوز اور تباہ کن ہے، دو یوں کہ فلم کمپنیاں سودی قرض سے سرمایہ حاصل کر کے کام آگے بڑھاتی ہیں۔ سرمایہ دار کا سود اور اپنا نفع، دونوں چیزیں حاصل کرنے کے لئے وہ مجبور ہوتی ہیں کہ وہ ایسے فلم بنائیں جو افیون اور شراب کی طرح لوگوں کو اپنی کھینچیں۔ یہ فلم لامحالہ جنسی یا جرائم سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ ایسے ماحول میں جو فلم اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے بنائیں جائیں گے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

اسلامی ریاست اصلاحی اور تعلیمی مقاصد کے لئے سینما استعمال کر سکتی ہے فلم کو اگر صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو ہماری دیہاتی کے معیار معلومات کو گریجویٹ کے معیار تک لایا جا سکتا ہے لیکن یہ کام اسی وقت سرانجام پا سکتا ہے جب آنکھوں سے پلائی جانے والی شراب کو بند کیا جائے۔ اب جو ٹیلی ویژن آ رہا ہے اس نے اور بھی قیامت ڈھا دی ہے مغربی ممالک میں بسا اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ ایک بڑے بچے نے قتل کا منظر دیکھ کر چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا۔ جو مناظر پہلے فلم سکرین تک محدود تھے اب وہ گھر بیٹھے دیکھے جا سکتے ہیں۔

"آج پوری انسانیت دو چیزوں کی وجہ سے تباہی کے قریب آتی جا رہی ہے ایک سودی کاروبار اور دوسری خاندانی منصوبہ بندی۔ ان دونوں باتوں نے انسان کو نہایت ہی گھٹیا حیوان بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایک نے اُسے مادیت کا غلام بنایا اور دوسری نے جنسی خواہشات کا۔ مجھے دکھ ہے کہ یہ دونوں بلائیں میرے ملک کی طرف بڑھ رہی ہیں اور انہیں ہم خود خوشی خوشی لا رہے ہیں۔

سوال :-

" زندگی میں آسائش وزیبائش پیدا کرنے کے لئے اسلام ایک فرد کو کس حد تک جانے کی اجازت دیتا ہے "۔

جواب :-

" اسلام نہ آسائش کا مخالف ہے اور نہ زیبائش کا، حدود میں رہتے ہوئے آپ زندگی میں یہ دونوں باتیں پیدا کر سکتے ہیں دراصل اسلام ضرورت کے پیمانوں کے مطابق آپ کو تمام مباحات استعمال میں لانے کی اجازت دیتا ہے، بشرطیکہ آپ کے طرزِ عمل سے اسراف اور کبر نہ ٹپکتا ہو۔ ضرورت کے لئے آپ دو منزلہ کوٹھی بھی بنوا سکتے ہیں اور اگر فی الواقع ضرورت ہو تو دروازوں پر پردے بھی ڈال سکتے ہیں، لیکن اگر آپ بلا ضرورت صرف نمائش کے جذبے کے تحت زندگی پر تکلف کے قیمتی غلاف چڑھانے لگیں تو اس عمل کو اسلام پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا "۔

سوال

" لیکن مولانا، یہ اکثر مشاہدے میں آیا ہے کہ جب انسان آسائشوں میں زندگی بسر کرنے لگتا ہے تو پھر اس میں دین کے لئے جدوجہد کرنے کا احساس اور جذبہ بتدریج کم ہوتا چلا جاتا ہے کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم ان آسائشوں سے احتراز کریں ؟"

جواب :-

نہیں، یہ مناسب نہیں۔ اسلام میں جو حدود مقرر ہیں ہم ان میں اضافہ نہیں کر سکتے اصول کی بات یہ ہے کہ ایک مسلمان مباح چیزیں استعمال میں لانے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ لیکن کسی ایک فرد کو اگر مباح چیز اسلام سے دور لے جاتی ہے تو وہ اس کے لئے ممنوع قرار پاتی ہے، مثال کے طور پر کوٹ اور پتلون کی کریز ٹوٹنے کا خیال اگر کسی کو نماز ادا کرنے سے باز رکھتا ہے تو یہ لباس اس کے لئے ممنوع قرار پائے گا۔ آسائشوں کا بھی یہی معاملہ ہے۔

زندگی کی آسائشیں اور مسرتیں، اور جائز لذتیں ہمارے لئے ہیں، لیکن اگر یہ ہمیں اسلام کے راستے سے ہٹانے کا سبب بنتی ہیں تو انہیں ٹھکرا دیجئے۔ اس بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ اگر انسان کے معتقدات پختہ ہوں تو یہ چیزیں اثر انداز نہیں ہوا کرتیں جس شخص کے سامنے مقصدِ زندگی ہوتا ہے اس کے لئے اصل چیز آسائش نہیں ہوتی، اصل چیز اس کا مقصدِ زندگی ہوتا ہے آسائشیں جب تک مقصدِ زندگی میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں وہ ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جس وقت حائل ہونا شروع ہو جاتی ہیں، وہ لات مار دیتا ہے جب آسائشوں اور مقصدِ زندگی میں تصادم ہو جائے تو پھر آسائشیں اس پر حرام ہو جاتی ہیں۔"

سوال:-

"عالمِ اسلام میں جو ایک انتشار اور شکست خوردگی کی کیفیت پائی جاتی ہے اس کے بڑے بڑے اسباب کیا ہیں؟"

جواب:-

"یہ تو ایک نہایت ہی طویل داستان ہے اسے اس موقع پر کیونکر دہرایا جا سکتا ہے" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد کہنے لگے:۔

"دراصل انتشار کی بڑی وجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم معاشرے کی قیادت ایک مدت دراز سے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو اسلام کو ماننے کے باوجود اپنے آپ کو اسلام کے حدود میں رکھنے کے لئے تیار نہیں تھے اس میں شک نہیں کہ قیادت کا ایک حصہ علماء، فقہا اور صوفیاء کے ہاتھوں میں رہا ہے، مگر اس نے صرف بریک کا کام دیا ہے گاڑی چلانے والی لیڈرشپ دنیا پرستوں کے ہاتھ میں رہی اور اسی نے بگاڑ کو یہاں تک پہنچایا ہے جب تک گاڑی کو چلانے والی لیڈرشپ دیندار اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں نہیں آئے گی اس وقت تک یہ حالت نہیں بدل سکتی۔ بعض مسلمان ملکوں میں تو حالت یہ ہو گئی ہے کہ بریک ٹوٹ چکا ہے اور ڈرائیور گاڑی کو بگٹٹ نشیب کی طرف لے جا رہے ہیں۔

اور اکثر مسلمان ممالک میں بریک کر دیئے جا چکے ہیں۔

سوال:۔

"اس صورت حال کو بدلنے کے لئے کیا کوئی متحدہ کوشش نہیں کی جا سکتی؟"

جواب:۔

"متحدہ کوشش سر دست تو صرف اس حد تک ہو سکتی ہے کہ مختلف مسلمان ملکوں میں دینی روح کو بیدار کرنے والے لوگ کام کرتے ہیں اور جب کبھی موقع ملے تو ایک دوسرے کے خیالات اور تجربات سے فائدہ اٹھاتے رہیں اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لئے اس وقت کے بین الاقوامی حالات کوئی موقع نہیں دے رہے ہیں تمام مسلمان ممالک پر ایسے لوگ مسلط ہیں جو ایک طرف مغربی نیشلزم کے تصورات کی پیروی کر کے اپنے اپنے ملکوں کو مضبوط فولادی سرحدوں میں محصور کئے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے کوئی بین الاقوامی مسلم تحریک نہیں چل سکتی اور دوسری طرف وہ مغربی تہذیب و تمدن کو اپنے ملکوں میں رواج دے رہے ہیں اور اس طرح وہ اسلامی تحریکوں کے راستے میں سخت رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔

مؤتمر عالم اسلامی کی تازہ کانفرنس جو جدہ میں ہوئی ہے اس سے کچھ توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ دراصل حج کے دنوں میں پورے عالم اسلام کے مدبرین اور علماء کو سر جوڑ کر مل بیٹھنے کا سب سے موزوں موقع میسر آتا ہے۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ باہمی ربط سے بے شمار فوائد وابستہ ہیں جن کی بدولت کام کی ان گنت راہیں نکل سکتی ہیں۔ اس وقت عالم اسلام کو سب سے زیادہ ضرورت ایسے لٹریچر کی ہے جو اٹھنے والے مختلف مسائل کا نہایت ہی صاف، معقول اور قابل عمل حل پیش کر سکے اس سلسلے میں ہم اپنے لٹریچر کو عربی میں منتقل کر رہے ہیں۔ اس اقدام کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ کچھ ممالک کی درس گاہوں میں بعض کتابیں نصاب میں داخل ہو گئی ہیں اور بحیثیت مجموعی یہ وہاں کے نوجوان بالخصوص انگریزی یافتہ طبقے کو متاثر کر رہی ہیں

ان کتابوں میں عرب نیشنلزم پر بھرپور تنقید کی گئی ہے اور شاید یہ اسی کا اثر ہو کہ عرب ممالک میں عرب قومیت کے خلاف تحریک اٹھ کھڑی ہوئی ہے عین ممکن ہے کہ یہی تحریک آگے چل کر اسلامی تحریک کے لئے راستہ ہموار کر دے "

سوال۔

آپ نے عرب ممالک کی سیاحت کی ہے آپ کے خیال میں کیا اس سرزمین سے کسی اصلاحی اور جمہوری تحریک کے اٹھنے کی توقع نہیں ہے؟

جواب:۔

"وہاں کے حالات کے اعتبار سے اس وقت کسی جمہوریت کے قائم ہونے کے امکانات روشن نہیں ہیں تقریباً تمام عرب ممالک میں آمریتیں قائم ہیں۔ عراق، سوڈان اور مصر میں آمریت ہے، تیونس بھی قریب قریب آمریت کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے۔ اردن، مراکش اور لیبیا میں بادشاہی نظام قائم ہے۔ شام میں جمہوریت سر اٹھاتی ہے اور فوجی آمریت اسے بار بار پچھاڑ دیتی ہے۔ جمہوریت اس وقت عرب ممالک میں کہیں بھی نہیں سیاسی رقابتوں کی بنا پر ایک ملک دوسرے ملک میں جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ جمہوریت کا علمبردار خود اپنے ملک میں آمریت چلا رہا ہوتا ہے تمام مسلم ممالک کا قریب قریب یہی حال ہے کہ ان ملکوں کی فوجیں اپنے اپنے ملک کو فتح کر کے بیٹھی ہوئی ہیں۔

سوال۔

آپ کے نزدیک اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ کیا ہے اور اسے کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟

جواب:۔

میرے نزدیک پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ تقریباً وہی ہے جو تمام مسلم ممالک

کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آخر کار لیڈر شپ آیا اور اسلام کو ماننے سمجھنے اور اخلاص کے ساتھ اس پر عمل کرنے والوں کے ہاتھ میں آتی ہے یا ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ رہتی ہے جو اسلام کا نام لیتے ہوئے یا کھلم کھلا اس کی مخالفت کرتے ہوئے اپنی قوم کو بگٹٹ غیر اسلامی راستے پر لے جانا چاہتے ہیں اگر مستقبل قریب میں اس مسئلے کا فیصلہ پہلی صورت کے حق میں نہ ہوا تو مجھے اندیشہ ہے کہ سارے مسلم ممالک سخت تباہی سے دوچار رہیں گے بدقسمتی سے بیشتر مسلم ممالک میں جو لیڈر شپ قائم ہے وہ کسی عنوان بھی مسلم عوام کے ضمیر سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ حکومتیں اگر سو برس بھی زور لگائیں تو بھی میں توقع نہیں رکھتا کہ وہ مسلم عوام کے عقائد اور ان کے تصورات، تہذیب و تمدن اور ان کی اخلاقی قدروں کو تبدیل کر سکیں گی اور میں یہ بھی توقع نہیں رکھتا کہ مزید سو برس میں وہ کسی دوسری تہذیب کی قدروں اور تصورات پر قوم کی تعمیر سیرت کر سکیں گی۔ اس کشمکش کا حال اس سے زائد کچھ ہوتا نظر نہیں آتا کہ مسلمان قوم کی کوئی سیرت اور کردار نہ بن پائے اور اخلاقی اعتبار سے وہ بالکل دیوالیہ ہو جائے اور کوئی مادی ترقی بھی نہ کر سکے ایک بے سیرت قوم خواہ کتنے ہی ذرائع و وسائل رکھتی ہو، درحقیقت کوئی مادی ترقی نہیں کر سکتی اور کسی حکومت کی کوئی پالیسی خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی ایسی صورت میں کامیاب نہیں ہو سکتی جبکہ پوری قوم کا ضمیر پورے اطمینان کے ساتھ اس کے ساتھ نہ ہو اس لئے میں یقین رکھتا ہوں کہ تمام مسلمان ملکوں کے مستقبل کا انحصار صرف ایک صحیح قسم کی اسلامی لیڈر شپ پر ہے خدانخواستہ اگر یہ قیادت میسر نہ آئی تو ہم سب کو بہت ہی برا دن دیکھنا پڑے گا"۔

سوال۔

"اس لیڈر شپ کو تیار کرنے کے لئے کس شعبے میں اصلاح درکار ہے ؟

جواب

"لیڈر شپ کسی ایک شعبے میں نہیں ابھرا کرتی اس کو زندگی کے ہر شعبے میں ظاہر اور نمایاں

ہونا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مسلمان ملکوں میں جمہوری نظام کی نشو و نما پانے کا موقع مل جائے تو بالکل ایک فطری ارتقاء کے طور پر مسلمان ملکوں میں اسلامی لیڈر شپ اُبھر آئے گی۔ مغرب زدہ طبقہ ہر مسلمان ملک میں ایک بڑی ہی محدود اقلیت رکھتا ہے۔ لیکن مغربی استعمار کی بدولت یہ اقلیت اقتدار کی وارث بن گئی ہے یہ طبقہ اس بات کو جانتا ہے کہ اگر ان ملکوں میں جمہوریت کو کام کرنے کا موقع ملا تو آخر کار اقتدار ان لوگوں کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اس لیئے یہ طبقہ سازشوں کے ذریعے آمریت قائم کر رہا ہے اور جمہوریت کو اُبھرنے کا موقع نہیں دے رہا ہے"

سوال:۔

لیکن مولانا، مسلمان جمہور خود اسلام کے راستے سے بہت دور ہیں انہیں اسلام سے جذباتی لگاؤ تو ہو سکتا ہے مگر غالباً تربیت کی کمی کی وجہ سے ان میں وہ جوہر نظر نہیں آتا جو اسلامی لیڈر شپ کو جنم دے سکے تو پھر جمہوری نظام قائم کرنے سے صالح قیادت کیسے بروئے کار آسکے گی؟"

جواب:۔

ان دونوں کی حالت میں ایک بنیادی فرق ہے۔ عوام کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ اگرچہ ان میں جہالت بھی بہت پھیلی ہوئی ہے لیکن ان کی قدریں نہیں بدلیں۔ کسی بڑے سے بڑے بدکردار آدمی سے آپ بات کریں تو تھوڑی دیر بعد آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ اس کی قدریں (VALUES) ابھی وہی ہیں جو ایک مسلمان کی ہونی چاہیئں اور اپنی تمام بدکرداریوں کے متعلق اسے یہ تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا۔ کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بُرا کر رہا ہے برائی کو بھلائی کہنے والے آدمی عوام میں آپ کو بہت ہی مشکل سے ملیں گے۔

اس کے برعکس مغرب زدہ طبقے کی قدریں (VALUES) تبدیل ہو گئی ہیں ان کا فلسفۂ زندگی بدل گیا ہے اسلام جن چیزوں کو بُرا کہتا ہے وہ انہیں اچھا سمجھتے ہیں اور

اسلام جن چیزوں کو نیکیوں سے تعبیر کرتا ہے ان کی کوئی وقعت ان کی نگاہ میں نہیں ہے اسلامی روایات سے وہ منحرف ہو چکے ہیں بلکہ ان کی نگاہوں میں ان روایات کے لئے کوئی احترام نہیں۔ ہماری یونیورسٹیوں میں جو پروفیسر تعلیم دے رہے ہیں ان میں سے اکثر اس خیال کے حامی ہیں کہ تاریخ انسانی میں مسلمانوں نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دیا ایسے استاد بھی ہماری درسگاہوں میں موجود ہیں جو فرائڈ کے نظریات کے مطابق انبیائے کرام اور ہمارے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کی تصریح فرماتے ہیں او نچے سرکاری مناصب پر ایسے لوگ رکھے جاتے ہیں جو شراب اور سود کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں رقص و سرود اور اسلامی تہذیب و ثقافت قرار دیتے ہیں ان لوگوں کے عقائد اور عوام کے درمیان کوئی بھی مماثلت نہیں اگر اقتدار اسلامی ذہنیت رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہو تو مسلمان عوام کو صرف چند سالوں میں بالکل تبدیل کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ان کے رگ و ریشے میں اسلامی تصورات اور اقدار موجود ہیں صرف ان کو ابھار کر عملی شکل میں لانے کی ضرورت ہے"۔

سوال:

"مولانا، خدا کرے! آپ کا حسنِ ظن درست ہو، حالات تو کچھ اور ہی اشارے کر رہے ہیں؟"

جواب۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔

دعوت اسلامی کی کامیابی کا راستہ

تربیت گاہ جماعت اسلامی میں سوال و جواب کی محفل

ان پڑھ لوگوں میں تبلیغ کیسے کی جائے

سوال: "۸۰ فیصد ان پڑھ لوگوں کو دعوت اسلامی سے کیسے روشناس کرایا جائے"؟

جواب: اسلام کی دعوت جب عرب میں پیش کی گئی تھی اس وقت اس کی مخاطب آبادی تقریباً سو فیصدی ان پڑھ تھی۔ قریش جیسے ترقی یافتہ قبیلے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں صرف سترہ افراد پڑھے لکھے تھے۔ مدینے میں اس سے بھی کم لوگ تعلیم یافتہ تھے اور باقی عرب کی حالت کا اندازہ آپ ان دو بڑے شہروں کی حالت سے کر سکتے ہیں۔ قرآن مجید اس ملک میں لکھ کر نہیں پھیلایا گیا تھا بلکہ وہ لوگوں کو زبانی سنایا جاتا تھا۔ صحابہ کرام اس کو سن کر ہی یاد کرتے تھے اور پھر زبانی ہی اسے دوسروں کو سناتے تھے۔ اسی ذریعہ سے پورا عرب اسلام سے روشناس ہوا۔ پس درحقیقت لوگوں کا ان پڑھ ہونا کوئی ایسی دشواری نہیں ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ نہ ہو۔ آغاز اسلام میں اس دین کی تبلیغ ان پڑھ لوگوں ہی میں کی گئی تھی اور یہ محض زبانی تبلیغ و تلقین ہی تھی جس سے ان کو اس قدر بدل دیا گیا، ایسا زبردست انقلاب ان کے اندر برپا کر دیا گیا کہ دنیا کے مصلح بن کے کھڑے ہو گئے۔ اب آپ کیوں یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ۸۰ فیصد ان پڑھ آبادی میں اسلام کی دعوت نہیں پھیلائی جا سکتی؟ آپ کے اندر ۲۰ فی صدی تو پڑھے لکھے لوگ

موجود ہیں۔ وہ پڑھ کر اسلام کو سمجھیں، اور پھر باقی ۹۰ فیصد لوگوں کو زبانی تبلیغ و تلقین سے دین سمجھائیں پہلے کی نسبت اب یہ کام زیادہ آسان ہوگیا ہے۔ البتہ فرق جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس وقت جو شخص بھی اسلام کی تعلیمات کو سن کر ایمان لاتا تھا وہ ایمان لا کر بیٹھ نہیں جاتا تھا بلکہ آگے دوسرے بندگان خدا تک ان تعلیمات کو پہنچانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کی تمام حیثیتوں پر مبلغ ہونے کی حیثیت غالب آجاتی تھی۔ وہ ہمہ تن ایک تبلیغ بن جاتا تھا۔ جہاں جس حالت میں بھی اسے دوسرے لوگوں سے سابقہ پیش آتا تھا، وہ ان کے سامنے اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات بیان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ وہ ہر وقت اس تلاش میں لگا رہتا تھا کہ کس طرح اللہ کے بندوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی میں لائے۔ جتنا قرآن بھی اسے یاد ہوتا وہ اسے لوگوں کو سناتا، اور اسلام کی تعلیمات جتنی کچھ بھی اسے معلوم ہوتیں ان سے لوگوں کو آگاہ کرتا تھا۔ وہ انہیں بتاتا تھا کہ صحیح عقائد کیا ہیں جو اسلام سکھاتا ہے اور باطل عقیدے اور خیالات کون سے ہیں جن کی اسلام تردید کرتا ہے۔ اچھے اعمال اور اخلاق کیا ہیں جن کی اسلام دعوت دیتا ہے، اور برائیاں کیا ہیں جن کو وہ مٹانا چاہتا ہے۔ یہ سب باتیں جس طرح پہلے سنائی اور سمجھائی جاتی تھیں اسی طرح آج بھی سنائی اور سمجھائی جا سکتی ہیں۔ ان کے لئے نہ سنانے والے کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے نہ سننے والے کا۔ یہ ہر وقت بیان کی جا سکتی ہیں اور ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ اسلام نے کوئی ایسی نرالی چیز پیش ہی نہیں کی ہے جس سے انسانی طبائع مانوس نہ ہوں اور جن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بڑے فلسفے بگھارنے کی ضرورت ہو۔ یہ تو دین فطرت ہے۔ انسان اس سے بالطبع مانوس ہے اسے پڑھے لکھے لوگوں کی بہ نسبت ان پڑھ لوگ زیادہ آسانی سے قبول کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ فطرت کے قریب تر ہوتے ہیں، اور ان کے دماغ میں وہ پیچ نہیں ہوتے جو جاہلیت کی تعلیم نے ہمارے پڑھے لکھے لوگوں کے دماغوں میں ڈال دیئے ہیں۔ لہٰذا آپ ان پڑھ آبادی کی کثرت سے ہرگز نہ گھبرائیں۔ ان کی ناخواندگی اصل رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ آپ کے اندر جذبۂ تبلیغ کی کمی اصل رکاوٹ ہے۔ ابتدائے اسلام کے مسلمانوں کی طرح ہمہ تن مبلغ بن جایئے اور تبلیغ کی وہ لگن اپنے اندر پیدا کر لیجئے جو ان کے اندر تھی۔ اس کے

بعد آپ دیکھیں گے کہ اسلام کی دعوت پھیلانے کے بے شمار مواقع آپ کے منتظر ہیں جن سے آپ نے آج تک اس لئے فائدہ نہیں اٹھایا کہ آپ اپنے ملک کی آبادی ہیں سو فی صدی خواندگی پھیل جانے کے منتظر رہے۔

آئندہ انتخابات میں جماعت اسلامی کی پالیسی کیا ہو؟

سوال :۔ "آئندہ عام انتخابات میں جماعت اسلامی کی انتخابی پالیسی کیا ہونی چاہیئے؟"

جواب :۔ اس سوال کا جواب میں آپ کو یہاں نہیں دے سکتا۔ اس کے متعلق اگر مجھے کچھ کہنا ہوگا تو امیر جماعت سے کہوں گا، یا مجلس عاملہ مجھ سے دریافت کرے گی تو اس کے سامنے بیان کروں گا، یا مجلس شوریٰ مجھ سے پوچھنا چاہے گی تو اس کے اجلاس میں پیش کروں گا۔ میں ایک عام رکن جماعت ہوں نہ امیر جماعت ہوں، نہ مجلس عاملہ کا رکن، نہ مجلس شوریٰ کا رکن۔ میرا یہ کام نہیں ہے کہ یہاں بیٹھ کر جماعت کی پالیسی طے کردوں، پالیسی طے کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو دستور کی رو سے اس کے مجاز ہیں۔ کسی معاملہ میں میری رائے جو بھی ہوگی اسے ان تک پہنچا دوں گا، پھر یہ ان کی صوابدید پر موقوف ہے کہ جو پالیسی چاہیں بنائیں۔

چودھری غلام جیلانی صاحب۔ "لیکن مولانا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آپ سب کچھ ہیں!"

جواب :۔ میں اس تصور کی جڑ کاٹ دینا چاہتا ہوں۔ یہ جماعت ایک دستور اور ایک نظام پر قائم ہے۔ اس میں مجھ سمیت کوئی شخص بھی اپنی ذاتی حیثیت میں "سب کچھ" نہیں ہو سکتا۔ جس روز جماعت کی تاسیس ہوئی تھی اسی روز میں نے یہ بات واضح کردی تھی کہ دعوت تو بلاشبہ میں نے دی ہے، مگر یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ جو شخص داعی ہے اسی کو آپ سے آپ امیر جماعت بھی ہونا چاہیئے میرا کام آپ کو اقامت دین کے لئے جمع کردینا تھا سو وہ میں نے کر دیا۔ اب یہ طے کرنا آپ کا کام ہے کہ یہ ذمہ داری کس کے سپرد کریں۔ اس وقت چونکہ ارکان جماعت نے امارت کا بار میرے اوپر ہی رکھ دیا اس لئے میں نے اسے اٹھا لیا۔ اب میری خرابی صحت نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا ہے کہ اس ذمہ داری کا حق ادا کرسکوں، اس لئے میں نے ایمانداری کے ساتھ اپنے آپ کو اس سے سبکدوش کرا لیا ہے۔ اس کے بعد پھر وہی ذمہ داری

میں اپنے سر کیسے لوں جبکہ نظامِ جماعت کی رو سے اب میں اس کا حامل نہیں رہا ہوں؛ البتہ خادمِ جماعت ہونے کی حیثیت سے میرا جو فرض ہے اسے جب تک زندہ ہوں انشاءاللہ ادا کرتا رہوں گا۔

کیا اقامتِ دین کا کام ظہورِ مہدی سے پہلے ہوسکے گا؟

سوال: "کیا اقامتِ دین ایک فرض ہے جسے ہر حال میں ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ اور کیا قرآن و حدیث میں کہیں یہ بات ملتی ہے کہ ظہورِ مہدی سے قبل اسلامی نظام قائم ہو سکے گا۔"

جواب: قرآن میں تو خیر ظہورِ مہدی کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ احادیث میں اس کا ذکر ضرور آیا ہے۔ مگر وہ بس اسی حد تک ہے کہ مہدی آئیں گے اور دنیا کو، جو ظلم سے بھر چکی ہوگی، عدل سے بھر دیں گے۔ اس خوشخبری سے آخر یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ جب تک وہ نہ آئیں اس وقت تک دنیا ظلم سے بھرتی رہے اور ہم اس کا تماشا دیکھتے رہیں شیاطین کے دین قائم ہوتے رہیں اور اللہ کا دین قائم کرنے کے لئے ہم امام مہدی کی تشریف آوری کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ یہ تعلیم نہ اللہ نے دی ہے، نہ اللہ کے رسول نے اور قرآن و حدیث میں یہ بھی کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ امام مہدی کی آمد سے پہلے اللہ کا دین کبھی قائم نہ ہوسکے گا، یا اسے قائم کرنے کی کوشش کا فریضہ مسلمانوں کے ذمہ سے ساقط رہے گا۔ یہ بات ایک بشارت تو ضرور ہو سکتی ہے کہ آئندہ کسی زمانے میں کوئی ایسی عظیم شخصیت اٹھے گی جو تمام عالم میں اسلام کا جھنڈا بلند کر دے گی، مگر یہ کوئی حکمِ امتناعی نہیں ہو سکتی کہ ہم دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے کچھ نہ کریں۔ رہا یہ سوال کہ اقامتِ دین فرض ہے یا نہیں، تو ایسا شخص جو قرآن و حدیث کو جانتا ہے، اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء بھی بھیجے ہیں اپنا دین قائم کرنے کے لئے بھیجے ہیں، کوئی ایک نبی بھی لوگوں کو یہ سکھانے کے لئے نہیں بھیجا کہ وہ غیر اللہ کا دین قائم کرنے والوں کے ماتحت بن کر رہیں۔ سورۂ شوریٰ دیکھیے،

اس میں حضورؐ سمیت تمام انبیاء کا فرض یہ بیان کیا گیا کہ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ۔ " اس دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔" سورہ توبہ، سورہ فتح اور سورہ صف میں دیکھیے۔ تین مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ " وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ پورے دین پر اسے غالب کر دے۔" اب کون یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ امت مسلمہ کا مقصد وجود نبی برحق کے مقصد بعثت سے مختلف بھی کچھ ہو سکتا ہے؟

عوامی رجحانات کو دیکھتے ہوئے ہماری سیاسی پالیسی کیا ہونی چاہیئے؟

سوال :۔ " پاکستان کے موجودہ حالات میں عوام کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری سیاسی حکمت عملی کیا ہونی چاہیئے؟

جواب :۔ یہ سوال بھی اگرچہ اسی نوعیت کا ہے جس کا جواب اس مجلس میں دینے سے میں اظہار معذرت کر چکا ہوں، لیکن چونکہ اس سوال میں پوچھا یہ گیا ہے کہ " پاکستان کے موجودہ حالات میں عوام کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے " ہماری سیاسی پالیسی کیا ہونی چاہیئے" اس لئے میں اس کا کوئی اصولی جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ ہمارے رفقاء کسی غلط طرز فکر میں مبتلا نہ ہو جائیں اس میں شک نہیں کہ ہم جس ملک میں، جس قوم میں، جس زمانے میں، اور جن حالات میں کام کر رہے ہیں، ہمیں کوئی پروگرام بناتے ہوئے ان سب کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ لیکن اصولی دعوت لازماً ایک ہی رہے گی۔ ہمارا بنیادی مقصد بھی قطعاً ناقابل تغیر ہوگا اور اپنا عمل پروگرام بناتے ہوئے، ہم ان چیزوں کو صرف اس حیثیت سے ملحوظ رکھیں گے کہ اس ملک اور اس زمانے کے حالات میں ہم اپنی دعوت کو کس طریقے سے فروغ دیں، اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس قوم کے اچھے رجحانات سے کس طرح فائدہ اٹھائیں اور اس کے برے رجحانات کو کس طرح بدلیں کہ وہ ہمارے مقصد کی راہ میں کم از کم رکاوٹ تو نہ بن سکیں۔ اس نقطۂ نظر سے ان چیزوں کو ملحوظ رکھنا تو عین تقاضائے حکمت ہے لیکن اگر ہم زمان و مکاں کے حالات اور لوگوں کے رجحانات کو دیکھ

کہ اپنی دعوت اور مقصد پر ہی نظرِ ثانی کرنے بیٹھ جائیں تو یہ سراسر گمراہی ہے جس کا خیال تک ہمارے ذہن میں نہ آنا چاہیئے۔ طریقِ کار حالات کے لحاظ سے بدلا جاسکتا ہے۔ حکمتِ عملی میں لوگوں کے اچھے یا برے رجحانات کے لحاظ سے تغیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور اس کی دعوت کے جو اصول مقرر کر دیئے ہیں ان میں ذرا برابر کوئی ردوبدل لوگوں کے رجحانات یا زمانے کے حالات کو دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے جس چیز کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے ہمیں ہر حال میں اسی کو قائم کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم جس ملک میں کام کر رہے ہوں اس کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم اس مقصد کے لئے سعی و جہد کے ایک طریقے کو موزوں پا کر اختیار کریں اور دوسرے طریقے کو ناموزوں سمجھ کر ترک کر دیں۔ اسی طرح جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ مٹانا چاہتے ہیں ان کو مٹانا ہی ہماری کوششوں کا ہمیشہ مقصود رہے گا، یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی استطاعت اور ملک کے حالات، اور عوام کی مزاجی کیفیات کو دیکھ کر یہ طے کریں کہ کن چیزوں کو مٹانے کی کوشش مؤخر رکھی جانی چاہیئے، نیز یہ کہ اس غرض کے لئے ہم کون سی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں، اور کن تدابیر کا اختیار کرنا غیر ممکن، غیر مفید، یا غیر مناسب ہے۔

اللہ تعالیٰ ظالموں کو غلبے کا موقع کس حد تک دیتا ہے؟

سوال:۔ "اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق کاذب، ظالم اور خبیث قسم کے حکمرانوں کو شریف اور خدا ترس لوگوں پر زیادتیاں کرنے، دینِ حق کا راستہ روکنے، عوام کو ذلیل و خوار کرنے، اور قومی وسائل کو اپنی ذات کے مفاد میں استعمال کرنے کا موقع کس حد تک عطا فرماتا ہے۔ بچے کھچے پاکستان میں ایسے جاری رہنے کے کس حد تک امکانات ہیں اور نظامِ اسلامی کے غلبہ کے بارے میں یہاں کیا توقعات ہیں؟"

جواب:۔ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں اور اپنی حکمتوں کو خود ہی جانتا ہے، ہمارے پاس ان کو جاننے اور سمجھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس نے مختلف جباروں اور مختلف ظالم قوموں کی رسی جتنی چاہی ہے دراز کی ہے، اور جب چاہا ہے ان کو اٹھا کر اس طرح پھینکا ہے کہ وہ عبرت بن کر رہ گئے ہیں۔

بہرحال اپنی زمین کا مستقل پٹہ اس نے کسی شخص یا قوم یا مجموعہ اقوام کو کبھی لکھ کر نہیں دے دیا ہے یہ معاملہ چونکہ ہماری سمجھ سے باہر ہے اس لئے خدا کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتے ہوئے ہمیں اس فکر میں نہیں پڑنا چاہیئے کہ جو طاقتیں اس راہ میں مزاحم ہیں ان کی رسی خدا نے کتنی دراز یا کتنی کوتاہ رکھی ہے ہمیں اپنا فرض صبر و حکمت کے ساتھ بہرصورت ادا کئے چلے جانا چاہیئے، خواہ اس کے نتائج نکلنے میں کتنی ہی تاخیر ہو، اور وہ نتائج ہماری آنکھیں دیکھ سکیں یا نہ دیکھ سکیں۔

باطل کے لئے کام کرنے والوں کی طرح حق کے لئے کام کرنے والوں کے ساتھ بھی، اللہ تعالیٰ کا معاملہ مختلف رہا ہے۔ کبھی ان کے حصہ میں صرف جان و مال اور وقت و محنت کی قربانی ہی آتی ہے، دنیوی کامیابی انہیں عطا نہیں کی جاتی۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اللہ ان سے ناراض اور ظالموں سے راضی ہوتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جس قوم میں وہ کام کر رہے ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو اس کا مستحق نہیں بناتی کہ اللہ اسے نیک رہنما اور عادل فرمانروا دے، بلکہ اس کے برعکس اس کی شقاوت اور دنائت اپنے رب سے گمراہ کن رہنما اور جابر و ظالم فرماں روا ہی مانگتی ہے اور وہی اسے دیے جاتے ہیں۔ مگر اس صورت میں اہلِ حق کا کیا ہوا کام ضائع ہرگز نہیں ہوتا۔ آخرت میں تو ان کا اجر بہرحال محفوظ ہے ہی، دنیا میں بھی جو بیج وہ بو جاتے ہیں وہ کبھی نہ کبھی پھل لا کر رہتے ہیں، خواہ ان کے بار آور ہونے میں صدیاں لگ جائیں۔

پھر کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اہلِ حق کو کامیابی نصیب ہوتی ہے، مگر آسانی کے ساتھ نہیں بلکہ بڑی تکلیفیں اٹھا کر اور ہر طرح کے ظلم و ستم کی چکی میں پس کر ہوتی ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال آپ کے سامنے خود ان بندگانِ حق کی موجود ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر حضورؐ کی رہنمائی میں وہ دین قائم کیا جسے قائم کرنے کے لئے آج آپ اٹھے ہیں۔ ان کے ساتھ یہ معاملہ تو نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے خوب دل کر فرائض و نوافل ادا کئے ہوں اور ایک روز فرشتوں نے آ کر ان سے کہا ہو کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عبادت اور ذکر و فکر سے بہت خوش ہوا ہے، چلیے اب تختِ سلطنت آپ کے لئے تیار ہے، یا کفر و فسق کے زیر سایہ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی تبلیغ کرتے رہے ہوں اور ایک وقت اچانک ایسا آ گیا ہو کہ کفار و فساق آپ ہی ان کے حق میں اقتدار سے دستبردار ہو گئے ہوں، تاریخ گواہ ہے کہ مکہ معظمہ میں ابتدائی خفیہ دعوت کا زمانہ چھوڑ کر مسلسل

دس سال تک حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر سخت سے سخت ظلم کئے گئے کسی کو تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر گھسیٹا گیا۔ کسی کو آگ کے انگاروں پر ڈال کر اوپر سے پتھر رکھ دیے گئے کسی کو الٹا لٹکا کر اور چٹائی میں لپیٹ کر دھونی دی گئی۔ کسی کو مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا۔ کسی کو پانی میں غوطے دیے گئے حتیٰ کہ بہت سے لوگوں کو گھر بار چھوڑ کر بے سر و سامانی کے عالم میں حبش کی طرف نکل جانا پڑا۔ پے در پے مصائب کے یہ دس سال گزارنے کے بعد جب مدینہ میں پناہ کی ایک جگہ اور حامیوں کی ایک جماعت ملی تو وہاں بھی پھولوں کی کوئی سیج تیار نہ تھی۔ ۹ سال تک وہاں گھر کے منافقوں، پڑوس کے یہودیوں، اور پورے عرب کے مشرکوں کا ایک شدید جانگسل کش مکش برپا رہی جس میں کبھی ایک دن کے لئے بھی چین نصیب نہ ہوا۔ غار ثور کی انتہائی خطرناک پناہ گزینی سے لے کر غزوہ تبوک کے جیش عسرت تک سارا زمانہ ایسی حالت میں گزرا جس کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ: ہم ضرور تمہیں آزما کر رہیں گے کچھ خوف سے کچھ بھوک سے اور کچھ مال اور جان اور پیداوار کے نقصانات سے"۔ یہ مراحل جب صبر و استقامت کے ساتھ گزار دیئے گئے تب کہیں دین حق کے علمبردار اور اس کے مجاہد ساتھیوں کی آنکھیں يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا کا منظر دیکھ کر ٹھنڈی ہو سکیں۔

یہ سب کچھ کس لئے تھا! کیا ظالموں کے ظلم سے اللہ راضی تھا اس وجہ سے ان کو اپنے نیک بندوں پر زیادتیاں کرنے کی کھلی چھوٹ دیے جا رہا تھا! کیا اللہ رحیم و رحمٰن کو یہ پسند تھا کہ اس کے باغی عیش کریں اور اس کے وفادار بھوکے مریں! ماریں کھائیں! گھر سے بے گھر کئے جائیں! اور میدان جنگ میں صرف قتل ہی کئے جائیں بلکہ ان کے کلیجے تک چبا ڈالے جائیں؟ اگر آپ یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ اصل بات یہ نہیں ہے تو پھر خوب سمجھ لیجئے کہ اللہ جل شانہ اسلام کی دعوت لے کر اٹھنے والوں کے لئے آزمائشوں کی بھٹی ضرور گرم کرتا ہے تاکہ کوئی بودا اور خام آدمی اس میدان میں قدم نہ رکھنے پائے، اور جو لوگ بھی ایمان کا اقرار کر کے اس راہ پر آئیں وہ لازماً اس بھٹی سے گزارے جائیں تاکہ حق و صداقت کے ساتھ ان کا عشق، اور دین کی سربلندی کے لئے ان کا عزم اور اقامت دین کے لئے ان کا کردار پختہ اور قابل اعتماد ہو

جائے۔ اس کے بغیر ان کو اللہ اور اس کے دین کے نام پر دنیا میں حکومت و فرمانروائی کا موقع دے دیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ کافروں کی جگہ مسلمان خلق خدا پر ظلم کرتے، اور ان کی خیانتیں اور بدکرداریاں دیکھ کر دین کی ساکھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی۔

اس حقیقت کو اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں تو کبھی آپ کے ذہن یہ سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوں کہ اللہ کب تک ظالموں کو ظلم کی چھوٹ دیئے رکھے گا؟ اور ان حالات میں اسلامی نظام کے قائم ہونے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟ خوب جان لیجئے کہ اس سرزمین میں اسلام کا غلبہ اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اس مقصد کے لئے کام کرنے والے اسی بھٹی سے گزریں جس سے دورِ اوّل کے اہلِ ایمان گزرے تھے اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ ہر قربانی دینے، ہر مشقت اٹھانے، ہر نقصان بھگتنے اور ہر خطرہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں جب تک یہ امتحان وہ پاس نہ کریں گے ان پر ایک دارالسلام کے انتظام کی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈالا جاتے گا، کیونکہ وہ اس بوجھ کو سہار نہ سکیں گے۔ اسلام کے نام پر کسی نیم پختہ گروہ کو اگر حکومت دے دی جائے اور پھر اس کے لائے ہوئے حاکم خائن نکلیں، اختیارات کا ناجائز استعمال کریں، اپنی اغراض و خواہشات کے بیجا تقاضوں سے مغلوب ہو کر انصاف اور امانت کا خون کرنے لگیں، قوم کے مال میں ناروا تصرف کریں، اپنے آپ کو قانون سے بالاتر قرار دے لیں، اور اقتدار کا بار پڑتے ہی ان کے اخلاق جواب دے جائیں تو پھر ہمیشہ کے لئے اسلام کے غلبے کا امکان ختم ہو جائے گا اس ملک ہی کی آبادی نہیں بلکہ پوری دنیا اسلام سے مایوس ہو جائے گی۔ اس لئے اس کو اللہ کی رحمت سمجھیے کہ وہ آپ کو پختہ کرنے کے لئے آزمائشوں کی بھٹی سے گزار رہا ہے اور قبل از وقت آپ پر ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ڈال رہا جب اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہو گا کہ یہاں ایک ایسی جماعت ہے جس میں کھرا سونا ہی پایا جاتا ہے اور کھوٹ سے وہ صاف ہو گئی ہے جس کی دیانت و امانت اور خدا ترسی قابلِ اعتماد ہے، جو کبر و نخوت اور انانیت و نفسانیت سے پاک ہے، جو اپنی بڑائی کے لئے نہیں اٹھی ہے بلکہ فی الواقع اللہ کے دین ہی کی بالاتری قائم کرنا چاہتی ہے، تب اللہ کے فضل سے یہ پوری امید ہے کہ وہ ایسی جماعت کو دنیوی کامیابی بھی عطا فرمائے گا جس طرح اس کے پیشرووں کو وہ عطا کر چکا ہے۔ اس لئے صبر

اور ہمت و استقامت کے ساتھ آزمائشوں سے گزرئیے اور اللہ سے دعا مانگتے رہیئے کہ وہ آپ کو اقامت دین کے کام کی اہلیت و صلاحیت عطا فرمائے۔ یہی بات ہے جو حضرت خباب بن ارت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ جب انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے" تو آپؐ کا چہرہ مبارک تمتما اٹھا اور آپؐ نے نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو اہل ایمان گذر چکے ہیں ان پر اس سے زیادہ سختیاں توڑی گئی تھیں یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب ایک شخص صنعار سے حضرموت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہو گا مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔

اقامت دین کے کام کے لئے فارغ کارکن کیوں؟

سوال:۔ "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبہ اسلام سے پہلے تمام صحابہ کرامؓ سے رضا کارانہ تعاون حاصل فرمایا اور صرف اسلامی نظام کے قیام کے بعد ہی کارکنوں کو فارغ کیا گیا تو کیا جماعت اسلامی اس سنت کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہی ہے؟"

جواب:۔ دراصل اس کے لئے لفظ سنت استعمال صحیح نہیں ہے۔ یہ تو تدبیر کا معاملہ ہے جس میں حالات اور ضروریات کے لحاظ سے کوئی مناسب طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مکہ معظمہ میں جب تک حضورؐ رہے، طریق کار یہ تھا کہ جو لوگ کچھ مال رکھتے تھے وہ ان لوگوں کی مدد کرتے تھے جو اپنا بار نہ اٹھا سکتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود وہ سارا مال اللہ کی راہ میں صرف فرمایا جو نبوت سے پہلے آپؐ کے پاس تھا۔ حضرت ابو بکرؓ اور دوسرے خوشحال مسلمانوں نے بھی اپنی دولت اس کام میں صرف کی۔ اسلام قبول کرنے والوں میں ایسے اصحاب بھی تھے جن کے ذرائع معیشت ظالموں نے ختم یا تنگ کر دیئے تھے، اور ایسے نوجوان بھی تھے جنہیں ان کے گھر والوں نے نکال دیا تھا اور وہ بے سہارا رہ گئے تھے۔ ان سب لوگوں کے لئے چاہے باقاعدہ مشاہرے نہ مقرر کئے گئے ہوں، لیکن ان کی کفالت کسی نہ کسی طرح کی جاتی تھی

ورنہ ظاہر بات ہے کہ وہ خوراک اور لباس کے بغیر تو نہیں رہ سکتے تھے۔ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں بھی ایک مدت تک یہ صورت رہی کہ جو کفالت کے محتاج تھے اور خود اپنی روزی نہ کما سکتے تھے ان کی کفالت دوسرے اصحاب اپنی استطاعت کے مطابق کرتے رہتے تھے۔ سورہ بقرہ میں انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ ان غریب لوگوں کی مدد کی جاتے جو "اللہ کی راہ میں ایسے گھر گئے ہیں جو اپنے ذاتی کسب معاش کے لئے زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے"۔ اَلَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ان غریبوں کے اللہ کی راہ میں گھر جانے کا مطلب دین کے کام میں ان کا اس طرح مشغول ہو جانا تھا کہ وہ چل پھر کر اپنی روزی کمانے کی فرصت نہ رکھتے تھے اور ایسے ذرائع بھی ان کو حاصل نہ تھے کہ وہ گھر سے کھا کر خدا کا کام کر سکیں۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے غنیمت اور فے کے اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرما دیئے تو ان کا ایک مصرف ایسے خادمانِ دین کی کفالت بھی تھا پھر جن لوگوں کو حضورؐ نے امیر یا عامل، یا محصّلِ زکوٰۃ وغیرہ مناصب پر مقرر کیا تو ان کے باقاعدہ مشاہرے بھی مقرر فرمائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف زمانوں میں مختلف حالات کے لئے جو تدبیر موزوں سمجھی وہ اختیار فرمائی۔ ان میں سے کسی تدبیر کو بھی ایسی سنت قرار نہیں دیا جا سکتا جس کی پابندی ہر حال میں لازم ہو۔ جماعت اسلامی میں فارغ کارکن صرف اسی صورت میں مقرر کئے گئے ہیں جبکہ جز وقتی کارکنوں کی رضاکارانہ خدمات سے باقاعدگی کے ساتھ کام نہ چل سکتا ہو، اور ہمہ وقتی خدمات کے لئے ایسے کارکن بھی نہ مل سکتے ہوں جو گھر سے کھا کر اپنا سارا وقت خدا کے کام میں صرف کر سکیں۔

ہم جیسے کمزور لوگوں کے ہاتھوں اسلامی نظام کیسے برپا ہو گا اور کتنے دن چل سکے گا؟

سوال :- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ کی جماعت، جن کے ہاتھوں اسلامی انقلاب برپا ہوا، ان کے تقویٰ، قناعت، کفایت شعاری، جانی و مالی ایثار، توکل علی اللہ، اور شوقِ شہادت کا معیار اتنا اونچا تھا کہ جس کا نمونہ موجودہ تحریک اسلامی کے کارکنوں میں پایا جانا تو درکنار اس کا سوان حصہ بھی نایاب ہے۔ کس طرح ممکن ہے

کہ وہ مہم سر کی جا سکے جو صحابہؓ نے سر کی ہے۔ پھر ایسے بلند مرتبہ رہنماؤں اور کارکنوں کے ہاتھوں جو اسلامی انقلاب برپا ہوا وہ بھی معیاری صورت میں ۳۰ سال ہی چل سکا، صرف اس لئے کہ بعد میں آنے والے لوگوں کے درمیان پہلے صحابہ جیسے لوگ نہ تھے اب جس معیار کے رہنما اور کارکن تحریک اسلامی میں ہیں ان کے ہاتھوں وہ انقلاب برپا ہونا اوّل تو سخت مشکل ہے، اور اگر وہ برپا ہو بھی جائے تو شاید ۳۰ دن بھی نہ چل سکے گا۔"

جواب :۔ یہ سوال تو ایک پورا خطبہ ہے تحریک اسلامی کے کارکنوں کو اپنے نصب العین سے مایوس کر دینے کے لئے۔ اگر اس کا مقصد خود مایوس ہونا اور دوسروں میں مایوسی پیدا کرنا نہیں ہے تو اس معاملے پر اچھی طرح سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنے اعلیٰ درجے کے مربی تھے اور جیسا بلند ترین نمونہ حضورؐ نے اپنی زندگی کا لوگوں کے سامنے پیش کیا، اس طرح کا کوئی رہنما قیامت تک مسلمانوں کو میسر نہیں آ سکتا۔ اسی طرح حضورؐ کی تعلیم و تربیت کی بدولت جیسے اعلیٰ درجے کے کارکن دعوتِ اسلامی کی خدمت انجام دینے کے لئے اس وقت تیار ہوتے تھے، اس پائے کے کارکن بھی تیار کر لینا کسی کے بس میں نہیں ہے اب کیا اس کے معنی یہ ہیں ہم دینِ حق قائم کرنے کی کوشش ہی نہ کریں؟ اگر اس کام سے رک جانے سے یہی دلیل استعمال کی جاتے تو اس کے دو ہی نتیجے نکل سکتے ہیں یا تو دینِ باطل دنیا میں قائم ہو اور ہم اس کے غلام بن کر رہیں۔ یا پھر خود بھی دینِ باطل کے قائم کرنے میں لگ جائیں تاکہ دنیوی لذت اور فوائد و منافع سے تو اچھی طرح شادکام ہو سکیں۔ اس کے لئے کسی قسم کی بھی اخلاقی بلندی درکار نہیں صرف پستی کی طرف گرنا ہی ہے جو کسی محنت اور کوشش کے بغیر آسانی ہو سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ نیک نیتی کے ساتھ وہ غلط طرزِ فکر اختیار کرتے ہیں جو اس سوال کے اندر مضمر ہے انہوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ یہ طرزِ فکر آخر کار ہمیں کہاں پہنچا کر چھوڑتا ہے اس کے بجائے اگر وہ صحیح طور پر سوچتے تو سیدھی راہ ان کے سامنے خود بخود واضح ہو جاتی: ایک مومن کے لئے سیدھی راہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ

کے صحابہ اکرامؓ جس بلندی پر پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں اس کی طرف چڑھنے کے لئے وہ جتنی کوشش کر سکتا ہے کرے اور عمر بھر کرتا چلا جائے اور اپنی طرف سے اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ اس بلندی پر چڑھتے ہوئے اگر کوئی شخص تھک کر راستے میں گر جائے اور وہیں مر جائے تو وہ کامیاب ہے لیکن اگر ایک یہ دیکھ کر کہ چڑھائی بہت اونچی ہے کھڈ کی طرف جانا شروع کرے تو گر جائے گا بڑی آسانی سے لیکن گرے گا بھی ایسی جگہ جہاں اس کا پرزہ پرزہ بکھر کر رہ جائے گا قرآن کو آپ غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ انسان کو سیرت و اخلاق کی بلندیوں پر چڑھنے سے مایوس نہیں کرتا بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ۔

"جس نے راہ خدا میں مال دیا اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کیا اور بھلائی کو سچ مانا اس کو ہم آسان راستے کی سہولت دیں گے" بلکہ اللہ تعالیٰ کا صریح وعدہ ہے کہ وَالَّذِیْنَ جٰهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ "جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کریں گے ان کو اپنے راستوں کی ہدایت ہم خود کریں گے۔" لہٰذا آپ اللہ کی راہ میں جان لڑائیں اور اس سے توفیق مانگتے رہیں۔ اپنی ایک ایک کمزوری کو سمجھیں اور اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے اندر جو بہتر صلاحیتیں پائیں ان کو بھی اچھی طرح سمجھیں اور ان کو ترقی دینے کی کوشش کریں۔ اس تزکیۂ نفس میں قرآن و حدیث اور سیرت پاک اور صحابہؓ و اخیار امت کی سیرتیں پڑھنے سے بھی بڑی مدد مل سکتی ہے، اور اگر جماعت کے سب افراد اس کوشش میں لگے ہوئے ہوں تو وہ سب بھی ایک دوسرے کے مددگار بن سکتے ہیں۔ اس طرح اپنے آپ کو پستیوں سے اٹھانے اور بلندیوں کی طرف لے جانے کی جتنی کوشش آپ اللہ کے بھروسہ پر کریں گے اتنے ہی بلند مراتب پر اللہ تعالیٰ آپ کو پہنچا دے گا، کیونکہ یہ اس کا وعدہ ہے اور وہ اپنے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کرنا بجائے خود بھی انسان کی اصلاح و ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسلام میں جو اخلاقی بلندی مطلوب ہے وہ باطل کے مقابلے میں لڑنے اور حق قائم کرتے کی کوشش میں جان لڑانے ہی سے

حاصل ہوتی ہے صحابہ کرام کی جن بلندی مدارج کو دیکھ کر آپ پر حیرت اور مایوسی کا عالم طاری ہونے لگتا ہے وہ کسی گوشۂ عزلت میں چلّے کاٹنے کا ثمرہ نہ تھی بلکہ اللہ کی راہ میں مار کھانے، اذیتیں سہنے، قیدیں برداشت کرنے، بھوکے مرنے، نقصانات اٹھانے، خطرات کا سامنا کرنے اور جان و مال کی قربانیاں دینے سے حاصل ہوئی تھی۔ آدمی کو اللہ اور اس کے دین سے عشق نہ ہو تو وہ اس وادی پر خطر میں اتر ہی نہیں سکتا، اور جب وہ اس میں اترتا ہے، تو ہر چوٹ کھا کر اس کا عشق بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہی عشق ان بندگان حق کو اتنی بلندیوں پر اٹھا لے گیا۔ آپ باطل سے لڑنے اور اس کی جگہ حق قائم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائیں گے تو اللہ آپ کے ساتھ کسی بخل سے کام نہ لے گا۔

اب رہا یہ خیال کہ ہم جیسے کمزور لوگوں کے ہاتھوں اسلامی نظام کا برپا ہو جانا ہی سخت مشکل ہے، اور اگر وہ ہو بھی جائے تو تیس سال کجا، تیس دن بھی قائم نہ رہ سکے گا، تو اس کے متعلق میں بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے اوپر اسلامی نظام برپا کر دینے کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے، بلکہ اس کے لئے جان لڑا دینے کی ذمہ داری ہی ڈالی گئی ہے اس کا برپا ہونا یا نہ ہونا اللہ تعالٰی کی مشیت پر موقوف ہے، اور یہ بھی اللہ تعالٰی کی مشیت ہی پر منحصر ہے کہ وہ قائم ہو تو کب تک چلے اور کب تک نہ چلے۔ لہٰذا ان باتوں کو سوچ سوچ کر تھڑدلی میں مبتلا ہو جانا درست نہیں ہے۔ آپ کے کرنے کا جو کام ہے اسے اپنی حد تک زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے کرنے کی کوشش کریں اور اللہ کے کرنے کا جو کام ہے اسے اللہ پر چھوڑ دیں۔

فارغ کارکنوں کی الجھن

سوال:۔ "تحریک اسلامی کے فارغ کارکن بالعموم اس الجھن کو محسوس کرتے ہیں کہ ان کے روز مرہ کے کام کا نتیجہ محسوس طور پر یا اعداد و شمار میں واضح طور پر ظاہر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات دن بھر میں ایک ہی ملاقات ہوتی ہے یا سفر کر کے دور دیہات میں جانے کے بعد مجوزہ پروگرام نہیں بنتا یا آدمی نہیں ملتا۔ تحریک کے رفقاء توقع رکھتے ہیں کہ جب ایک کارکن فارغ کر دیا گیا ہے تو کام کا نتیجہ محسوس

طور پر اعداد و شمار میں آنا چاہیئے اس الجھن کا علاج کیا ہے"؟

جواب:- اس الجھن کے دو پہلو ہیں اور دونوں پہلوؤں کا علاج ہونا چاہیئے۔ایک پہلو تو ہے اس شخص کی الجھن کا جو فارغ کارکن ہے، اور ایک پہلو ہے ان لوگوں کی الجھن کا جو اس کارکن کو تحریک کا کام کرنے کے لئے فارغ کرتے ہیں، اس کی کفالت کے لئے مال فراہم کرتے ہیں، اور اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ وہ کام کر رہا ہے یا نہیں، اور اگر کر رہا ہے تو کس طرح کر رہا ہے۔

جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے سب سے پہلے ہر فارغ کارکن کو خود اپنا بے لاگ محاسبہ کرکے دیکھنا چاہیئے کہ جب میں اسلام کے کام کے لئے فارغ کیا گیا ہوں اور میری ضروریات کا بوجھ جماعت نے اپنے ذمے لیا ہے تو کیا میں اس کا حق ادا کر رہا ہوں؟ یہ محاسبہ اسے عنداللہ اپنی جواب دہی کا احساس کرتے ہوئے کرنا چاہیئے اگر اس کا اپنا ضمیر یہ محسوس کرے کہ ادائے حق میں وہ کوتاہی کر رہا ہے تو اسے خود اپنی اصلاح کرنی چاہیئے، خواہ جماعت اس کا محاسبہ کرے یا نہ کرے۔کیونکہ کوئی اور جانے یا نہ جانے، وہ خدا تو اس کی کوتاہی کو جانتا ہے جو عالم الغیب و الشہادۃ ہے۔جماعت کو وہ بڑے معقول دلائل دے کر مطمئن کر سکتا ہے مگر خدا کو تو کسی طرح دھوکا نہیں دے سکتا۔اسے اس سارے معاملہ پر اس لحاظ سے سوچنا چاہیئے کہ اس وقت وہ کیا جواب دے گا جب اس سے پوچھا جائے گا کہ اللہ کے بندے تیرے لئے ضروریات زندگی فراہم کرنے کا انتظام بھی کر دیا گیا اور ہمارے کام کے لئے تجھے فکر معاش سے بھی فارغ کر دیا گیا، پھر بھی تو نے اس کام میں جان نہ لڑائی! اس طرح اپنا محاسبہ کرکے ہر فارغ کارکن اپنی الجھن کو خود دور کر سکتا ہے۔

رہی ان لوگوں کی الجھن جو اسے فارغ کرتے ہیں، تو ان کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ کوئی تعمیر کا کام تو ہے نہیں کہ روز آپ آ کر گن لیں کہ آج کتنی اینٹیں رکھی گئیں۔اس حساب سے اگر آپ نے دیکھنا شروع کیا تو ظاہر بات ہے کہ کوئی فارغ کارکن بھی، امیر جماعت سمیت، اس قابل نہیں رہے گا کہ اپنے کام سے آپ کو مطمئن کر سکے آپ کو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ فارغ کارکن اپنا وقت اور اپنی محنت فرض شناسی اور دل کی لگن کے ساتھ اسی کام میں صرف کر رہا

ہے یا نہیں جس کے لئے اسے فارغ کیا گیا ہے؟ وہ فضول کاموں میں تو اپنا وقت ضائع نہیں کر رہا ہے؟ وہ جماعت سے معاوضہ لے کر اپنے ذاتی مقاصد کے لئے دوڑ دھوپ کرنے میں تو لگا نہیں رہتا؟ ایسی کوئی شکایت اس سے نہ ہو تو آپ اس لحاظ سے اس کے کام کو نہ جانچیں کہ ان کی کوششوں سے نتائج کس قدر برآمد ہوتے ہیں۔ یہ کام تو ایسا ہے کہ بسا اوقات ہفتوں اور مہینوں ہی نہیں، برسوں ایک شخص اپنی جان کھپاتا رہتا ہے اور پھر بھی ایسے نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ جنہیں ناپ کر اور تول کر دیکھا جا سکے۔ دعوت ہزارہا آدمیوں تک پہنچائی جاتی ہے مگر صرف چند آدمی اسے قبول کرتے ہیں اور ان کے بارے میں بھی یہ ضمانت کسی کے پاس نہیں ہوتی کہ وہ کتنے مخلص ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے انبیاء کو بھی ان کی مساعی کے نتائج اور ماحصل کے لحاظ سے نہیں جانچا ہے، بلکہ صرف اس لحاظ سے جانچا ہے کہ انہوں نے اپنا فرض کماحقہٗ ادا کر دیا ہے یا نہیں۔ نتائج کے لحاظ سے جانچا جاتا تو معاذاللہ وہ انبیاء تک ناکام قرار پاتے جن کی کوششوں سے کوئی ایک شخص بھی ایمان نہ لایا۔ حضرت لوطؑ ہی کی مثال دیکھ لیجئے جن کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ "ہم نے وہاں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔" اور یہ گھر خود حضرت لوطؑ کا تھا جس میں ان کی بیوی تک عذاب کی مستحق پائی گئی۔

جماعت پر جمود کیوں طاری ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟

سوال:۔ "ایک طرف تحریک اسلامی پورے عالم میں تیزی کے ساتھ متعارف ہو رہی ہے حتیٰ کہ کمیونسٹ ممالک میں بھی اس کی گونج سنائی دے رہی ہے، دوسری طرف پاکستان میں یہ بات بہت بری طرح کھٹکتی ہے کہ یہاں جماعت کے لوگوں اور خصوصاً ارکان کے اندر جمود کی کیفیت طاری ہے اور اکثر حضرات کی کیفیت بالکل ویسی ہو چکی ہے جیسے نسلی مسلمان کی ہے یہ بات تحریک کے مستقبل کے بارے میں کسی لحاظ سے حوصلہ افزا نہیں ہے اس رجحان کو بروقت روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو خدانخواستہ آج تک کی تمام کوششوں پر پانی پھر جانے کا خطرہ ہے۔ آپ کے نزدیک اس

کیفیت کے طاری ہونے کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں اور اس کے مداوا کے لئے کون سی تدبیر موثر ہو سکتی ہے؟"

جواب :۔ اس سوال میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں جو باہم متناقض ہیں۔ ایک بات یہ کہی گئی ہے کہ تحریک اسلامی پورے عالم میں تیزی کے ساتھ متعارف ہو رہی ہے، اور دوسری بات یہ کہ پاکستان میں جماعت پر جمود طاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہاں جمود طاری ہے تو سارے عالم میں تحریک اسلامی تیزی کے ساتھ کیسے پھیل رہی ہے اور کون پھیلا رہا ہے۔ میں آغاز ہی میں اس تناقض کی طرف اس لئے توجہ نہیں دلا رہا ہوں کہ آپ کو کسی غلط قسم کی خود اعتمادی میں مبتلا کروں، بلکہ میرا مدعا آپ لوگوں کو صرف یہ احساس دلانا ہے کہ اپنے کام کا جائزہ لیتے وقت نہ مثبت پہلو میں مبالغہ سے کام لینا چاہیئے اور نہ منفی پہلو میں۔ بسا اوقات آدمی خود جامد ہوتا ہے اور اپنا جمود اسے ساری جماعت میں نظر آنے لگتا ہے بسا اوقات آدمی بہت زیادہ پرجوش ہوتا ہے اور جماعت کو جب وہ اپنی توقعات اور تمناؤں کے مطابق تیز رفتار نہیں پاتا تو کہتا ہے کہ اس پر جمود طاری ہے بسا اوقات ایک شخص اپنے ذہن میں کام کا کوئی خاص نقشہ یا تصور رکھتا ہے اور جب جماعت اس نقشے یا تصور پر کام کرتی نظر نہیں آتی تو وہ خیال کرتا ہے کہ جماعت کوئی کام نہیں کر رہی ہے۔

اس طرح کے مبالغوں سے بچتے ہوئے جماعت کے ہر فرد کو بھی اور پوری جماعت کو بھی بے لاگ جائزہ لینا چاہیئے کہ کیا فی الواقع وہ جمود میں مبتلا ہے؟ اور اگر ہے تو اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت کے لوگ اس عہد ہی کو فراموش کر گئے ہوں جو جماعت میں داخل ہوتے وقت انہوں نے اپنے خدا سے کیا تھا یہ سبب اگر خدانخواستہ واقعی موجود ہے تو ہم سب کو اور ہم میں سے ہر ایک کو سوچنا چاہیئے کہ اپنے رب کے ساتھ یہ عہد ہم نے کسی مجبوری سے کیا تھا یا برضا و رغبت؟ بے سوچے سمجھے کیا تھا یا خوب سوچ سمجھ کر پورے شعور کے ساتھ؟ کسی دنیوی غرض کے لئے کیا تھا یا اپنے ایمان کا تقاضا سمجھ کر خالص اللہ کی رضا کے لئے؟ میں نہیں سمجھتا کہ ہم میں سے کوئی شخص بھی ایسا ہو گا جس نے برضا و رغبت، پورے شعور کے ساتھ اور محض

اللہ کی رضا کے لئے ایمان کا تقاضا سمجھ کر یہ عہد نہ کیا ہو۔ پھر جب واقعہ یہی ہے تو اس راہ میں جمود کیسا؟ کیا ہمارے ایمان کے تقاضے اب بدل گئے ہیں؟ کیا اللہ کی رضا ہمیں اب مطلوب نہیں رہی؟ ہماری رائے اب یہ نہیں رہی کہ اللہ کی زمین پر اس کے دین کو قائم کرنا ہمارا مقصد ہے؟ ان سوالات کو اپنے ذہن میں رکھ کر ہم میں سے ہر شخص اگر روزانہ ایک مرتبہ بھی اپنے نفس کا جائزہ لیتا رہے تو جمود تو در کنار، اس کا تصور اور اس کا اندیشہ تک باقی نہ رہے گا۔

جمود کا دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ جماعت کو درست رکھنے کے لئے ابتدا سے محاسبہ و تنقید اور اصلاح و تطہیر کا جو طریقہ رکھا گیا تھا اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس طریقے کو مقرر کرنے کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جماعت میں جہاں بھی کوئی خرابی پیدا ہو رہی ہو، اس کا بروقت نوٹس لیا جاتے اور اسے رفع کئے بغیر نہ چھوڑا جائے۔ جو شخص بھی سست پڑ رہا ہو یا غلط روش پر چل پڑا ہو، بلا تاخیر اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے، اور اصلاح نہ ہو سکے تو اسے رخصت کر دیا جائے۔ اگر یہ کام برابر ہوتا رہے تو جماعت میں ہمیشہ تطہیر کا عمل جاری رہے گا اور اس کے اندر غلط قسم کے آدمی نہ رہنے پائیں گے۔ غلط قسم کے آدمیوں کا جماعت میں موجود ہونا بہر صورت نقصان دہ ہے وہ اگر فعال نہ بھی ہوں تو ان کی چھوت رفتہ رفتہ دوسروں کو لگتی چلی جاتی ہے اور اگر غلط ہونے کے ساتھ فعال بھی ہوں تو ان کی ساری سرگرمیاں اس کام میں صرف ہوتی ہیں کہ جس بیماری میں خود مبتلا ہیں اسے ساری جماعت میں پھیلا دیں۔ اس طرح کے آدمی جہاں بھی موجود ہوں فوراً ان کا محاسبہ کیجئے۔ پھر یا تو وہ ٹھیک ہو جائیں گے، یا انہیں جماعت سے نکلنا پڑے گا۔ جماعت کو صحت مند رکھنے کے لئے یہ عمل جاری رکھنا نہایت ضروری ہے اس میں آپ تساہل سے کام لیں گے تو آئے دن آپ کو پریشان کن مسائل سے سابقہ پیش آتا رہے گا۔

مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کیوں عذاب الٰہی میں مبتلا ہوئی؟

سوال:۔ "قانون قدرت یہ ہے کہ اصلاح کا کام کرنے والوں کو عذاب سے بچا لیا جاتا ہے

"گر مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کا سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا ہے"
جواب :- اللہ تعالیٰ نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ اقامت دین کے لئے کام کرنے والے کبھی زخمی نہیں ہوں گے کبھی شہید نہیں ہوں گے اور کبھی انہیں کسی قسم کی زک نہ اٹھانی پڑے گی۔ اگر ایسا وعدہ اللہ تعالیٰ کر چکا ہوتا تو اس کے دین کا کام کرنے کے لئے لاکھوں کروڑوں آدمی بڑے اطمینان کے ساتھ کھڑے ہو جاتے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ حق و باطل کی کش مکش میں اگر اہل حق کو جان و مال کا نقصان اٹھانا پڑے، یا وہ شکست کھا جائیں اور اہل باطل کو غلبہ نصیب ہو جائے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اہل حق پر عذاب الٰہی نازل ہوا ہے۔ جماعت اسلامی کے جو لوگ مشرقی پاکستان میں تھے انہوں نے جب دیکھا کہ ان کا ملک صریحاً کفر کی گود میں جا رہا ہے تو انہوں نے اسے روکنے کے لئے اپنی جانیں لڑا دیں، ہزاروں شہید ہوئے، ہزاروں زخمی ہوئے، اکثر تعداد گرفتار ہوئی جسے سخت اذیتیں برداشت کرنی پڑیں، اور مالی مصائب سے تو کوئی بھی نہ بچا اس کے باوجود وہ کفر کے غلبے کو نہ روک سکے یہ ان کے حق میں ہرگز عذاب الٰہی نہیں ہے، بلکہ ان کا اجر خدا کے ہاں ثابت ہے اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ان کا عمل خدا کے ہاں ضائع نہیں ہوا، بلکہ اپنی محنتوں اور قربانیوں سے انہوں نے جو بیج بوئے ہیں وہ دنیا میں بھی ضائع نہیں ہوئے وہ پھل لا رہے ہیں اور آگے جانے والوں کے پیچھے جو لوگ رہ گئے ہیں وہ خدا کے فضل سے اس فصل کو کاٹنے اور مزید فصل بونے میں لگے ہوئے ہیں، مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ وہاں لوگوں کی آنکھیں کھلنی شروع ہو گئیں اور بڑے بڑے پرجوش بنگلہ دیشیوں کا جوش بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ اب وہ جماعت کے لوگوں سے مل کر صاف صاف یہ اعتراف کر رہے ہیں کہ ہم دھوکا کھا گئے، اور صحیح بات وہی تھی جو آپ کہہ رہے تھے۔ "جماعت اسلامی" اگرچہ وہاں باقی نہیں رہی ہے[1] کیونکہ ایک سرکاری جماعت کے سوا دوسری سب جماعتیں خلاف قانون ہو چکی ہیں۔ لیکن جماعت کے لوگ موجود ہیں، وہ برابر اپنا فرض انجام دیئے جا رہے ہیں آج وہاں کے لوگوں کا رجوع ان کی طرف پہلے سے زیادہ ہے کیونکہ تجربے نے ان کو کھوٹے اور کھرے کا فرق اچھی طرح بتا دیا ہے۔

میں مشرقی پاکستان کے بارے میں یہ باتیں صرف آپ کے اطمینان کے لئے بیان نہیں

---

[1] اب اللہ کے فضل سے جماعت موجود ہے اور باقاعدہ کام کر رہی ہے

کر رہا ہوں، بلکہ اس سے بڑھ کر میرا مقصد عذاب الٰہی کے اس غلط تصور کو آپ کے ذہن سے مٹانا ہے جو اس سوال میں پایا جاتا ہے خدانخواستہ اگر کبھی ایسا وقت آ جائے کہ کفر کے ہجوم کا خطرہ پاکستان کے اس حصہ کو بھی لاحق ہو جائے تو آپ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ اصلاح کا کام کرنے والے تو عذاب الٰہی سے بچا ہی لئے جاتے ہیں، پھر جہاد کی کیا ضرورت! اور یہ غلط فہمی بھی آپ کو لاحق نہ ہو کہ اس سرزمین کو کفر کی گود میں جانے سے بچانے کے لئے اگر جماعت اسلامی کو اپنے مشرقی پاکستانی رفقاء کی طرح قربانیاں دینی پڑیں تو یہ گویا خدا کے عذاب میں مبتلا ہونا ہوگا۔ یہ دونوں باتیں سراسر غلط ہیں۔ اسلام کے گھر کو بچانے کے لئے ہمیں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینا ہوگا۔ اور یہ یقیناً جہاد فی سبیل اللہ ہوگا جس میں جان دینا شہادت ہے نہ کہ عذاب۔ اور ہمیں خدا کے فضل سے پورا اطمینان ہے کہ اگر اس راہ میں پوری جماعت بھی کٹ مرے تو خدا پرستی کے جو بیج یہاں بوتے گئے ہیں وہ ہرگز ضائع نہ ہوں گے۔

جماعت کے لئے پختہ مرکز کیوں؟

سوال:- "موجودہ حالات میں جماعت نے مرکز کی تعمیر میں بے تحاشا رقم خرچ کر کے اور پختہ عمارات بنا کر دشمنوں کے طعنوں کا راستہ کھول دیا ہے اگر یہی رقم دعوت تحریک کے کام پر خرچ کرتے تو زیادہ بہتر تھا۔"

جواب:- اس معاملے میں دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کر لیجیے۔ ایک صورت یہ ہے کہ آپ مرکز بنائیں اور کچا پکا بنا کر بیٹھ جائیں۔ اس صورت میں دو تین سال وہ چلے گا پھر بار بار اس کی مرمت کی ضرورت پیش آئے گی، اور ان مرمتوں کے اخراجات مستقل طور پر آپ کے بجٹ میں حصہ بنے رہیں گے۔ کبھی بارش کا طوفان آگیا اور آسمان کے ساتھ آپ کی چھتیں بھی برسنے لگیں تو آپ کا کتب خانہ، آپ کے دفاتر کے کاغذات اور آپ کے دوسرے سامان الگ برباد ہوں گے، اور مرمتوں کے غیر معمولی اخراجات آپ پر الگ آ پڑیں گے۔ البتہ اس کا یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ آپ اپنی غربت اور بیکسی کا نمونہ لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہیں گے۔ دوسری یہ ہے کہ اللہ کے بندوں نے اس وقت تعمیر کے لئے جو مدد دے دی ہے اس سے فائدہ اٹھا

کہ پختہ عمارتیں بنا لیجیے تاکہ ستر اسی سال بھر تعمیرات کی ضرورت پیش نہ آئے اور مرمت کے مصارف بھی بہت کم ہوں۔ ہمارے نزدیک یہ دوسری بات زیادہ بہتر ہے عمارتیں جو بنائی جا رہی ہیں وہ پختہ تو ضرور ہیں مگر انشاء اللہ بالکل سادہ ہوں گی ان میں کوئی چیز ایسی نہ ہو گی جسے آرائش و زیبائش اور شان و شوکت کے بے جا اظہار سے تعبیر کیا جا سکے۔

اقامت دین کے لئے جمہوری طریقوں ہی پر اصرار کیوں؟

سوال: "موجودہ حالات میں، جب کہ جمہوریت کے نام پر تمام جمہوری اداروں کی مٹی پلید کر دی گئی ہے، ہر قسم کی آزادی سلب کر لی گئی ہے، بنیادی حقوق کچل کر رکھ دیئے گئے ہیں، جماعت اسلامی محض جمہوری طریقوں سے اسلامی نظام کیسے قائم کر سکے گی؟ کیا اس کے سوا اور کوئی طریقہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اختیار نہیں کیا جا سکتا؟"

جواب: جن حالات کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، ان کو دیکھ کر فی الواقع بکثرت لوگ اس الجھن میں پڑ گئے ہیں کہ آیا جمہوری طریقوں سے یہاں کوئی تبدیلی لائی جا سکتی ہے یا نہیں، اور ایک اچھی خاصی تعداد یہ سمجھنے لگی ہے کہ ایسے حالات میں غیر جمہوری طریقے اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ بجائے خود ہمارے حکمرانوں کی بہت بڑی نادانی ہے کہ انہوں نے لوگوں کو اس طرح سوچنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن ہم اس پوری صورت حال کو دیکھتے ہوئے اور اس کی پیدا کردہ تمام صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بھی اپنی اس رائے پر قائم ہیں کہ اسلامی نظام، جسے برپا کرنے کے لئے ہم اٹھے ہیں، جمہوری طریقوں کے سوا کسی دوسری صورت سے برپا نہیں ہو سکتا، اور اگر کسی دوسرے طریقے سے برپا کیا بھی جا سکے تو وہ دیرپا نہیں ہو سکتا۔

اس معاملے کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے آپ جمہوری طریقوں کا مطلب واضح طور پر جان لیں۔ غیر جمہوری طریقوں کے مقابلے میں جب جمہوری طریقوں کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ نظام زندگی میں جو تبدیلی بھی لانا، اور ایک نظام کی جگہ جو نظام قائم کرنا مطلوب ہو، اسے زور زبردستی سے لوگوں پر مسلط نہ کیا جائے بلکہ عامۃ الناس کو سمجھا کر اچھی طرح مطمئن کر کے انہیں ہم خیال بنایا جائے اور ان کی تائید

سے اپنا مطلوبہ نظام قائم کیا جائے۔ اس کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ عوام کو اپنا ہم خیال بنا لینے کے بعد غلط نظام کو صحیح نظام سے بدلنے کے لئے ہر حال میں صرف انتخابات ہی پر انحصار کر لیا جائے۔ انتخابات اگر ملک میں آزادانہ و منصفانہ ہوں اور ان کے ذریعے سے عام لوگوں کی رائے نظام کی تبدیلی کے لئے کافی ہو، تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں۔ لیکن جہاں انتخابات کے راستے سے تبدیلی کا آنا غیر ممکن بنا دیا گیا ہو، وہاں جباروں کو ہٹانے کے لئے رائے عامہ کا دباؤ دوسرے طریقوں سے ڈالا جا سکتا ہے اور ایسی حالت میں وہ طریقے پوری طرح کارگر بھی ہو سکتے ہیں جب کہ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی بھاری اکثریت اس بات پر تل جائے کہ جباروں کا من مانا نظام ہرگز نہ چلنے دیا جائے گا اور اس کی جگہ وہ نظام قائم کر کے چھوڑا جائے گا جس کے صحیح و برحق ہونے پر لوگ مطمئن ہو چکے ہیں۔ نظام مطلوب کی مقبولیت جب اس مرحلہ تک پہنچ جائے تو اس کے بعد غیر معقول نظام کو عوامی دباؤ سے بدلنا قطعاً غیر جمہوری نہیں ہے، بلکہ ایسی حالت میں اس نظام کا قائم رہنا سراسر غیر جمہوری ہے۔

اس تشریح کے بعد آپ کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ رہے گا کہ ہم اسلامی نظام برپا کرنے کے لئے جمہوری طریقوں پر اس قدر زور کیوں دیتے ہیں کوئی دوسرا نظام مثلاً کمیونزم لوگوں پر زبردستی ٹھونسا جا سکتا ہے، بلکہ اس کے قیام کا ذریعہ ہی جبر اور جباریت ہے، اور خود اس کے آئمہ اعلانیہ یہ کہتے ہیں کہ انقلاب بندوق کی گولی ہی سے آتا ہے۔ استعماری نظام اور سرمایہ داری نظام اور فسطائی نظام بھی رائے عامہ کی تائید کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ رائے عامہ کو طاقت سے کچل دینا اور اس کا گلا گھونٹ دینا ہی ان کے قیام کا ذریعہ ہے۔ لیکن اسلام اس قسم کا نظام نہیں ہے وہ پہلے لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کرنا ضروری سمجھتا ہے، کیونکہ ایمان کے بغیر لوگ خلوص کے ساتھ اس کے بتائے ہوئے راستوں پر چل نہیں سکتے۔ پھر وہ اپنے اصولوں کا فہم اور ان کے برحق ہونے پر اطمینان بھی عوام کے اندر ضروری حد تک اور خواص (خصوصاً کارفرماؤں) میں کافی حد تک پیدا کرنا لازمی سمجھتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر اس کے اصول و احکام کی صحیح تنفیذ ممکن نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ عوام و خواص کی ذہنیت، انداز فکر، اور سیرت و کردار میں بھی اپنے مزاج کے مطابق تبدیلی لانے کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ یہ نہ ہو تو اس کے پاکیزہ اور بلند پایہ اصول

واحکام اپنی صحیح روح کے ساتھ نافذ نہیں ہو سکتے۔ یہ جتنی چیزیں میں نے بیان کی ہیں، اسلامی نظام کو برپا کرنے کے لئے سب کی سب ضروری ہیں، اور ان میں سے کوئی چیز بھی جبراً لوگوں کے دل ودماغ میں نہیں ٹھونسی جا سکتی، بلکہ ان میں سے ہر ایک کے لئے ناگزیر ہے کہ تبلیغ، تلقین اور تفہیم کے ذرائع اختیار کر کے لوگوں کے عقائد و افکار بدلے جائیں، ان کے سوچنے کے انداز بدلے جائیں، ان کی اقدار (VALUES) بدلی جائیں، ان کے اخلاق بدلے جائیں، اور ان کو اس حد تک ابھار دیا جائے کہ وہ اپنے اوپر جاہلیت کے کسی نظام کا تسلط برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ جمہوری طریقوں کے سوا اس کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام کو عملاً برپا کر دینے کے لئے کوئی اقدام اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک اس مقصد کے لئے کام کرنے والوں کو اس نوعیت کی عوامی تائید حاصل نہ ہو جائے۔

شاید آپ میری یہ باتیں سن کر سوچنے لگیں گے کہ اس لحاظ سے تو گویا ابھی ہم اپنی منزل کے قریب ہونا درکنار، اس کی راہ صرف ابتدائی مرحلوں میں ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اپنے آج تک کے کام کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔ جمہوری طریقوں سے کام کرتے ہوئے آپ پچھلے ۳۴ سال میں تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہیں، اور یہ لوگ ہر شعبہ زندگی میں موجود ہیں نئی نسل، جو اب تعلیم پا کر اٹھ رہی ہے اور جسے آگے چل کر ہر شعبۂ زندگی کو چلانا ہے۔ وہ بھی جاہلیت کے علمبرداروں کی ساری کوششوں کے باوجود زیادہ آپ کی ہم خیال ہے اب آپ کے سامنے ایک کام تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے ہم خیالوں کی تعداد اسی طرح بڑھاتے چلے جائیں اور دوسرا کام یہ ہے کہ عوام کے اندر بھی نفوذ کر کے ان کو اسلامی نظام برپا کرنے کے لیئے زیادہ سے زیادہ تیار کرنے کی کوشش کریں۔ پہلے کام کے لئے لٹریچر کا پھیلانا آج تک جتنا مفید ثابت ہوا ہے اس سے بدرجہا زیادہ آئندہ مفید ثابت ہو سکتا ہے، اگر آپ اپنے ہم خیال اہل علم کے حلقے منظم کر کے مختلف علوم کے ماہرین سے مسائل حیات پر تازہ ترین اور محققانہ لٹریچر تیار کرانے کا انتظام کریں اور ذہن

کام کے لئے تبلیغ وتلقین کے دائرے وسیع کرنے کے ساتھ اصلاحِ خلق اور خدمتِ خلق کی ہر ممکن کوشش کیجئے۔ آپ صبر کیساتھ لگاتار اس راہ میں جتنی محنت کرتے چلے جائیں گے اتنی ہی آپ کی منزل قریب آتی چلی جائے گی۔

رہا یہ سوال کہ جب تمام جمہوری اداروں کی مٹی پلید کردی گئی ہے شہری آزادیاں سلب کرلی گئی ہیں اور بنیادی حقوق کچل کر رکھ دیئے گئے ہیں تو جمہوری طریقوں سے کام کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام کا کام کرنے کے لئے کھلی ہموار شاہراہ تو کبھی نہیں ملی ہے یہ کام تو جب بھی ہوا جبر وظلم کے مقابلے میں ہر طرح کی سخت قربانیاں جھیل کر ہی ہوا۔ اور وہ لوگ کبھی یہ کام نہ کرسکے جو یہ سوچتے رہے کہ جاہلیت کے علمبرداروں کی اجازت یا ان کی عطا کردہ سہولت ملے تو وہ راہِ خدا میں پیش قدمی کریں آپ جن برگزیدہ ہستیوں کے نقشِ پا کی پیروی کر رہے ہیں انہوں نے اس ماحول میں یہ کام کیا تھا جہاں جنگل کا قانون نافذ تھا۔ اور کسی شہری آزادی یا بنیادی حق کا تصور تک موجود نہ تھا۔ اس وقت ایک طرف دل موہ لینے والے پاکیزہ اخلاق، دماغوں کو مسخر کرلینے والے معقول دلائل، اور انسانی فطرت کو اپیل کرنے والے اصول اپنا کام کر رہے تھے اور دوسری طرف جاہلیت کے پاس ان کے جواب میں پتھر تھے۔ گالیاں تھیں، جھوٹے بہتان تھے۔ اور کلمۂ حق کہتے ہی انسانوں کی شکل میں درندے خدا کے ہر بندے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ یہی چیز درحقیقت اسلام کی فتح اور جاہلیت کی شکست کا ذریعہ بنی۔ جب ایک معقول اور دل لگتی بات کو عمدہ اخلاق کے لوگ لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور سخت سے سخت ظلم وستم سہنے کے باوجود اپنی بات ہر حالت میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے چلے جائیں تو لازمی طور پر اس کے تین نتائج رونما ہوتے ہیں۔ ایک نتیجہ یہ کہ اس صورتِ حال میں بہت زیادہ باہمت اور اولوالعزم لوگ ہی اس دعوت کو علانیہ قبول کرتے ہیں۔ اور وہ اس کے لئے ایسا قیمتی سرمایہ ثابت ہوتے ہیں جو کسی دوسری صورت میں بہم نہیں پہنچ سکتا۔ دوسرا نتیجہ یہ کہ ظالموں کی پیدا کردہ اس خوفناک فضا میں بکثرت بلکہ بے اندازہ لوگ اس دعوت

کو دل میں مان لیتے ہیں۔ مگر آگے بڑھ کر اس میں شامل نہیں ہوتے مخالف طاقت آخر کار اس کا خود نقصان اٹھاتی ہے۔ اس قطعی اور حتمی شکست ہونے تک کبھی یہ پتہ ہی نہیں چلنے پاتا کہ جس دعوت کو مٹا دینے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے اس کے حامی کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ اس کی اپنی صفوں تک میں موجود ہوتے ہیں۔ اور وہ ان سے بے خبر رہتی ہے تیسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اخلاقی برتری اور دعوت کی معقولیت وصداقت اپنی فطری طاقت سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے دشمن اس کے پیروؤں پر جتنا زیادہ ظلم کرتے ہیں۔ اتنے ہی وہ ہر شریف النفس اور نیک طبع انسان کی نظر سے گرتے جاتے ہیں۔ اس کے پیرو جتنی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ ظلم برداشت کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اپنی حق پرستی سے بال برابر بھی نہیں ہٹتے اتنی ہی ان کی قدر ومنزلت عام دیکھنے والوں ہی میں نہیں۔ بلکہ خود دشمنوں کی صفوں میں بھی بڑھتی چلی جاتی ہے اور پھر جب فیصلہ کن مقابلوں کا وقت آتا ہے تو قدم قدم پر ان لوگوں کی صدمہا یان طرح طرح سے کام آتی ہیں۔ جو دشمنوں کے جبر کی وجہ سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر دل سے اس دعوت کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ آخر کار چند مٹھی بھر ہٹ دھرم دشمن ہی میدان میں رہ جاتے ہیں جن کا ساتھ دینے والا تو در کنار۔ ان کے پیچھے رونے والا بھی کوئی نہیں ہوتا ظلم وجور کا ماحول جہاں بھی ہو اس کے مقابلے میں حق پرستی کا علم بلند کرنے اور بلند رکھنے سے یہ تینوں نتائج لازماً رونما ہوں گے اس لئے یہ تو حق کی کامیابی کا فطری راستہ ہے آپ اسلامی نظام برپا کرنے کے لئے جمہوری اداروں کی مٹی پلید ہونے اور شہری آزادیاں سلب ہو جانے اور بنیادی حقوق کچل دیئے جانے کا رونا خواہ مخواہ روتے ہیں۔

جب تمام جمہوری اور آئینی راستے بند ہو جائیں تو؟

سوال:-

پہلا سوال یہ ہے کہ ملک میں سیاسی تبدیلی کے تمام جمہوری اور آئینی راستے بند کئے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اسلامی نظام برپا کرنے کی کیا شکل ہے؟

جواب:-

جو شخص بھی اسلام کے لئے کام کرنے اٹھے اس کو چاہیئے کہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی تاریخ کا ضرور مطالعہ کرے۔ جو حالات اس وقت پائے جاتے ہیں اس سے بدرجہا زیادہ بدتر حالات اس وقت پائے جاتے تھے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ آج تو آپ کو سابقہ پیش آتا ہے پولیس اور فیڈرل پولیس اور اس کے بعد فوج سے یا ان غنڈوں سے جو پالتو درندوں کی طرح اسی غرض کے لئے پالے گئے ہیں کہ جو شخص یہاں کام کرنے اٹھے اسے بھنبھوڑنے کے لئے دوڑیں۔ لیکن جب اسلام کی دعوت کا آغاز ہوا تو اس وقت سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اسلام قبول کرنے والوں کے اپنے بھائی بند، اپنے سگے بھائی، اپنے سگے باپ، اپنے قریب ترین رشتہ دار اپنے قبیلے کے لوگ سب ظلم و ستم پر اتر آئے تھے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضؓ اور حضرت طلحہ رضؓ کو ایک ساتھ باندھ دیا گیا حضرت زبیر رضؓ کے ساتھ ظلم و ستم کیا گیا اسی طرح جن دوسرے لوگوں نے ابتداء میں اسلام قبول کیا ان کے پہلے دشمن اور سخت ترین دشمن ان کے اپنے گھر کے لوگ تھے ان کے گھر کے لوگوں نے ان کو اتنا ستایا کہ آخر کار ان میں سے کثیر تعداد کو اپنا ملک چھوڑ کر حبش کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ گھروں میں ان کا رہنا مشکل ہو گیا تھا سڑکوں پر ان کا نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان کا بات کرنا مشکل ہو گیا تھا لیکن اللہ کا دین اس وقت بھی پھیل رہا تھا اور کوئی طاقت اللہ پہ ایمان لانے والوں کے دلوں کو مرعوب نہیں کر سکی۔ اور ان کا راستہ نہیں روک سکی اگر اس تاریخ کو آپ پیش نظر رکھیں تو اس کے بعد اس وقت جو رکاوٹیں پائی جاتی ہیں ان رکاوٹوں سے آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم نے جب اس تحریک کا آغاز کیا تھا تو ہمیں اندازہ اس سے بہت زیادہ سخت رکاوٹوں کا تھا ہمیں اندازہ یہ تھا کہ ہمارا زمین پر جینا اور سانس لینا مشکل کر دیا جائے گا اور اس وقت ہم نے اس تحریک کو شروع کیا تھا اس ارادے کے ساتھ (مولانا محترم نے اس مقام پر ذرا توقف کیا اور اللہ سے دُعا کی کہ اللہ تعالے ہمارے اس ارادے کو پورا کرے۔ جواب میں لوگوں نے بآواز بلند آمین کہی) کہ جان جس کی دی ہوئی ہے اس کی راہ میں چلی جائے تو کوئی پرواہ نہیں۔ رزق دینے کا جس نے وعدہ کیا ہے جب تک وہ چاہے گا رزق دے گا۔ خواہ وہ کسی راستے سے دے لیکن وہ رزق بہر حال دے گا۔ رزق چھیننے والے اگر اپنے آپ کو رزاق سمجھتے ہیں تو جھوٹے ہیں ان کو روکنے سے اللہ کا دیا ہوا رزق رکنے والا نہیں ہے تو ہم اپنی جگہ سے بہت بدتر حالات کے لئے تیار ہو کر اٹھے تھے اور اللہ کا شکر ہے کہ جن بدتر حالات کا ہم نے اندازہ کیا تھا ابھی تک وہ پیش نہیں آئے۔ اس لئے :-

میں آپ سے صرف ایک کہوں گا آپ یہ تدبیریں سوچنے کی فکر چھوڑیں کہ ان سیاسی حالات میں اور ان پابندیوں میں جو اس وقت پیش آرہی ہیں کیسے کام کیا جائے یہ فکر چھوڑ کر آپ اپنے اس عزم کو تازہ کریں کہ اگر پہاڑ بھی ہمارے راستے میں آسے تو ہم اس کے اندر بھی سرنگ کھود یں گے اس عزم کے ساتھ آپ اپنا کام کریں کہ جو طاقت بھی راستے میں حائل ہو اس کے ہوتے ہوئے ہم اپنا کام کرکے رہیں گے۔

ضرورت باہر کے حالات سازگار ہونے کی نہیں ہے ضرورت اندر کے عزم اور ایمان اور ارادے کے پختہ ہونے کی ہے اگر وہ پختہ ہو تو باہر کے حالات خواہ کیسے ہی ہوں آخر کار ان کے اندر سے آپ اپنا راستہ نکال ہی لیں گے لیکن یہ بات اس سے پہلے بھی بارہا کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ اسلام کا کام کرنے والوں کے لئے یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ وہ اندھا دھند کام کریں ان کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ حکمت کے ساتھ کام کریں عقل سے کام لیں عقل سے کام لے کر دیکھیں کہ جو رکاوٹیں ہیں وہ کس نوعیت کی ہیں اس کے بعد یہ دیکھیں کہ ان رکاوٹوں کے اندر سے ہم اپنا راستہ کیسے نکال سکتے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۶۳ء میں جب ہم نے اجتماع عام کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت ہمارے لئے کیا کیا رکاوٹیں کھڑی کی گئیں جگہ ہم کو نہیں دی جارہی تھی بڑی مشکل سے ایک ایسی جگہ ملی جو ہر لحاظ سے اس اجتماع کے لئے غیر موزوں تھی۔ عین وقت پر لاؤڈ سپیکر ہمارے لئے ممنوع کر دیا گیا ہمارے لئے نہ صرف پولیس بلکہ فوج تک کو تیار رہنے کا حکم دیا گیا کہ اگر کوئی حرکت کریں تو ان کو یہیں ختم کر دیا جائے شراب پلا کر غنڈے تیار کر لئے گئے تھے کہ وہ ہمارے کیمپ پر حملہ آور ہوں اور وہ ہوئے اور نہ صرف یہ کہ انہوں نے مردوں کے حصے پر حملہ کیا بلکہ عورتوں کے اجتماع کے لئے جو الگ کیمپ تیار کیا گیا تھا اس کے اوپر بھی حملہ کیا اور اس کے اندر انہوں نے بوتلیں پھینکیں اور پتھر پھینکے یہ سب کچھ

کیا گیا اور اس اجتماع سے پہلے ہمارے خلاف پراپیگنڈے کی ایک زبردست مہم چلائی تاکہ روزانہ لوگوں کے دلوں میں ہمارے خلاف نفرت، غصے اور غضب کا زہر بھر کیا جائے یہ سب کچھ پرانی بات نہیں ہے تازہ بات ہے لیکن آپ کو یاد ہے کہ ہم نے اجتماع بھی کیا اور اس اجتماع میں گڑبڑ بھی ہوئی اور ہمیں اشتعال دلانے کے لئے جو کچھ کیا جا سکتا تھا وہ کیا گیا یہاں تک کہ قرآن کی توہین کی گئی۔ یہاں تک کہ عورتوں کے اجتماع کے اوپر پتھر بھی پھینکے گئے ہمارے ایک بیش قیمت کارکن کو دن دہاڑے ہماری آنکھوں کے سامنے شہید کیا گیا خود میری طرف نشست باندھ کر گولی چلائی گئی لیکن کیا ہمارا کام رُک گیا؟ ہمارا کام رکا نہیں بلکہ جو کچھ تدبیریں انہوں نے کی تھیں وہ کام کے اور بڑھنے کا وسیلہ بنیں، کیوں؟ اس لئے کہ ہم نے ٹمپر لوز نہیں کیا ہم نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا اور قابو میں رکھ کر جب دیکھا کہ پہاڑ اس طرف سے حائل ہے تو ہم نے بہتے ہوئے پانی کی طرح دوسری طرف سے اپنا راستہ نکال دیا۔

اسی طرح اگر اب بھی آپ حکمت سے کام لیں تو اس وقت جتنی رکاوٹیں پائی جاتی ہیں ان رکاوٹوں کے باوجود آپ کام کر سکتے ہیں۔ ضرورت آپ کے ارادے کی ہے ضرورت اس کی نہیں کہ آپ کا دشمن آپ کو راستہ دے۔ دشمن راستہ کب دیا کرتا ہے دشمن تو راستہ روکا ہی کرتا ہے۔ لیکن جس کو چلنا ہوتا ہے اس کے اندر عزم موجود ہو اور عزم کے ساتھ اس کے اندر حکمت اور دانائی بھی موجود ہو تو وہ اپنا راستہ نکال لیتا ہے تفصیلات میں اس لئے نہیں جاتا کہ تفصیلات آپ کو معلوم ہیں کہ رکاوٹیں کیا ہیں اس لئے میں ان کو بیان کرنے کی حاجت نہیں سمجھتا۔

میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ خیال آپ کے ذہنوں سے نکال دیا جائے کہ کسی قسم کی رکاوٹیں اللہ کے دین کا راستہ روک سکتی ہیں کبھی کسی زمانے میں یہ رکاوٹیں کامیاب نہیں ہو سکی ہیں اور اس زمانے میں بھی انشاء اللہ نہیں ہو سکیں گی۔

سوال۔

کیا اسلامی نظام واقعی قابلِ عمل ہے۔؟

پاکستان اور مشرقِ وسطیٰ میں اسلام کے نام لیواؤں کا جو حشر ہو رہا ہے اس سے نئی نسل میں اسلام کے کامیاب نظامِ زندگی اور راہِ حق میں ہونے کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ آیا یہ نظام واقعی قابلِ عمل اور کامیاب ہو سکتا ہے؟

جواب :۔

اس سوال کا جواب خود اس کے اندر موجود ہے۔ سوال کی ابتدا اس طرح کی گئی ہے۔ کہ پاکستان اور مشرق وسطیٰ میں اسلام کے نام لیواؤں کا حشر ایسا ہی ہوا کرتا ہے جیسا کہ اب ہو رہا ہے اگر حقیقت میں پاکستان اور مشرق وسطیٰ میں سچے مسلمان ہوتے تو ان سے ہندوستان ڈرتا۔ ان سے روس ڈرتا۔ ان سے امریکہ ڈرتا دنیا کی تمام باطل پرست قوتیں کانپتی اور لرزتیں ان کے نام سے۔ لیکن چونکہ یہاں نام لیوا پائے جاتے ہیں "کام کردا" نہیں پائے جاتے، اس وجہ سے وہی حالت ہے جو اس وقت پائی جاتی ہے۔ جب یہ صورت ہے تو آپ کے مایوس ہونے کی کیا وجہ ہے ؟ اگر اسلام کے متعلق حقیقت میں کام کیا جا رہا ہوتا اور اسلام کے ساتھ حقیقت میں دلی اور دماغی تعلق موجود ہوتا اور اس صورت میں اسلام کامیاب نہ ہوتا تو البتہ آپ یہ سوال کر سکتے تھے کہ اسلام کے قابلِ عمل ہونے کے متعلق شبہات پیدا ہو رہے ہیں پس ہماری کوشش ہے کہ جو نام لیوا ہیں وہ فی الواقع نام لیوا نہ رہیں بلکہ وہ حقیقت میں اسلام کے لئے کام کرنے والے ہوں۔ ان کے اندر اسلام کے لئے عزم اور ایمان پایا جاتا ہو ان کا عمل اسلام کے مطابق ہو اور وہ اسلام کے لئے جینے اور مرنے کا عزم لے کر اٹھیں اس کے بعد پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام قابلِ عمل ثابت ہوتا ہے کہ نہیں۔ قابلِ عمل تو اس وقت وہ چیزیں بھی ہو جایا کرتی ہیں کہ جنہیں حقیقت میں عقل کہتی ہے کہ ناقابلِ عمل ہیں لیکن جب ان کو لے کر کوئی ایسا گروہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو مرنے اور مارنے کو تیار ہو

اور جو ہر قسم کے مصائب برداشت کرنے کے لئے تیار ہو۔ تو اس کو بھی کامیاب کر کے دکھا دیتے ہیں کیا کہ وہ چیز جو قابلِ عمل ہے یا قابلِ عمل ثابت ہو چکی ہے جس کے اوپر عمل بھی کیا جا چکا ہے جس کی تاریخ شاہد ہے کہ جب وہ قابلِ عمل ہوا تو دنیا رحمتوں اور برکتوں سے بھر گئی اس کے بارے میں اب شبہے کا کیا موقع ہے۔ شبہ اپنے بارے میں پیدا ہوتا ہے کہ ہم اسلام کے نام لیوا کیسے ہیں۔

سوال:۔

پاکستان میں اسلامی نظام کے امکانات

عوام میں اس وقت اخلاقی دینی اور ملی قدروں کو بیخ دین سے اکھاڑنے کی جو مہم چل رہی ہے اس کی موجودگی میں پاکستان اور اسلامی نظام قائم کرنے کے کیا امکانات ہیں۔

جواب:۔

دینی علم رکھنے والے لوگ اس بارے میں روز بروز مایوسی کا شکار ہوتے جا رہے ہیں یہ ایک عجیب صورتِ حال ہے کہ اگر آپ دیکھ رہے ہوں کہ آپ کے گرد وپیش وبائیں پھیل رہی ہیں، لوگ کثرت سے مر رہے ہیں، پانی اور ہوا سب زہریلے ہو چکے ہیں تو اس صورت میں آدمی کے اوپر دو ہی قسم کے ردِ عمل ہو سکتے ہیں ایک ردِ عمل یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مایوس ہو کر لیٹ جائے اور فیصلہ کرے کہ جو وبا چل رہی ہے ایک روز اس وبا کا زہر میرے اندر بھی اثر کر جائے گا میں مر جاؤں گا اور میرے پیچھے بھی مر جائیں گے اور ایک ردِ عمل یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اٹھ کھڑا ہو اور ہوا اور پانی کی جو زہر آلودگی ہے اسے ختم کرنے کے لئے زور لگائے قطع نظر اس کے کہ کامیاب ہو یا نہ ہو اس سے بحث نہیں کہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں ہوتا اس سے بحث نہیں کہ وہ وبا ختم ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ اس سے بحث نہیں کہ اس وبا میں آپ خود زندہ رہتے ہیں یا نہیں لیکن اگر آپ نے اپنی طرف سے کوشش کا حق ادا

کیا ہے تو اس صورت میں آپ کے اندر عزم رہے گا۔ مرتے وقت تک بھی یہ قوت آپ کے اندر موجود رہے گی کہ اگر ذرا سا بھی موقع مل جائے اور کچھ مزید طاقت فراہم ہو جائے تو اسے بھی صرف کر کے زہریلی آب وہوا کو درست کرنے کی کوشش کروں میں اس مایوسی کی کوئی وجہ نہیں سمجھتا، میں یہ سمجھتا ہوں کہ جتنے بُرے حالات ہوں اتنا ہی زیادہ ہمارا عزم تیز ہونا چاہیئے۔ جتنے زیادہ لوگوں کے اندر خرابی پھیل رہی ہے آپ کا کام ہے کہ اس خرابی کو دُور کرنے کے لئے اپنا حق ادا کردیں یہ وہی اصحاب سبت والا قصہ ہے جو قرآن مجید میں آیا ہے کہ اصحاب سبت نے جب قانون کو توڑنا شروع کردیا اور علانیہ توڑنا شروع کردیا تو کچھ لوگ ان میں ایسے تھے جو خود سبت کے احکام کی پابندی کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ بھائی ان لوگوں کو سمجھانے سے کیا حاصل یہ تو ماننے والے نہیں ہیں یہ سبت کا قانون توڑتے رہیں گے کیوں اپنی قوت صرف کرتے ہو مگر دوسرے لوگ جو اصحاب سبت کو روکنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ اس لئے ہم کام کر رہے ہیں چاہے یہ رکیں یا نہ رکیں ہم اپنے خدا کے سامنے اپنی معذرت تو پیش کر دیں گے۔ کہ آخر وقت تک ہم نے اپنا زور لگایا اور قرآن مجید کہتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کوشش کی تھی کہ ان کو آخر وقت تک روکیں اللہ تعالےٰ نے عذاب سے انہیں کو بچایا۔

یہی صورت حال اس وقت موجود ہے اس صورت حال میں مایوس ہونے کے معنے ہیں کہ آپ خود گناہ میں شامل ہو رہے ہیں اس صورت میں آپ کا یہ کام ہے کہ اس بڑی حالت کو جو پیدا ہو گئی ہے اس کو روکنے اور بدلنے کے لئے اپنا سارا زور لگا دیں چاہے وہ رکے یا نہ رکے، بدلے یا نہ بدلے اس سے کچھ بحث نہیں۔ بحث یہ ہے کہ آپ اپنے خدا کے سامنے وہاں معذرت پیش کرنے کے قابل ہوں۔ (۲۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء عید ملن کے موقع پر)

حکمت اور موعظۃ الحسنہ

سوال:۔

حکمت اور موعظۃ الحسنہ کے وہ کیا کیا پہلو ہیں جو دین کی دعوت دیتے وقت ایک داعی کے پیشِ نظر رہنے چاہئیں؟

جواب۔

اس چیز کو میں نے بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف مواقع پر بیان کیا ہے۔ اچھا ہو کہ آپ اس کو میری کتابوں میں پڑھ لیں۔ میں یہاں مختصر طور پر آپ کو دو باتیں بتاؤں گا حکمت کیا چیز ہے اور موعظۃ الحسنہ کیا چیز ہے۔

حکمت یہ ہے کہ آپ جب کام کرنے اٹھیں تو اپنی تحریک کے نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم کس وقت کس زمانے میں اور کن حالات میں کام کر رہے ہیں۔ تحریک کے نقطۂ نظر سے جائزہ لینے سے مراد یہ ہے کہ آپ اس لحاظ سے دیکھیں کہ آپ جو کام کرنے اٹھے ہیں اس کام کے لحاظ سے اس وقت اس زمانے میں کون سی چیزیں اس مقصد کے لئے مددگار ہیں۔ ان کا ٹھیک ٹھیک آپ حساب لگائیں، کہ وہ کس حد تک مددگار ہیں اور کس کس پہلو سے مددگار ہیں۔

جو چیزیں مانع ہیں ان کا اس پہلو سے جائزہ لیں کہ ان کی وسعت کیا ہے ، کس پیمانے پر پھیلی ہوئی ہیں ، ان کی پشت پر کونسی قوتیں کام کر رہی ہیں ، ان کا پس منظر کیا ہے ، کہاں سے یہ آ رہی ہیں ، ان کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے ۔ یہ حکمت ہے ۔ ایک آدمی جو حکیم ہو وہ سب سے پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کرے گا کہ میں کس زمانے میں اور کن حالات میں کام کر رہا ہوں ۔ مثال کے طور پر ایک حکیم جب یہاں دعوتِ دین لے کر اٹھے گا تو وہ یہ دیکھے گا کہ کتنا کچھ مصالحہ گرد و پیش میں موجود ہے جو اس کے لئے مددگار ثابت ہو سکتا ہے ۔

مثلاً اسلام کو ماننے والی سوسائٹی ہے یا اسلام کی مخالف سوسائٹی ہے ، اسلام کی منکر سوسائٹی ہے یا اسلام کی دشمن اور مزاحمت کرنے والی سوسائٹی ہے وغیرہ وغیرہ ۔ ایک آدمی جو اسلام کی سخت مخالف اور دشمن سوسائٹی میں ہو وہ کوئی اور طریقِ کار اختیار کرے گا ۔ ایک شخص جو اسلام کی منکر لیکن بے حس سوسائٹی میں ہو وہاں کوئی اور راستہ اپنائے گا اور اسلام کو ماننے والی سوسائٹی میں بالکل مختلف طریقِ کار اختیار کرے گا ۔ وہ آدمی بالکل کم فہم ہوگا جو مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بداخلاقیوں یا ان میں پائے جانے والے تساہل کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ یہاں تو اسلام برائے نام ہے اور یہ سوسائٹی تو اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور نتیجتاً اسی احساسِ غلط کے نتیجے میں وہ ایسا کام کرنا شروع کر دے جو مثلاً کفار کے اندر کرنے کا ہے ۔

اسی طرح ایک داعی کو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کون سی قوتیں یہاں اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں ۔ اور ان کے محرکات کیا ہیں ؟ ان کے افکار کی بنیادیں کیا ہیں ۔ ان کا فلسفہ کیا ہے ، ان ساری چیزوں کا جائزہ لینا اس لئے ضروری ہے کہ اسے ان کا مقابلہ کرنا ہے ۔ مثال کے طور پر ایک آدمی جو پہلوان سے کشتی لڑنے جا رہا ہو وہ پہلے یہ دیکھے گا کہ یہ پہلوان کتنا طاقتور ہے ، اس کا وزن کتنا ہے ؟ اس کی طاقت کا کیا حال ہے ؟ اس کے مقابلہ میں مجھے کس قدر طاقت فراہم کرنی چاہیئے تب میں جا کر اس سے کشتی لڑوں ۔ دوسرے کی طاقت کا

اندازہ لگائے بغیر اکھاڑے میں اترنے والا آپ سے آپ پچھڑ جائے گا۔

اس کے ساتھ پھر حکمت کا ہی یہ تقاضا ہے کہ لائن آف ایکشن (LINE OF ACTION) ایسی اختیار کی جائے جو زیادہ سے زیادہ موجود مواد کو استعمال کرنے کے لئے موزوں ہو اور جو طاقتیں مزاحم ہیں ان کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ طاقت فراہم کی جائے یعنی ایسی لائن آف ایکشن اختیار کرے کہ ان کا زور کم سے کم وقت میں آسانی کے ساتھ توڑ دے۔ میرے نزدیک مختصراً حکمت کا مفہوم یہی کچھ ہے۔

موعظہ حسنہ

دوسری چیز موعظہ حسنہ ہے۔ موعظہ حسنہ میں دو چیزیں خاص طور پر اپنی اہمیت رکھتی ہیں گو اس کے دوسرے اور پہلو بھی ہیں پہلی چیز یہ ہے کہ نصیحت، دعوت اور تبلیغ کرنے کا ایسا طریقہ استعمال کیا جائے جو دوسرے شخص کے اندر ضد پیدا نہ کرے دوسرے شخص میں کد اور غصے کے جذبات نہ ابھریں۔ دوسرے شخص سے آپ اس طرح اپیل کریں کہ اگر اس کی فطرت میں ذرہ برابر بھی کوئی بھلائی موجود ہو تو وہ متاثر ہو جائے اور اگر اس کے اندر کوئی کجی اور ٹیڑھ ہو تو اس کو اور زیادہ کام کرنے کا موقع ملے۔ اس معاملہ میں ایک مرتبہ امام ابو حنیفہؒ نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی۔ امام ابو حنیفہؒ ایک زمانے میں بہت بڑے متکلم تھے اور مناظرے کیا کرتے تھے ان کا اپنا بیان ہے کہ میں بصرہ میں جا کر ٹھہرتا تھا۔ اور وہاں کے مختلف گمراہ فرقوں سے مناظرے کیا کرتا تھا۔ بعد میں ان کے اپنے صاحب زادے کو بھی علم کلام سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ بھی مناظرے کرنے لگے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اپنے لڑکے کو مناظرے کرنے سے روکا۔ صاحبزادے نے کہا ابا جان آپ بھی تو پہلے مناظرے کیا کرتے تھے۔ آپ آخر آج مجھے کیوں روک رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہم جب مناظرے کیا کرتے تھے تو یہ سمجھتے ہوئے کرتے تھے کہ جیسے ایک آدمی کے کندھے پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا ہے اور کہیں ہم کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ یہ پرندہ اڑ جائے ساسی

پرندہ کو تو ہمیں پکڑنا ہے۔ اتنی احتیاط کے ساتھ ہم مناظرہ کرتے تھے" اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ جتنا کچھ ایمان ایک شخص میں موجود ہے مناظرے کا مقصد اس کو بڑھانا ہوتا تھا، نہ کہ جتنا کچھ ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔ انہوں نے کہا کہ تم لوگ اتنی بے دردی سے مناظرہ کرتے ہو کہ جتنا کچھ ایک آدمی دین سے دُور ہے تمہارے مناظرے کی بدولت اس سے بھی زیادہ دُور چلا جاتا ہے۔

پس موعظہ حسنہ یہ ہے کہ آپ دعوت و تبلیغ کا ایسا طریقہ اختیار کریں کہ جو دوسرے شخص کو زیادہ سے زیادہ اپیل کرے اس کے اندر ضد پیدا نہ کرے اس کو اور زیادہ دُور نہ پھینک دیں، زبان اور طرز بیان ایسا ہونا چاہیئے کہ آپ کو لوگوں سے قریب کرے اور ان کو آپ سے مانوس کرے نہ کہ ان کے دلوں میں آپ کے خلاف نفرت اور غصہ پیدا ہو۔

دوسری چیز جو موعظہ حسنہ کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آپ کسی شخص کو نصیحت کرنے اور اس کو سمجھانے کی سعی کرنے سے پہلے یہ جانیں کہ اس کی گمراہی کی پشت پر کیا چیز ہے اس کی گمراہی کے کیا کیا محرکات ہیں پھر اس کو ایسے طریقے سے سمجھائیں جو اس کے دماغ اور دل دونوں کو متاثر کرنے والا ہو۔ اگر وہ ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہے تو اس کی ذہنی الجھنیں آپ رفع کرنے کی پہلے کوشش کریں۔ پھر معقول دلائل کے ساتھ اسے مطمئن کرنے کی کوشش کریں، اگر کوئی شخص کسی ذاتی بگاڑ میں مبتلا ہے تو اس کے جذبات کو اپیل کریں اور ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے اس کے جذبات میں اگر دین سے انحراف کرنے والی کوئی چیز ہو تو وہ پلٹ کر دین کی طرف مائل ہونے والی چیز بن جائے۔

اللہ کے دین کے لئے جس کو کام کرنا ہو اس میں دو صفتیں ضرور ہونی چاہئیں ایک صبر دوسرے حکمت۔ صبر کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی راہ میں جو رکاوٹ بھی ڈالی جائے اس پر نہ تو مشتعل ہو کر آپ ذہن کا توازن کھو دیں اور نہ دل شکستہ ہو کر اپنے مقصد کی بجائے رکاوٹ ڈالنے والے کا مقصد پورا کریں، بلکہ ہر رکاوٹ پیش آنے پر آپ کا عزم جوں کا توں قائم رہنا چاہیئے۔ اور جذبات کی گرمی سے اپنے دل و دماغ کو محفوظ رکھ کر آپ کو وہ راہ

اختیار کرنی چاہیئے جو حکمت کے مطابق ہو۔

حکمت یہ ہے کہ آپ بس ایک ہی لگی بندھی راہ پر آنکھیں بند کرکے چلنے کے عادی نہ ہوں بلکہ آپ میں یہ صلاحیت ہو کہ آپ ایک راستہ بند ہوتے ہی دس دوسرے راستے بروقت نکال لیں جس شخص میں حکمت نہیں ہوتی وہ ایک راہ کو بند پاکر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے ساتھ اگر وہ بے صبر بھی ہو تو پھر یا تو اس رکاوٹ سے اپنا سر پھوڑ لیتا ہے یا رہروی سے ہی باز آجاتا ہے۔ مگر جسے اللہ نے حکمت اور صبر دونوں سے نوازا ہو وہ جوئے رواں کی طرح ہوتا ہے جس کی منزل کوئی چیز بھی کھوٹی نہیں کر سکتی۔ چٹانیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں اور دریا کسی اور طرف سے اپنی منزل کی طرف بہہ نکلتا ہے۔

تحریکی مزاج

سوال:۔
تحریکی مزاج کسے کہتے ہیں اور یہ کن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے۔

جواب:۔
ایک آدمی جو اپنی ذات کی حد تک ایک فلسفۂ زندگی اور مقصدِ حیات رکھتا ہو اگر وہ اس کو دنیا میں پھیلانے، دوسرے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے اور اس کے لئے سعی وجہد کرنے کا کوئی جذبہ نہ رکھتا ہو تو یہ گویا غیر تحریکی مزاج ہے یہ ایسا آدمی ہے جس نے اپنا ایک راستہ خود اپنی ذات کے لئے تجویز کر لیا ہے اور وہ اس پر مخلصانہ طور پر کوشش بھی کرتا ہے۔ مگر اپنی ذات کی حد تک اس مزاج کا حامل انسان کسی تحریک کو نہیں چلا سکتا۔ تحریکی مزاج اس کے برعکس یہ ہے کہ میں جس چیز کو حق سمجھتا ہوں دنیا کو بھی اس حق کو قبول کرنے کی دعوت دوں اور کوشش یہ کروں کہ اس حق کے خلاف جو چیزیں ہیں ان کا فروغ رکے اور حق ان کے مقاصد میں فروغ پائے۔ جب کوئی شخص عملاً یہ کام شروع کر دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر ایک تحریکی سیرت پیدا ہو گئی ہے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر تحریکی مزاج نہیں ہوتا وہ تحریک کا جو کام بھی کرتے ہیں بالعموم بگاڑ دیتے ہیں کیونکہ اس کام

کو وہ جانتے نہیں ہیں۔ ان کے اخلاق وعادات، ان کی طبیعت اس کام کے ٹھیک ٹھیک مناسب نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ غلط طریقہ سے کام کرتے ہیں اور بالآخر جس مقصد کے لئے وہ کام کرنے اٹھتے ہیں اسی کے لئے نقصان دہ ہوتے ہیں۔

تحریکی مزاج کیا ہے؟ تحریکی مزاج سے مراد یہ ہے کہ ایک آدمی جو حق کو قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ باطل کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے تو اس کی سیرت وعادات واطوار ایسے ہونے چاہئیں جو اس مقصد کے لئے سازگار بن سکیں۔ مثلاً ایک آدمی درشت خلق ہے ظاہر ہے وہ کسی تحریک کا کام کرے گا۔ تو تحریک کو نقصان پہنچائے گا۔ اس کے مقابلہ میں ایک آدمی میں ایسا اخلاق ہے کہ جن لوگوں سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے وہ اس کی طرف کھنچتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اس کے لئے قدر وعزت پیدا ہوتی ہے وہ ایک جاذب شخصیت رکھتا ہے یہی ایک صحیح قسم کا تحریکی مزاج ہے۔ اس کے برخلاف ایک شخص ہے جو کسی کی تنقید برداشت نہیں کرسکتا کسی کا اعتراض نہیں سہہ سکتا۔ ذرا کوئی بات مزاج کے خلاف ہوئی تو لڑ پڑا تو وہ تحریک کے لئے موزوں نہیں ہے۔ تحریکی جذبہ تو اس میں ہوسکتا ہے، مگر تحریکی مزاج نہیں ہوسکتا۔ اس کے برعکس ایک شخص زبان کا شیریں ہے۔ متحمل ہے۔ اس کے اندر ضبط کا مادہ بھی ہے بہت سی چیزیں جو مزاج کے خلاف ہیں برداشت کر جاتا ہے بہت سی چیزوں جو اسے سخت ناگوار ہوتی ہیں، اس پر تحمل سے کام لیتا ہے ظاہر بات ہے کہ اس شخص میں تحریکی مزاج ہے۔ وہ کام بگاڑنے والا نہیں۔ کام کو بنانے والے اوصاف اس کے اندر موجود ہیں۔

تحریکی مزاج پیدا کرنے کے ذرائع

اب رہا یہ سوال کہ یہ مزاج کیسے پیدا ہو تو میرے خیال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ اس کے لئے بہت نافع اور مددگار ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ ہم وہی کام کرنے اٹھے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ اس وجہ سے ہمارے لئے اگر کوئی بہترین

نمونہ ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آپ نے کس طرح اس حق کو پھیلایا۔ کیا مزاج تھا جس کی وجہ سے شدید مخالفت پر تلی ہوئی دنیا آخر مسخر ہو گئی اور آپ کے بدترین مخالفوں کو بھی بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے اور بعد میں انہیں اللہ کے رسول کے ساتھ عشق اور قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ دوسری چیز جو درکار ہو سکتی ہے وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی سیرت کا مطالعہ ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے آپ کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ انبیاء علیہ السلام کی سیرتوں سے واقف ہونے کا نہیں ہے۔ جن دوسرے مقامات پر ان کی سیرتیں موجود ہیں وہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں انبیاء کے جو حالات قرآن مجید میں بتائے گئے ہیں ان کو بڑے غور سے آپ پڑھیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کام جن لوگوں کو کرنا ہو ان کے اندر کیا اوصاف ہونے چاہئیں۔

اصلاح احوال کی کوئی تنظیم اس وقت مؤثر ہو سکتی ہے۔ جب وہ خود بحیثیت ایک جماعت اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرے پھر اس کے ساتھ جو لوگ بھی ملتے جائیں گے اس کے مطابق ڈھلتے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے تنظیم میں یہ قوت پیدا کی ہے کہ افراد اس کے سانچے میں ڈھلتے ہیں بشرطیکہ وہ افراد اس کے اندر شامل ہوں۔ جو اس کے اثرات کو (RESIST) کرنے کا جذبہ نہ رکھتے ہوں بلکہ اس کے اثرات کو قبول کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں اگر RESIST کرنے والے افراد اس میں شامل ہوتے جائیں تو جیسے جیسے وہ داخل ہوں گے اس تنظیم کی بنیادوں کو کمزور کرتے چلے جائیں گے۔

(دورہ سکھر)

اجتماع کارکنان میں سوال و جواب کی نشست

قرآن صرف تلاوت کے لئے نہیں نفاذ کے لئے آیا ہے ۔ اور اس کا تعلق صرف ہماری انفرادی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ اجتماعی تقاضے بھی ہیں یہی پہلو ہیں جن کو اقامت دین کا مفہوم محیط کئے ہوئے ہے اور یہی معانی ہیں جو اسلامی نظام کے تقاضے میں مضمر ہیں ۔

قرآن پوری انسانی زندگی کی رہنمائی کرتا ہے ۔

" جس قرآن میں نماز کا حکم ہے ۔اسی قرآن میں چوری کے لئے قطع ید کی سزا اور جرم زنا کی حد ہے ۔سوال یہ ہے کہ کیا یہ سزائیں اور حدود صرف اس لئے ہیں کہ آدمی بس ان کی تلاوت کرکے رہ جائے یا ان کا مقصود یہ ہے کہ ان پر عمل ہو اور قرآن کا جو منشاء ہے وہ نافذ ہو ظاہر ہے کہ یہ سزائیں اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتیں جب تک ایک نظام قائم نہ ہو جو اسلام کی بنیادوں پر استوار اور اس کے ایمان پر مبنی ہو ۔

ہر مسلمان جانتا ہے کہ سود حرام ہے لیکن یہ بند نہیں ہو سکتا جب تک اس کو ممنوع قرار دینے والی طاقت موجود نہ ہو جس معاشرے کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہ ہو وہ اگرچہ ان احکام پر دل سے ایمان رکھتا ہو لیکن وہ ان کو نافذ نہیں کر سکتا جب تک اس کے ہاتھ میں اختیار نہ ہو ۔ بے اختیار معاشرہ ایسی حدود نافذ نہیں کر سکتا ۔

اگر شریعت کا یہ منشا رہوتا کہ اسلام کو کسی اختیار کی ضرورت نہیں ہے تو یہ ایسے احکام ہی نہ دیتا جس کو نافذ کرنے کی حاجت درپیش ہوتی، شریعت کے بے شمار ایسے احکام ہیں جن کے نفاذ کے لئے اختیار کی ضرورت ہے مثال کے طور پر ذمیوں کے حقوق ہیں، معاہدات ہیں جن کی پابندی کرنی ہے یہ سب احکام اس امر کے متقاضی ہیں کہ ایک حکومت ہونی چاہیئے جو ان کو نافذ کر سکے اور نگہداشت رکھ سکے کہ ان احکام کی خلاف ورزی تو نہیں ہوتی۔

خدا نے اپنی شریعت اس لئے نازل نہیں فرمائی کہ مسلمان غیر اسلامی حکومتوں کے اندر ذمی بن کر رہیں، بلکہ اس لئے نازل فرمائی ہے کہ مسلمان اسے غالب کر کے دنیا کی امامت و رہنمائی کریں اسے عملی زندگی میں نافذ کر کے ایک نمونۂ ہدایت پیش کریں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام جب مدینہ تشریف لے گئے، تو آپؐ نے سب سے پہلے مسجد تعمیر فرمائی اس کے بعد نواح میں بسنے والے قبائل سے معاہدات کئے، اگر دین کا مقصود صرف تبلیغ ہی ہوتا اور اقامت نہ ہوتا تو پھر آپؐ نے یہ معاہدات اور دیگر سیاسی تدابیر کیوں اختیار فرمائیں؟ اور مدینے کے اندر اسلامی حکومت کی طرح کیوں ڈالی؟ ہر مسلمان جانتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں اسلام کا نظام نافذ فرمایا اسلام کے قانون کے مطابق اس کی اجتماعی زندگی منضبط ہوتی تھی اور اسی کے تحت اس کا سارا کاروبار چلتا تھا۔ آپؐ نے اسلام ہی کے قانون کے تحت عدالتیں قائم فرمائیں اور تمام اجتماعی و انفرادی مسائل اسی قانون اسلام کے مطابق طے پانے لگے، پھر تکمیل دین اور اتمام نعمت کی بشارت اس وقت نہیں سنائی جب دین کا نظام عملاً قائم نہیں تھا۔ بلکہ اس وقت سنائی جب اسلام کا پرچم پوری طرح لہرانے لگا تھا اسلام کا نظام قائم ہو چکا تھا اور سارا کاروبار مملکت اس کے مطابق انجام پانے لگا تھا۔

جب اسلام کا نظام قائم ہو چکا تھا، تب یہ بشارت آئی۔

اقامتِ دین کے اسی مفہوم کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھئے کیا اسلام کو یہ حالت مطلوب ہے کہ حرام کے لئے آسانی ہو اور حلال کے لئے مشکلیں ہی مشکلیں ؟ اگر صحیح اسلامی حکومت اور صحیح اسلامی معاشرہ نہ ہو تو لوگوں کا اپنے دین پر قائم رہنا بھی مشکل ہو جائے گا۔

ہمارا پورا معاشرہ اس وقت جس آلودہ فضا میں سانس لے رہا ہے کیا اس کی موجودگی میں صحیح اسلامی زندگی آسان ہے ؟ ظاہر ہے کہ ہر شخص اس کا جواب اثبات میں دینے سے متامل ہوگا۔ جو نظامِ تعلیم اس وقت رائج ہے وہ ہماری نوجوان نسل کے اندر اسلامی عقائد کو بالکل ختم کر رہا ہے میں پوچھتا ہوں کیا یہ حالت ایسی ہے کہ آدمی اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔

دین نے اپنی تعلیمات کو نقش کرنے کے لئے خطبات جمعہ کا انتظام کیا ہے ، فرض کیجئے خطبات جمعہ کے ذریعے ملک بھر میں ہر ہفتے ایک کروڑ آدمیوں تک دین کی تعلیم و تبلیغ پہنچتی ہے اس کے مقابلے میں دیکھئے کیا ریڈیو ہر آن اپنی نشریات سے کروڑ ہا افراد کو دین سے منحرف نہیں کر رہا ہے ؟ دین کی طاقتیں باطل کی طاقتوں کے مقابلے میں ایسے ہی ہیں ، جیسے جیٹ ہوائی جہاز کے مقابلے میں چھکڑا ۔

آپ جب تک اقامتِ دین نہ کریں گے یہ صورتِ حال نہیں بدل سکتی ۔

جیساکہ تشنگانِ علم کی عادت ہے۔ دامنِ علم پھیلا ہوا دیکھتے ہیں تو پھر پروانہ وار لپکنا شروع کر دیتے ہیں۔ مولانا کی تقریر جونہی ختم ہوئی سوالات کا تانتا بندھ گیا۔

- **آپ کا یہ نام کیوں ہے؟**

ایک صاحب کا سوال تھا۔

"براہِ کرم اپنے نام کی تشریح فرمادیں، کیونکہ آپ کے نام میں اعلیٰ کا لفظ اللہ تعالےٰ کا نام ہے"

تیر جا رہے مولانا کی ذات ہی پر کیوں نہ سیدھا آتا ہو، مولانا حلم و بردباری کا دامن نہیں چھوڑتے آپ نے نہایت سکون سے فرمایا۔

اعلیٰ کا نام اللہ تعالےٰ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ یہ انسانوں کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ لا تخف انك الا علیٰ۔

دوسرے مقام پر یہ لفظ عام مومنین کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جیسے لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

پھر میں نے اپنا یہ نام خود نہیں رکھا، میرے والدین نے رکھا تھا۔ خاندانِ مودودیہ میں ایک بزرگ گزرے ہیں ان کے نام پر میرا نام تبرکاً رکھا گیا تھا۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ آخر اس میں میرا کیا قصور ہے؟

• کیا خلافِ دین نظام میں دین کا کام ہو سکتا ہے؟

"ہمارے ہاں ایسے ایسے قوانین پائے جاتے ہیں جو صریحاً خلافِ شریعت ہیں۔ کیا ایسے قوانین کی اطاعت طاغوت کی اطاعت نہیں؟"

مولانا نے فرمایا۔

ایک شخص کے شعور کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک گندے پانی کے تالاب میں پاتا ہے وہ اس تالاب سے نکلنے کی کوشش کرے گا تو اسے لامحالہ اسی گندے پانی میں ہاتھ پاؤں مارنا ہوں گے اب اگر وہ یہ شرط لگادے کہ پانی پاکیزہ ہو گا۔ تو ہاتھ ماروں گا ورنہ نہیں تو وہ اس گندگی سے کبھی بھی نہیں نکل سکے گا اسی طرح اگر کوئی شخص یہ شرط لگادے کہ اس نظام کو تبدیل کرنے کے لئے وہ صرف خالص اسلامی قوانین ہی سے کام لے گا۔ تو وہ تبدیلی کا یہ کام کر ہی نہیں سکتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکے میں تشریف رکھتے تھے۔ تو آپؐ کے پیش گردوپیش تمام نظام جاہلی تھا وہاں اسلام کے قوانین نہیں تھے۔ لیکن آپؐ نے اسی ماحول میں رہ کر اس کی تبدیلی کی سعی کی۔ اسی طرح عہدِ سابق میں کئی انبیاء علیہم السلام کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر اسلامی ماحول میں رہتے ہوئے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس بنا پر اپنے کاموں کو نہیں چھوڑا کہ وہ غیر اسلامی کیوں ہے؟ حتیٰ کہ بعض انبیاء ایسے تھے کہ ان کی اپنی بیویاں مشرف بہ اسلام نہ ہوئی تھیں۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام۔ لیکن ان کے کفر کے سبب ان انبیاء کے کام اور مقام پر کوئی حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔

• مسلمان کا کام۔

ایک صاحب نے بڑی دلسوزی کے ساتھ شکایت کرتے ہوئے ایک مشورہ پوچھا تھا۔

" ایک جماعت کے اصحاب جماعت اسلامی کو گالیاں دیتے ہیں اور اس پر طرح طرح کے بہتان باندھتے ہیں کیا ان کی مسجد میں جا کر نماز پڑھنا ٹھیک ہے ؟"

مولانا نے ارشاد فرمایا:۔

آپ ان کی مسجد میں جائیے اور گالیاں سن کر بھی نماز پڑھیئے لیکن ان گالیوں کا جواب نہ دیجئے بلکہ خاموش رہیئے۔ یہ مسلمان کا کام نہیں کہ وہ گالی کے جواب میں گالی دے جو شخص سمجھتا ہے کہ مجھے بہت قلیل مہلت زندگی ملی ہے اور اس وقت کو میں جتنا دین کے کام میں صرف کر سکوں اتنا بہتر ہے، وہ اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتا، ایسی مناظرہ بازی اور تو تکار لا حاصل ہوتی ہے اور نتیجہ سوائے ضیاع وقت کے اور کچھ نہیں ہوتا ایسا اشتعال دراصل نزغ شیطانی ہوتا ہے شیطان آدمی کو اکساتا ہے لیکن آدمی کو اس کی اکساہٹ میں آنے کی بجائے اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیئے۔

• کیا تحریک جمہوریت انتشار کا شکار ہو جائے گی؟۔

ایک صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

" تحریک جمہوریت بحالیٔ جمہوریت میں کامیاب ہو گئی، تب بھی یہ انتشار کا شکار ہو جائے گی "؟

مولانا نے جواب میں فرمایا:۔

غیب کا علم تو اللہ تعالےٰ ہی کو ہے۔ اگر انتشار پیدا ہوا تو اس کی اصلاح کی پھر کوشش کی جائے گی۔ دیکھنے کی اصل چیز یہ ہے کہ جو قدم اب اٹھایا گیا ہے کیا وہ درست ہے؟ اگر وہ درست ہے تو اللہ کا نام لے کر کام کرتے جائیے۔ اور مستقبل کی فکر میں نہ پڑیئے جب وہ وقت آئے گا تو اس وقت دیکھا جائے گا۔ جہاں تک

ہماری بصیرت کا تعلق ہے ہمارے نزدیک اس ملک میں جب تک آمریت موجود ہے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اس لئے ہم پورے شرح صدر اور سکون خاطر کے ساتھ اس تحریک سے تعاون کر رہے ہیں۔

(ایشیاء ۲۸ر اپریل ۱۹۶۸ء)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی اسلام آباد میں۔

ایک پروفیسر صاحب جو اپنے چند شاگردوں کے ساتھ دو تین دن سے مسلسل آ رہے تھے اسلامی اور غیر اسلامی معاشروں کی ترقی کے موضوع پر مصروفِ گفتگو تھے ان کا سوال تھا:

"فی کس آمدنی کا انحصار قومی پیداوار اور آبادی ہوتا ہے غیر اسلامی معاشروں میں ایک طرف قومی پیداوار میں اضافہ کیا جاتا اور دوسری طرف آبادی میں تخفیف کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اس طرح فی کس آمدنی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اسلامی معاشرہ میں آبادی میں اضافہ پر کوئی پابندی نہیں ہوگی کیا اس طرح ایک غیر اسلامی معاشرے کے مقابلے میں اسلامی معاشرہ کی معاشی رفتار سست نہیں ہوگی"؟

مولانا نے فرمایا:-

"یہ BAD ECONOMICS ہے کیا آپ فی کس آمدنی بڑھانے کے لئے افراد کو قتل کرنے پر تیار رہوں گے غیر اسلامی معاشروں میں انسان کو نہ صرف ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ انسان ایک مقصد ہے میں نے آپ کو کل بھی بتایا تھا کہ معاشی ترقی کے لئے ملک کے اندر قوتِ خرید کا ہونا بہت ضروری ہے اور یہ آبادی ہی ہوتی ہے جو

قوتِ خرید کا باعث بنتی ہے۔ اس لئے آبادی میں اضافہ معاشی ترقی کی رفتار کو گھٹانے کا موجب نہیں بنے گا دراصل جرمن اکانومسٹ (CONSUMPTION) کو بہت اہمیت دیتے ہیں جبکہ (ANGLO SAXON) ماہرین معاشیات CONSUMPTION کو اہمیت نہیں دیتے۔

پروفیسر صاحب نے کہا

لیکن (LORD KEYNES) کے بعد تو انگلستان کے ماہرین معاشیات بھی (CONSUMPTION) کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں"۔

مولانا نے فرمایا:

"جی ہاں! صرف اس حد تک کہ یہ منڈی میں وسعت کا باعث بنتا ہے اور مال کی کھپت کے لئے بیرونی منڈیوں پر انحصار نہیں کرنا پڑتا"۔

ایک موقع پر حاضرین کی اکثریت کچھ ایسی تھی کہ ان موضوعات پر سوالات شروع ہو گئے جن کا مولانا اپنی تحریروں میں مکمل جواب دے چکے ہیں مثلاً سوشلزم کیا ہے؟ کیا مرزائی کافر ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ راولپنڈی کے ایک سابق طالب علم رہنما سے برداشت نہ ہو سکا۔ انہوں نے کہا" مولانا! آپ نے خواہ مخواہ اس مجلس کی اجازت دے دی ہے اس سلسلے کو بند کر دیجئے تاکہ آپ کو کچھ آرام مل سکے ——— اب بیشتر اس کے کہ مولانا جواب دیتے حاضرین نے اس طالب علم رہنما کی خوب خبر لی ان کا کہنا تھا آپ کون ہوتے ہیں ہم سے یہ حق چھیننے والے"۔

ایک صاحب نے جو ہر روز ملاقات کے بعد روزانہ ہی نئے نئے ساتھیوں سمیت اسلام آباد آرہے تھے، پوچھا! "مولانا! کیا دنیا میں پرامن انقلاب بھی آیا ہے؟"

"جی ہاں" ——— مولانا نے فرمایا۔

"مثال کے طور پر"؟ انہی صاحب نے کہا۔

مولانا نے فرمایا:

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انقلاب پُرامن انقلاب تھا"

لیکن ان صاحب کا اصرار تھا کہ پُرامن انقلاب کبھی نہیں آ سکتا۔ اس پر مولانا نے فرمایا "ہم نے جو راستہ اختیار کیا ہے خوب سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے آپ کے پاس اگر کوئی متبادل راستہ ہے تو بتائیں"

ان صاحب نے فوراً کہا کہ "انبیاءؑ کا راستہ موجود ہے مثلاً یوسف علیہ السلام ......

......" پھر کچھ سوچ کر خود ہی خاموش ہو گئے۔

مولانا کی اس مجلس میں کئی دنوں سے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک صاحب آ رہے تھے جب کبھی کوئی سوال کرتا تو یہ صاحب مولانا کی اجازت سے کہتے کہ یہ تو مولانا کی فلاں کتاب کے فلاں صفحے پر اس طرح درج ہے ان کے جوابوں اور حوالوں سے متاثر ہو کر ایک نوجوان جنہوں نے گذشتہ سال ایم اے پاس کیا ہے نہ رہ سکے اور پوچھنے لگے "آپ کی تعلیم کیا ہے اور کیا کاروبار کرتے ہیں؟"

جواب میں ان صاحب نے کہا "تعلیم معمولی ہے اور جھاڑی لگاتا ہوں"۔

سوال

"مولانا! مشرقی پاکستان کے تقریباً تمام ذمہ دار قائدین اور دوسری جماعتوں کے لیڈر مغربی حصے کا دورہ کر چکے ہیں لیکن پروفیسر غلام اعظم صاحب اور جماعت کے دیگر رہنما اب تک کیوں نہیں آئے"؟

جواب:

مولانا نے فرمایا:

"باقی سب لیڈر ہی لیڈر ہیں لیکن ہمارے ذمہ دار حضرات کارکن بھی ہیں وہ اس وقت وہاں شب و روز اس ملک کی سالمیت کے لئے کام کر رہے ہیں اس کے ساتھ ساتھ

کارکنوں کا حوصلہ بلند رکھنے اور کام کی براہ راست نگرانی کے لئے بھی ان کا وہاں رہنا ضروری ہے"۔

سوال

ایک صاحب نے کہا "اگر آپ اسلام میں جمہوریت لا سکتے ہیں تو پھر سوشلزم کیوں نہیں لا سکتے؟"

جواب:۔

مولانا نے فرمایا:

"جمہوریت تو پہلے ہی اسلام میں موجود ہے خود فقہ کی اصطلاح ہے "علیہ الجمہور" جہاں تک (WESTERN DEMOCRACY) کا تعلق ہے اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ باقی رہا سوشلزم تو یہ ایک بالکل الگ نظام ہے اور اسلام سے متصادم ہے"

سوال۔

"مولانا! سرمایہ دارانہ نظام انسانوں کو سرمایہ دار اور مزدور کی بنیاد پر تقسیم کرتا ہے سوشلزم اشتراکیت اور غیر اشتراکیت کی بنیاد پر تقسیم کرتا ہے۔ اور اسلام، اسلام اور کفر کی بنیاد پر تقسیم کرتا ہے۔"

جواب

"اور یہی اصلی تقسیم ہے"

سوال۔

مولانا، دیگر تمام جماعتیں اور تحریکیں اپنی قیادت کے امیج (تشخص) کو ابھارتی ہیں، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا جس کی وجہ سے ہماری (LEADER SHIP) ابھر نہیں سکی"۔

جواب

"اسلام ہمیں صرف خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کے مطابق عمل کرنے کی اور انہی کی تعلیمات کو بلند کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور یہی ہماری مرکزی شخصیت" ہیں کسی دوسرے کے لئے اس حق کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔"

" آئین ۱۲ جون ۱۹۴۱ء "

سیدمودودیؒ جواب دیتے ہیں

- بچنا چاہتے ہو تو منافقت ترک کر دو۔
- ماس موومنٹ میں کچھ وقت لگے گا۔
- آہستہ آہستہ قدم بہ قدم۔
- تو سقوطِ ڈھاکہ نہ ہوتا۔
- نوجوان جماعت سے بات کریں۔
- ابھی تک کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا
- پاکستان کا سرکاری مذہب واقعی اسلام ہے۔

سوالات ..... مختار حسن

ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور

جلد ۵ ..... شمارہ ۶

اپریل ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹۷۴ء

سوال :-

جماعت اسلامی سے متعلق اور آپ کی فکر سے متاثر افراد کی اچھی خاصی تعداد ملک کے اعصابی مراکز پر قابض ہے، بالخصوص طلبہ، مزدوروں، اساتذہ اور صحافیوں کے حلقوں میں یہ صورت موجود ہے، پھر بھی اسلامی انقلاب کیوں برپا نہیں ہوتا؟

جواب :-

اس ملک میں دوسری طاقتیں بھی موجود ہیں، وہ نہ صرف کام کر رہی ہیں، بلکہ ان کے وسائل بھی ہم سے زیادہ ہیں اور پھر اقتدار کی باگیں انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے خیالات کے نفوذ کا جو عمل جاری ہے، وہ نتائج پیدا کرنے میں کچھ وقت لے گا۔ یہ آہستہ آہستہ قدم بہ قدم بڑھ رہا ہے اور فطری رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ یہ بات بھی ہے کہ اسلامی انقلاب کے حامیوں کا ملک کے اعصابی مراکز پر پورا اور مکمل قبضہ نہیں اس لئے اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کا کوئی ٹائم ٹیبل نہ بنایا جا سکتا ہے اور نہ اس کے وقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تیس بتیس سال کے کام کے نتیجے میں آپ موجودہ حالت پا رہے ہیں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آئندہ ہمارے اور دوسری فورسز کے درمیان طاقت کا تناسب کیا رہتا ہے اور ہم کس رفتار سے آگے بڑھ سکیں گے، کیونکہ ایسا نہیں کہ ہم کھلے میدان میں بڑھے چلے جا رہے ہیں، بلکہ

مخالف طاقتوں کے درمیان ہم اپنے نئے راستہ نکال رہے ہیں۔

سوال:۔

حالات کے پیشِ نظر جماعتِ اسلامی کے مقاصد کو بروئے کار لانے والے پلان میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ کیا آج کل کے حالات میں اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟ بالخصوص اس وقت جبکہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھی حکمران طبقے نے نظریاتی اور عملی سیاست میں اپنے پرانے وطیرے کو برقرار رکھا ہے؟؟

جواب:۔

یہ مسئلہ ان اصحاب کے سامنے رکھئے جو اب جماعت اسلامی کے نظام اور پالیسی کے ذمہ دار ہیں۔ جماعت کے لئے کوئی سا بھی لائحہ عمل اختیار کرنا ان کا کام ہے جو اسے چلا رہے ہیں یہ ان کے فیصلہ کرنے کی بات ہے۔ میں مسلسل بیماری کے باعث اب اس حالت کو پہنچ چکا ہوں کہ مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے اجلاسوں میں بھی بعض اوقات شریک ہونے کے قابل نہیں ہوتا۔ مجلسِ شوریٰ کے گذشتہ پورے سیشن کے دوران جس نے پالیسی بنانے کا کام کیا، میں دردِ سر میں مبتلا رہا۔ اس لئے اس سوال کا جواب مجھ سے نہ لیجئے۔

سوال:۔

جناب آپ بانیٔ جماعت تو ہیں؟

جواب۔

بانیٔ جماعت تو ہوں، لیکن ایک مرتبہ ریٹائر ہونے کے بعد اس کی ذمہ داریوں کا بار اپنے اوپر نہیں لینا چاہتا۔ میں اسی لئے ریٹائر ہوا تھا کہ میں نے محسوس کیا اب میں مزید بار نہیں لے سکتا آخری مرتبہ جب میں مجلس شوریٰ کے پورے اجلاس میں شریک ہوا، تو مجھ پر دل کا دورہ پڑا، پھر میرے معالج نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں کوئی اور بھی کام کرنے کے لئے صحت مند رہنا چاہتا ہوں، تو آئندہ ان لمبے اجلاسوں میں شرکت سے پرہیز کروں۔ ان حالات میں اس قسم کے سوالات

کا جواب دینا مزید مشکل ہے ۔

سوال:۔

کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ایک نئے سقوطِ ڈھاکہ سے بچنے کے لئے تحریک اسلامی ملک کے اقتدار پر قبضہ کرے؟ ۔

جواب:۔

یہ خیالی سوال ہے، اقتدار پر قبضہ کرنا کوئی ایسا کام تو نہیں کہ اٹھیں اور قبضہ کرلیں، یہ کوئی کھیل تو نہیں ۔ البتہ جہاں تک سقوطِ ڈھاکہ کا تعلق ہے تو ۷۰ء کے انتخابات کے نتائج سامنے آتے ہی معاملے کی صورت یہ تھی کہ پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا جن دو جماعتوں کے ہاتھ میں اصل طاقت آئی ان میں سے ایک صرف مشرقی پاکستان میں اور دوسری صرف مغربی پاکستان میں تھی ۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کا تعلق ہے اس نے اور اس کے لیڈر نے اپنے آپ کو سرے سے اس پوزیشن میں باقی نہ رہنے دیا کہ وہ پورے پاکستان کی لیڈرشپ اپنے ہاتھ میں لے سکے عوامی لیگ کی وہ لیڈرشپ پوری طرح علاقائی تعصبات میں غرق ہو چکی تھی اور جہاں تک مغربی پاکستان کے نمائندوں کی اکثریت کا تعلق ہے انہوں نے پہلے ہی اس کا حل "اُدھر تم، اِدھر ہم" پیش کر دیا تھا ۔ جماعت اسلامی کے پاس اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اپنی رائے پر عمل درآمد کرا سکتی اس لئے انتخابات کے نتائج جس طرف ملک کو بہا لے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے، وہ ہو گیا ـــــ ہاں یہ درست ہے، اگر جماعت اسلامی اس حد تک کامیاب ہو جاتی کہ مشرقی اور مغربی بازو سے کافی تعداد میں نمائندے لے آتی تو یقیناً پاکستان کی قسمت مختلف ہوتی اور کبھی سقوطِ ڈھاکہ تک نوبت نہ پہنچتی ،

سوال:۔

آپ نے اکتوبر ۱۹۶۳ء کے اجتماع درمبنگر میں فرمایا تھا کہ عمومی تحریک (MASS MOVEMENT) سے پہلے مقامی سطح پر رہنما (SUBLEADERS) پیدا کریں

گے۔ اگر جماعت سب لیڈر شپ کے مرحلے سے گزر چکی ہے تو عمومی تحریک کا مرحلہ کیوں شروع نہیں کیا جاتا ؟

جواب:۔

ہم عمومی تحریک کے مرحلے میں ہیں۔ اب نتائج پیدا کرنے میں کچھ نہ کچھ دیر تو لگے گی۔ مقامی طور پر جماعت اسلامی کے پاس ہر جگہ ایسے لوگ موجود ہیں جو مقامی طور پر لیڈر شپ فراہم کر سکتے ہیں اب عام لوگوں کو ہم خیال اور پھر متحرک بنانے کی جدوجہد میں کافی ریاضت کی ضرورت ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ایسے ملک میں جہاں غیر تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو، جیسی کہ پاکستان میں ہے۔ میری رائے ہے، ہمیں مطلوبہ "ماس موومنٹ" بنانے میں بہرحال کچھ وقت لگے گا۔

سوال:۔

نوجوانوں میں جماعتِ اسلامی کی عملی سیاست اور قیادت سے بے اطمینانی کی وجوہات کیا ہیں اور ان کے پیشِ نظر کیا جماعت کے لئے اپنی پالیسی میں کسی نوعیت کی تبدیلی ضروری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

جواب:۔

میرا خیال ہے کہ نوجوان طبعاً جذباتی اور بے صبر ہوتے ہیں، اس وجہ سے وہ چاہتے ہیں کہ پل بھر میں کچھ ہو جائے، لیکن کسی تحریک کو سوچ سوچ کر ایک ایک قدم اٹھانا ہوتا ہے ایک غلط قدم بھی ناوقت اٹھا دیا جائے تو اس کے نتائج برسوں پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اسی لئے جوشیلے نوجوانوں سے میں یہ کہتا رہا ہوں کہ جلا کر بھسم کرنے والی آگ تو جس وقت چاہیں جلا دیں، لیکن نتیجہ خیز حرارت وہ ہوتی ہے جو منضبط حرارت ہو، جتنی ضرورت ہو اس کو بڑھایا جا سکے اور جتنی ضرورت ہو اس کو کم کیا جا سکے۔ کھانا پکانے سے لے کر تمام کاموں میں ایسی ہی حرارت کامیاب ثابت ہوتی ہے۔

تبدیلی کی بات کا مجاز میں نہیں ہوں۔ اس لئے نوجوان جس قسم کی تبدیلی چاہتے ہیں جماعت سے بات کریں، جماعت کے سامنے پیش کریں، جماعت اسلامی اس پر غور کرے گی۔ اور جو مناسب تبدیلی ہو گی اسے لائے گی۔

سوال :-

کیا جماعت اسلامی موجودہ حکمران طبقے کی جگہ لینے والی متبادل قیادت تیار کر چکی ہے ۔ ۔ ۔ یا کرنا بھی چاہتی ہے ؟

جواب :-

دیکھئے بات یہ ہے کہ متبادل قیادت کا لفظ کوئی متعین معنی نہیں رکھتا جس کے ہاتھ میں اقتدار آ جاتا ہے وہ متبادل قیادت بن جاتا ہے بھٹو صاحب کے بر سر اقتدار آنے کے بعد جو لوگ وزیر اور گورنر بنے ہیں، ان کے بارے میں کوئی متبادل قیادت کی اصطلاح میں سوچتا بھی تھا؟ ان میں اکثر ایسے ہیں جن سے کہیں زیادہ قابل اور باصلاحیت افراد جماعت میں موجود ہیں۔ اس لئے متبادل قیادت کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیئے، وہ کہیں سامنے تیار کھڑی ہو اور بتایا جائے یہ متبادل قیادت ہے، جب تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے، تو متبادل قیادت خود سامنے آ جاتی ہے۔

سوال :-

جماعت اسلامی کے خلاف اندرون ملک حکومتی سطح پر پروپیگنڈہ اور بیرون ملک سازشوں میں کیا کوئی کمی واقع ہوئی ہے ؟ یا اب بھی یہ سازشیں جاری ہیں۔ اور آپ کن طاقتوں اور عناصر کو جماعت کا دشمن سمجھتے ہیں ؟

جواب :-

ہم اپنی تحریکوں کے دشمنوں، ان کے حربوں اور سازشوں کو خوب پہچانتے ہیں، ہمارے دشمن بھی ہمیں جانتے ہیں، جہاں تک سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے میرے

نزدیک ان دشمنوں کی نشاندہی کرنا نہ کرنے کی نسبت زیادہ نقصان دہ ہے۔

سوال:۔

نئے آئین میں اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے اس پر آپ تبصرہ ......؟

جواب:۔

سرکاری مذہب اس کو نہیں کہتے جو آئین میں لکھ دیا جائے۔ آئین میں لکھ دینے سے ایک قانونی ضرورت پوری ہو جاتی ہے اصل سرکاری مذہب تو وہ ہے جس کو رائج کرنے اور جس کو فروغ دینے کے لئے پوری یکسوئی کے ساتھ حکومت اور اس کے تمام وسائل اور ذرائع کام کرتے ہیں اور اس کے خلاف جو چیز ہو اس کے رواج کو روکتے ہیں۔ اس معنی میں ابھی تک کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا کہ پاکستان کا سرکاری مذہب واقعی اسلام ہے اور وہ سرکاری مذہب تو بہت ہی عجیب ہے جو آئین میں لکھ دیئے جانے کے بعد بھی گنجائش چھوڑتا ہے کہ اس کے باا ثر وزراء اور حکام کبھی پاکستان کو سوشلسٹ ریاست بنانے کے لئے کہتے ہیں، کبھی نیم سوشلسٹ اور کبھی نیم کیپٹیلسٹ نظام کی بات کرتے ہیں کبھی سائنٹیفک سوشلزم کا نام لیتے ہیں جواب تک کی علمی زبان میں مارکسزم اور لینزم کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ اور کبھی اسلامی سوشلزم کی عجیب وغریب اصطلاح استعمال کرتے ہیں جس کے کوئی معنی واضح نہیں بلکہ وہ درحقیقت متضاد اصطلاحوں کا مجموعہ ہے۔ پھر کبھی مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام ہماری ریاست کا سرکاری مذہب ہے۔ یہ طرح طرح کی آوازیں سُن کر آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ پاکستان کا واقعی کوئی مذہب بھی ہے۔

سوال:۔

نئے بین الاقوامی اور اندرونی حالات کے پس منظر میں باقی ماندہ پاکستان کی تعمیر اور بقاء کا کیا راستہ باقی رہ گیا ہے؟

جواب :۔

صرف ادھر صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے کہ مسلمان منافقت کو یکسر ترک کردیں۔ اگر انہیں مسلمان بن کر رہنا ہے تو پوری طرح مسلمان بن کر رہیں۔ یہ خطۂ زمین اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس کی بقا اس مقصد سے وفاداری اور خلوص نیت کے ساتھ اس پر کاربند ہونے میں مضمر ہے باقی ماندہ ملک کی تعمیر کا راستہ بھی اسی سے ہو کر گزرتا ہے۔

سوال :۔

تفہیم القرآن کی تکمیل کے بعد اب آپ کس موضوع پر توجہ فرما رہے ہیں؟

جواب :۔

تفہیم القرآن کے بعد میری صحت تو کسی محنت طلب کام کے لئے تیار نہ تھی لیکن کسی طرح ہمت کرکے سیرت پاک مرتب کرنے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اب یہ اللہ ہی کے فضل و رحم پر ہے کہ کب اسے مکمل کرسکوں۔ بعض اوقات کئی کئی دن کام کرنے کے قابل نہیں ہوتا اور بعض دنوں میں جب میں کچھ کرنے کی ہمت کرتا ہوں تو ملاقات کے لئے آنے والے اچھا خاصا وقت لے لیتے ہیں۔ اور جو کچھ کر سکتا ہوں وہ بھی نہیں کر پاتا۔

سوال۔

جماعت اسلامی کا موجودہ اجتماع عام، جماعت کی تاریخ میں کس اہمیت کا حامل ہوگا جماعت کے مستقبل پر کیا اثرات مرتب کرے گا۔ ۔ ۔ ؟ آپ اس موقع پر ارکان جماعت اور دیگر کارکنوں کے نام کوئی پیغام دینا پسند فرمائیں گے اور انکے لئے کسی راستے کی نشاندہی کریں گے؟

جواب :۔

اگر صحت نے اجازت دی تو انشاء اللہ اجتماع میں بات کرونگا۔ اور میں اس کے لئے پوری کوشش کرونگا لیکن وہیں تک جہاں صحت نے جانے کی اجازت دی اور اس موقع پر میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہاں اس پر بات کرونگا۔

یہ سب کچھ تو ہمارے مقصدِ حیات کا لازمی تقاضا ہے

۱۹۵۳ء سید مودودی سے علی سفیان آفاقی کی ایک نشست

جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر کا ماحول بہت پُرسکون، سنجیدہ اور با وقار تھا چھوٹے سے خوبصورت لان کے اردگرد سرسبز روشیں ہیں اور صحن میں گلاب کے پھول لگے ہیں ذیلدار پارک اچھرہ کی ایک مختصر سی کوٹھی میں جماعت اسلامی پاکستان کا دفتر ہے اس میں ایک طرف نشر و اشاعت کا شعبہ ہے اور اسی کوٹھی کے چند کمروں میں جماعت اسلامی کے امیر مولانا مودودی رہتے ہیں

چھوٹے سے برآمدے میں چند کرسیاں سلیقے سے لگی ہوئی ہیں، جن کے درمیان میں ایک میز پر اخبارات کا ڈھیر لگا رہتا ہے اس عمارت میں داخل ہونے سے پہلے ہی خود بخود ایسا احساس ہوتا ہے، جیسے بورڈ لگا ہوا ہے "یہاں بات کرنا منع ہے" نشر و اشاعت کے کمرے میں مجھے چند حضرات باتیں کرتے نظر آئے لیکن بہت آہستگی کے ساتھ، یہاں کی فضا مقدس سی ہے۔

مولانا کے کمرے میں ان سے شرفِ نیاز حاصل ہوا کمرے میں دیواروں کے ساتھ ساتھ

الماریوں میں کتابیں آراستہ ہیں اور ان کے بیچوں بیچ مولانا مودودی کی صاف ستھری میز ہے، جس پر لکھنے کے کاغذ اور قلم دوات سے لے کر پن لگانے کا ڈبہ تک نفاست کے ساتھ دکھار ہتا ہے مولانا نے اپنے جانے پہچانے دلآویز تبسم کے ساتھ پذیرائی کی۔ میرا ہمیشہ سے خیال ہے کہ اس کمرے کی آب وہوا پاکستان کی آب وہوا سے مختلف ہے یہاں ہر موسم میں بڑی خوشگوار خنکی سی ہوتی ہے اور ماحول علمی وادبی سا محسوس ہوتا ہے کمرے میں ٹنکچر آیوڈین قسم کی بو بھیلی ہوتی ہے یہ بو مولانا کی پنڈلی کی چوٹ سے آرہی تھی کچھ دن قبل لاہور سے قصور جاتے ہوئے موٹر الٹ جانے کے باعث مولانا کی پنڈلی میں چوٹ آگئی تھی جو ان دنوں قریب قریب ٹھیک ہو چلی تھی۔

سوال۔

آپ نے سیاست کیوں اختیار کی۔؟

جواب

کیا سیاست بھی کوئی پیشہ ہے جسے اختیار کیا جائے۔

سوال۔

"آج کل تو اسے زیادہ تر اختیار ہی کیا جاتا ہے" اس سوال کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آپ نے سیاسی زندگی کیوں اپنائی؟۔

جواب

(مولانا ایک تبسم کے ساتھ بولے) یہ تو پیشہ ورانہ سیاست ہے، جسے لوگ ڈاکٹری، بیرسٹری یا اس قسم کے دوسرے پیشوں کی طرح اختیار کر لیتے ہیں آج کل سیاست کی یہ قسم عام ہے ابھی کچھ عرصہ کی بات ہے کہ میں عرصہ دراز کے بعد اپنے ایک عزیز کے پاس گیا وہاں ان سے میں نے دریافت کیا کہ آپ اپنے لڑکے کو کس طرف بھیج رہے ہیں؟ وہ سنجیدگی سے کہنے لگے

"ایل ایل بی تو کر ہی آیا ہے اور اس نے پریکٹس بھی شروع کر دی ہے میں نے اس سے کہا ہے کہ اب اگر تم سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دو تو تمہاری پریکٹس خاصی چل جائے گی اور نام بھی ہو جائے گا اس طرح بڑے لوگوں سے یاد اللہ بھی ہو سکتی ہے۔

"دراصل سیاست کو تو آج کل اوپر چڑھنے کا زینہ اور شہرت کا ہتھکنڈا بنا لیا گیا ہے"

مولانا نے آگے چل کر فرمایا "میں نے سیاست اختیار نہیں کی، جو لوگ اپنا کوئی مقصد زندگی رکھتے ہیں وہ اجتماعی زندگی کے معاملات میں کچھ اختیار کر کے دلچسپی نہیں لیا کرتے، بلکہ ان کے مقصد کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلے پر دلچسپی لیں جس کا اثر ان کے مقصد پر موافق یا مخالف پڑتا ہے

"میں نے آج سے بیس برس پہلے اپنے مطالعہ اور غور و خوض کے نتیجے میں شعوری طور پر اسلام قبول کیا تھا شعوری طور پر اسلام قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص نسلی مذہب پر اکتفا نہ کرے بلکہ جان بوجھ کر صدق دل سے سمجھے کہ یہی راستہ حق کا ہے اور اسی میں فلاح ہے اس طرح کے "قبول اسلام" کے بعد لامحالہ میری زندگی کا یہ مقصد بن گیا کہ میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں جس جس پہلو میں بھی کام کرنے کی ضرورت پیش آتی گئی میں اس کی طرف عین اپنے مقصد کے تقاضے سے توجہ کرتا چلا گیا اس کام کے لئے ضرورت تھی کہ علمی حیثیت سے اسلام کی اصل حقیقت کو غلط فہمیوں کے انبار سے نکال کر اصل رنگ میں پیش کیا جائے اور ان تمام نظاموں پر عملی حیثیت سے دوسرے نظامات فکر و عمل کا جو اثر ہے اسے دور کیا جائے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسلام کو از سر نو غالب کرنے میں جو طاقتیں مزاحم ہیں، ان کی مزاحمت دور کی جائے۔

اس کے لئے یہ بھی ضرورت تھی کہ رائے عامہ کو صحیح اسلامی نظام کے لئے تیار کیا جائے اس طرح یہ مختلف ضرورتیں جیسے جیسے محسوس ہوتی گئیں مجھے آپ سے آپ

اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ کرنی پڑی بغیر اس کے کہ کسی روز بیٹھ کر میں ارادہ کرتا کہ مجھے فلاں چیز اختیار کرنی چاہیئے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں۔

سوال

"لیکن عام طور پہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دنیا میں سیاست سے زیادہ اہم بھی بعض مسائل ہیں جن کی طرف اوّلین توجہ دی جانی چاہیئے؟"

جواب

اس معنی میں کہ جس پہلو کو بھی ہم چھوڑیں گے فکر و عمل دونوں کا توازن بگڑ جائے گا۔ کیونکہ اسلام انسان کی پوری زندگی سے بحث کرتا ہے اور عملاً اس کا قیام اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ ہر شعبۂ زندگی کو پورے توازن کے ساتھ اس کے دائرہ عمل میں لایا جائے اس لئے ہم کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے

سوال۔

لیکن مولانا! زیادہ تر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ زندگی کے بعض شعبے سیاست کے مقابلے میں زیادہ اہم ہیں اور ان کی طرف توجہ دینا زیادہ ضروری ہے مثال کے طور پر لوگوں کی اخلاقی اور مذہبی اور معاشرتی اصلاح ہے اگر لوگوں کو سمجھدار اور باعلم بنا دیا جائے تو اس کے بعد وہ مسائل کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں چنانچہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی نے پہلے سماجی اور مذہبی اصلاح کی طرف توجہ کیوں نہیں دی"۔

اس طرح کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوگا

جواب۔

میں اس بحث کو فضول سمجھتا ہوں کہ زندگی کا فلاں پہلو زیادہ اہم ہے یا کم اہم ہے اس قسم کی تقسیم وہی لوگ بیٹھ کر سوچا کرتے ہیں جو زندگی پر جامع نظر نہیں رکھتے۔

سوال:-

لیکن اس طرح عمل کیا جائے تو کاموں میں یکسوئی تو پیدا ہو سکتی ہے "۔

جواب:-

"یکسوئی اس صورت میں مفید ہو سکتی ہے جب کہ مختلف گروہ ایک ہی مقصد سامنے رکھ کر ہاتھ میں لے لیں اور ان کے درمیان اشتراک اور تعاون کی کوئی صورت ہو تاکہ توازن کے ساتھ کام کیا جا سکے۔

اس وقت یہ ممکن ہے کہ کوئی گروہ کسی ایک شعبہ پر اپنی تمام توتیں صرف کر دیں لیکن یہاں صورت کچھ "انارکی" کی ہے یعنی کوئی ایک مقصد موجود نہیں ہے مختلف مقاصد ہیں اور مختلف نظریے اور مختلف طریقہ ہائے کار اختیار کرکے لوگ زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ اس طرح سے نہ تو کبھی زندگی میں ہمواری پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے "۔

سوال

آپ کی نظروں میں سیاست کی تعریف کیا ہے اور اس کے متعلق آپ کس طرح سوچتے ہیں؟

جواب:-

سیاست سے مراد؟ ویسے تو سمجھئے کہ حکومت اور طاقت سے ملک کا انتظام کرنے کا نام سیاست ہے لیکن اس کا جو وسیع تر مفہوم ہے اس کے اعتبار سے سیاست اجتماعی زندگی کا وہ شعبہ ہے جو سوسائٹی کو اقتدار کی طاقت سے اپنے راستے پر چلانے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی شخص جو کسی مخصوص نظریۂ حیات پر ایمان رکھتا ہے وہ اس سوال کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ جو سیاسی اقتدار سوسائٹی پر حاوی ہے آیا وہ اس کے نظریۂ زندگی کا حامی ہے یا مخالف؟ غیر جانب داری تو اس معاملے میں نا ممکن ہے۔

اور اس کا ذکر ہی فضول ہے اس بنا پر ہم جو نظریۂ حیات رکھتے ہیں اس کے مطابق سیاست سے بے تعلق ہونا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ اگر سیاسی اقتدار ہمارے نظریئے کا حامی ہے تو ہم آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ بٹائیں تاکہ اس کی مدد سے زندگی کے تمام شعبوں کی اصلاح و تکمیل ہو سکے اور اگر ہمارے نظریۂ حیات کے مخالف ہے تو اس کو اپنی طرف مائل کرنے یا تبدیل کر دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔"

(زندگی دسمبر ۱۹۶۹ء)

- دنیائے اسلام کی جلیل القدر شخصیّت
- قرآن وسنّت کے فقید المثال ترجمان
- اسلامی نظام کے بے خوف داعی

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی
کی
ایڈیٹر چٹان سے ملاقات

ایک عالمگیر تحریک

اسلام کی تحریک! اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر اپنا سب کچھ قربان کر دینا ان کا شعار ہے حتیٰ کہ جانِ عزیز بھی ——— قید و بند کی صعوبتیں اور موت کی سزا کا حکم بھی انہیں راہِ حق سے نہ ہٹا سکا۔ جہاں تک اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کا تعلق ہے انہوں نے ملک میں ایک ایسا عظیم مکتبِ فکر پیدا کیا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی اقدار و روایات اور اسلامی ضابطوں کو سائنسی، عقلی اور عملی لحاظ سے منطبق کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ کٹھ ملاؤں کا گروہ نہیں بلکہ دورِ جدید کے ہر نوع کے مسائل کو سمجھنے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے حل ڈھونڈنے والے خوش فکر دانشوروں کی جماعت ہے ——— مولانا مودودی کا یہی ایک کارنامہ انہیں زندۂ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہے۔ ———

انہوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں اُردو زبان کو ایک نئے اسلوب ہی سے آشنا نہیں کیا بلکہ دینی حکمت و تدبیر کے موتیوں سے بھی اس

کا دامن بھر دیا ہے۔ وہ ایک مدلل طرز تحریر و تنقید کے موجد ہیں اس ضمن میں انہیں ایک منفرد و لاثانی مقام حاصل ہے۔

"چٹان" نے ملکی وسائل پر قومی رہنماؤں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا تو مولانا مودودی کی عظیم شخصیت کو سب سے پہلے منتخب کیا گیا تھا لیکن بہت سی تمنائیں دل میں گھٹ کر رہ جاتی ہیں ادارہ ابھی ان سے ملاقات کے لئے وقت کی سوچ میں رہا تھا کہ مولانا مودودی ہلالِ عید کی نذر ہو گئے نتیجتہً ان سے ابتداء کرنے کی سعادت حاصل نہ ہو سکی۔ ایک ماہ ۱۹ دن کی نذر بندی کے بعد جب وہ اس ۱۶ / مارچ کو رہا ہوئے تو راقم بھی انہیں مبارک باد دینے جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر اچھرہ پہنچا یہاں وہی پرانی خواہش پھر ابھر آئی۔ میں نے جماعت کے ناظم نشر و اشاعت جناب نعیم صدیقی اور پارلیمانی امور کے انچارج سید صدیق الحسن گیلانی سے رجوع کیا نعیم صاحب نے بتایا کہ ایک دو روز میں وقت مقرر کر کے آپ کو اطلاع پہنچا دی جائے گی۔ دوسرے تیسرے روز نعیم صاحب نے مطلع کیا کہ مولانا نے آج ہی گیارہ بجے کا وقت مقرر کیا ہے۔ اچانک ملاقات کا وقت مقرر ہونے سے خوشی ہوئی لیکن ساتھ ہی مولانا کی عظمت و جلالت، دینی فہم و تدبر اور علمی و ادبی دبدبے کے تصورات بھی ذہن میں گھوم گئے۔ مجھے اس انسان سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو رہا تھا جسے نہ صرف دنیائے اسلام میں منفرد مقام حاصل ہے بلکہ جو قیامت تک کے لئے تاریخ کا جزو غیر منفک بن گئی ہے اب بھی غیر ملکی مبصر پاکستان کی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا مودودی کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ ان کا تذکرہ

نہ ہو تو پاکستانی سیاست کا جائزہ ادھورا اور تشنہ رہ جاتا ہے ۔ ہم وہاں پہنچے تو وہ ہمیں اپنے دفتر میں لے گئے ، کوئی پون گھنٹہ تک مختلف سیاسی و دینی گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا مولانا کے ذہن میں خوف کا قطعاً کوئی شائبہ نہیں ان کا ضمیر خوف و مصلحت سے بے نیاز ہے وہ جو کہتے ہیں برملا دو ٹوک انداز میں کہتے ہیں ——— مولانا کا مشفقانہ طریق گفتگو اپنے "حوصلوں" کے آڑے آیا اور میں نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

جماعتِ اسلامی کا قیام

سوال ۔ جماعت اسلامی کا قیام کب اور کن محرکات کی بنا پر عمل میں آیا ؟

جواب :-

جماعتِ اسلامی ستمبر ۱۹۴۱ء میں قائم ہوئی ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انسان کے مسلمان ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ جس معاشرہ میں رہے اور جس ملک کا باشندہ ہو وہاں اسلامی نظامِ حیات کے عملی قیام و نفاذ کی جدوجہد کرے ۔ یہی مقصد یا تقاضا جماعت اسلامی کے قیام کا محرک ہوا۔

سوال ۔

مولانا ۱۹۴۱ء میں جب جماعت قائم ہوئی تو کیا اس وقت بھی سیاست میں حصہ لینا اس کے منشور میں شامل تھا ؟

جواب ۔

" دراصل یہ سوال اس طرزِ فکر کا نتیجہ ہے جو مذہب و سیاست کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیتا ہے ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام پوری اجتماعی زندگی کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اسلام کے ہر شعبہ زندگی میں رہنما ہونے کی ایک

دلچسپ مثال دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔

کسی ایسے گھر کو لیجئے جس میں فرنیچر بھی ہے بستر اور برتن بھی یہ گویا اس گھر کی معاشرت ہے۔ اگر گھر میں جائے نماز بھی ہے تو یہ اس کا تمدن ہو گیا گھر میں ملازم رکھا جائے تو اس سے معاملہ کیا جائے اور دیگر انتظامات بروئے کار لائے جائیں تو یہ سیاست ہوئی لہذا جس شخص کو پورے گھر کی اصلاح مقصود ہو وہ بھلا سیاست کے اہم شعبہ کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے؟ کیونکہ اگر سیاست بگڑی ہوئی ہو گی تو اس کے اثرات بھی خطرناک ہوں گے اس سے بچوں کے مستقبل کا ستیاناس ہو جائے گا میاں بیوی کے تعلقات خوشگوار نہ رہیں گے۔ بہتر انتظامات نہ ہوں تو چوری ڈاکہ کے مکانات واضح ہیں چنانچہ پورے گھر کی اصلاح سے دلچسپی رکھنے والا ان تمام امور کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے۔

اگر میرے مکان کا چوکیدار مجھ سے یہ کہے کہ گھر کی سیاست میرے حوالے کر دو اور تم صرف مصلیٰ سنبھالو تو میں ایسے چوکیدار کو کان سے پکڑ کر نکال باہر کر دوں گا۔

جمہوریت کی بحالی۔

سوال۔

ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لئے متحدہ محاذ قائم کرنے کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں یا مشترکہ پلیٹ فارم کا نعرہ بلند کیا جا رہا ہے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کیا متحدہ محاذ کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور یہ قائم ہو سکے گا کہ نہیں؟

جواب۔

آمریت کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ قوم میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی صلاحیت کو

ختم کردیا جائے تاکہ وہ خود اپنا نظام چلانے کے قابل نہ ہوسکے۔اسی لئے آمریت اس امر پر پوری قوت صرف کردیتی ہے۔کہ جمہوری امکانات کا صفایا کردیا جائے اور ایسے حالات باقی نہ رہنے دیئے جائیں جن میں جمہوریت برسر کار آسکے یہی وہ پس منظر ہے جس کی بنا پر ڈکٹیٹر شپ پورا زور لگاتی ہے۔کہ ملک میں کوئی ایسی متبادل قیادت فراہم نہ ہو جس کی طرف قوم اس امید سے دیکھے کہ وہ قیادت بھی ملکی نظام چلانے کی اہلیت رکھتی ہے یہ بالکل ایسی پوزیشن ہے گویا میرا باورچی مجھے ہی اپنا باورچی خانہ چلانے کا اہل نہ رہنے دے گذشتہ کئی سال سے ملک میں یہی فضا ہے پریس پر کنٹرول خبروں پر قدغن، اجتماعی آزادیوں کا خاتمہ، بے موسمی ایمرجنسی ——— یہ سب اس رجحان کے غماز ہیں۔کہ کوئی متبادل قیادت جنم نہ لے۔ان حالات میں جمہوریت کی بحالی کے لئے جدوجہد اور مختلف جماعتوں کو ملا کر مشترکہ پلیٹ فارم کی تشکیل انتہائی ضروری ہے لیکن ان کوششوں کی بار بار ناکامی نہ تعجب کا باعث ہے اور نہ خلاف توقع اور ہمیں اس صورت حال سے مایوس بھی نہیں ہونا چاہیئے۔موجودہ حالات میں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ جمہوریت کے نام پر متحدہ محاذ کے لئے آواز تو اٹھ رہی ہے۔ مولانا نے کہا بہرحال مشترکہ پلیٹ فارم قائم کر کے جمہوریت کی بحالی کے لئے جدوجہد کرنے کی کوششیں جاری ہیں اگر یہ کامیاب ہوگئیں تو سمجھئے کہ ہم نے آدھی جنگ جیت لی۔

سوال۔

متحدہ محاذ کا کیا مطلب ہے؟

جواب۔

اس سے مراد "ایک مشترکہ جماعت" نہیں کیونکہ یہ ناممکن ہے ملک میں مختلف الخیال اور الگ الگ نظریات رکھنے والوں کو مصنوعی طور پر کسی ایک جماعت میں لانا

عملاً ممکن نہیں اور پھر جمہوریت کا اپنا تقاضا بھی یہ ہے کہ تمام افراد کو اپنے نظریات میں خیالات پیش کرنے اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی آزادی دی جائے" ایک واحد جماعت صرف ڈکٹیٹر شپ کا باعث بنتی ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ جمہوریت کے حصول کے مشترکہ مقصد کے لئے تمام جماعتیں اپنا مشترکہ پلیٹ فارم بنالیں۔

سوال۔

جماعت اسلامی اس مشترکہ محاذ میں شامل ہو گی؟۔

جواب

"جماعت اسلامی" تو اس مقصد کے لئے آگے بڑھ کر کوشش کر رہی ہے وہ ایسے محاذ سے یقیناً پورا تعاون حاصل کرے گی۔

سوال۔

کیا اسلام اصول سیاست اور اصولِ ریاست کے لحاظ سے اس دور میں بھی ایک "متحرک قوت" کی حیثیت رکھتا ہے؟

جواب۔

اگر اسلام کو کسی زمانہ میں بھی "متحرک قوت" کی حیثیت حاصل نہیں رہی تو پھر اس کی ضرورت نہیں پھر اسے چھوڑ دینا چاہیئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہر زمانہ میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اسلام متحرک قوت کی بجائے محض ایک جامد و مجرد عقیدہ ہے وہ حماقت کا شکار ہے۔ ایسے شخص کو اسلام کے دائرے سے نکل جانا چاہیئے۔ میں اس قسم کے احمقوں سے سوال کرتا ہوں کہ وہ مجھے بتائیں کہ اسلام کب سے اور کیوں متحرک قوت نہیں رہا؟۔

سوال

کیا یہ صحیح ہے کہ یورپ کے دانشوروں کی قیادت کو چیلنج کرنے ہی سے ہم

ان کو سیاسی و مادی برتری اور بالادستی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔؟

جواب۔

خالی خولی چیلنج بازی کسی اہمیت و افادیت کی حامل نہیں۔ میری خواہش ہے کہ میرا ملک اسلام کا ایک ایسا نمونہ بن کر دکھائے جو پوری دنیا کے لئے مشعلِ راہ ہو اس طرح ہم مثبت طور پر پوری دنیا کو یہ بتا سکتے ہیں کہ اسے جن مسائل نے پریشان کر رکھا ہے اسلام ان کا کامیاب حل پیش کرتا ہے۔ اگر موجودہ دور میں ہم اپنے آپ کو اسلامی تعلیمات کا نمونہ بنا کر دکھائیں تو یہ اپنے طور پر مغربی دانش وروں کے لئے ایک کھلا چیلنج ہوگا۔

یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے یہ طریقِ فکر و عمل .... کہ زبان سے نام اسلام کا لیا جائے اور تعلیمی نظام یورپ سے لایا جائے اور جملہ نظریات بھی یورپ سے درآمد ہوں حتیٰ کہ اسلام کے عائلی قوانین اگر مغربی دانشوروں کو ناپسند ہوں تو ان میں بھی ترمیم کر ڈالی جائے۔ خوراک کی ضروریات کے متعلق قانونِ فطرت کا چیلنج سامنے آئے تو یورپی انداز میں خاندانی منصوبہ بندی کی پناہ ڈھونڈ لی جائے۔ ثقافت کے نام پر ناچ گانے کی محفلیں جمائی جائیں تو اس ڈھب کے مسخرہ پن کے ساتھ اسلام کے نام پہ زبانی جمع خرچ کسی کو متاثر نہیں کر سکتا اور نہ اس خود غلط پن کے بل بوتے پر مادہ پرستوں کو چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ یہ بے فائدہ بات ہے۔

سوال۔

کیا پاکستان میں واقعتاً اسلام کا منہج اہل السنت والجماعت کا کوئی مستقبل ہے؟

جواب:۔

پاکستان میں اسلام کا مستقبل نہ ہو تو پھر اس کے وجود کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی کیونکہ پاکستان کا قیام ہی اسلامی ضابطۂ حیات نافذ کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا پھر اگر یہاں بھی اسلامی نظام رائج نہ کریں تو آئندہ نسلیں ہم سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہونگی کہ ایک الگ ملک بنانے کی کیا ضرورت تھی۔؟ کیونکہ اگر ہمیں رقص و آواز اور لہو ولعب ہی عزیز تھا تو انہیں ہندوستان میں بھی آسانی سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے یقین ہے کہ آخر کار پاکستان میں اسلام ہی غالب آئے گا اس کی راہ روکنے والے ایڑی چوٹی کا زور لگالیں اور الٹے بھی لٹک جائیں لیکن اس قسم کی احمقانہ مزاحمتوں کے باوجود ملک میں اسلام آکر رہے گا۔ اور اسے ضابطۂ حیات قرار دینا پڑے گا۔

سوال:۔

اس وقت دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے مگر ہمارے علماء وہیں کے وہیں کھڑے ہیں جہاں انہیں فقہ اسلامی نے تیسری یا چوتھی صدی میں کھڑا کرایا تھا؟

جواب:۔

اسے غنیمت سمجھئے کہ علماء کرام وہیں کھڑے ہیں۔ یہ تو بہت بڑا کریڈٹ ہے کہ وہ ابھی تک اپنے مقام پر قائم ہیں اور پیچھے نہیں ہٹے ورنہ جو حالات ہمارے ملک میں ہیں ان کا تقاضا تو یہ تھا کہ علماء میلوں پیچھے تک پسپا ہوتے چلے جاتے بعض بیچارے تو پیچھے ہٹنے پر مجبور بھی ہوئے ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ محکمہ اوقاف دوسروں کو بھی پیچھے ہٹا کر دم لے گا۔ جبہ و عمامہ میں پلٹے ہوئے جسم میں ضمیر نام کی جو چیز ہے اسے خریدنے کی کوششیں بڑے زور وشور سے جاری ہیں دعا کیجئے کہ علماء اپنے مقام پر ڈٹے رہیں۔ اور کسی ترغیب و تحریص کا شکار نہ ہوں دوسرے ممالک میں اوقاف کے انتظام کے تحت علماء کا جو حشر ہوا ہے میں نے اس کا ذاتی مشاہدہ

کیا ہے۔ اِن کی حالت کو قابلِ رحم قرار دینا چاہیئے۔

سوال۔

اسلامی ملکوں میں انتشار کا سبب کیا ہے؟

جواب۔

یہ ریاستیں اسلامی نہیں اس لئے انتشار کا بھی شکار ہیں یوں کہنا چاہیئے کہ ان ریاستوں کے باشندے مسلمان ہیں۔ اور انہیں چلانے والوں کے نام مسلمانوں کے سے ہیں۔

سوال۔

ایشیا و افریقہ کے ممالک جو گذشتہ پچیس سال میں آزاد ہوئے ہیں وہ داخلی طور پر بحران کی زد میں کیوں ہے؟

جواب

یہ ملک بحران کا شکار نہ ہوتے تو حیرت ہوتی کہ استعمار نے جہاں بھی قدم رکھا بدترین لوگوں کو آگے لایا اور جاتے ہوئے ملکی کنٹرول بھی انہیں کے ہاتھوں میں دے گیا۔ اس کے اثرات بھی ابھی تک باقی ہیں اور ساتھ ہی بیرونی استعمار کی ریشہ دوانیاں بھی جاری ہیں یہی وجہ ہے کہ نو آزاد ممالک بحران کا شکار ہیں۔

سوال۔

کیا اسلامی بلاک کے قیام کا کوئی امکان موجود ہے؟

جواب۔

جی ہاں امکان تو ہے کیونکہ مسلمانوں میں مسلمان ہونے کا احساس مغربی اثرات کے باوجود ختم نہیں ہوا تاہم اس سلسلہ میں بعض عملی مشکلات کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا برسوں کی جدوجہد ہی سے قابو پایا جاسکتا ہے اسلامی

بلاک کے مقصود کو حاصل کیا جا سکتا ہے یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ فطری جغرافیائی بلاک اسلامی بلاک ہی ہو سکتا ہے ہم سب سے پہلے اسلام کو اپنالیں پھر اسلامی بلاک کی تشکیل مشکل نہ رہے گی۔

سوال

کیا عرب ریاستوں کے متحد ہونے کی کوئی صورت ہے؟

جواب۔

جب تک ناصر صاحب ہیں عرب ریاستوں کے اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سوال۔

اسلامی ادب سے آپ کی متعین مراد کیا ہے؟

جواب۔

وہ ادب جو اسلام کی حدود میں رہے اور اپنی قوت و اثر آفرینی کو اسلامی مقاصد کے فروغ کے لئے بروئے کار لائے۔

سوال۔

جماعت اسلامی جب ایک تحریک کی حیثیت سے عوام کو دعوت دے رہی ہے تو اس کا لٹریچر سستا کیوں نہیں فروخت کیا جاتا جبکہ بائیبل سوسائٹی وغیرہ نہایت ارزاں نرخوں پر عیسائیت کی تبلیغ کا لٹریچر پھیلا رہی ہے۔؟

جواب

گرانی، ہر چیز کی گرانی اور دوسری مشکلات کے باعث ہمارے لئے اس سے زیادہ سستا لٹریچر ممکن نہیں۔ ہمارے وسائل سب کے سامنے ہیں۔ اس مد کے زیر عنوان ہمارا کوئی بجٹ نہیں جہاں تک بائیبل سوسائٹی کے ارزاں لٹریچر کا

کا تعلق ہے کیا آپ نے اس کا بجٹ دیکھا ہے میں نے ۳۳-۱۹۳۲ء میں اس کا پتہ لیا تھا تو معلوم ہوا کہ بائبل سوسائٹی کا بجٹ ریاست گوالیار کے بجٹ سے دوگنا ہے ہم اس مقصد کے لئے اتنا بڑا بجٹ کہاں سے لائیں۔

سوال۔

اسلامی فکر کی ترویج میں اقبال کا رول کیا ہے؟

جواب۔

اقبال نے بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے جس دور میں الحاد کا طوفان انتہائی عروج پر تھا اور مسلمان نوجوان بری طرح اس کا شکار ہو رہے تھے اقبال کی شاعری نے انہیں کفر الحاد کے جنگل میں جانے سے روکا۔

سوال۔

اب تک آپ کی قید و بند کی میعاد کتنی ہے؟

جواب۔

میں نے حساب تو نہیں لگایا لیکن پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوا اور بیس ماہ نظر بند رہنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں رہا ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں دوسری بار حراست میں لیا گیا اور سزائے موت کا حکم ہوا جسے بعد میں چودہ سال قید میں تبدیل کر دیا گیا تب ۲۵ ماہ جیل میں رہا۔ پھر تیسری مرتبہ ۱۹۶۴ء میں "مینٹیننس آف پبلک آرڈر آرڈیننس" کے تحت گرفتار ہوا۔ اور نو ماہ تک نظر بند رہا آخری مرتبہ "ڈیفنس آف پاکستان رولز" کے تحت گرفتاری ہوئی اور ایک ماہ ۹ دن کے بعد رہا ہو گیا۔

اس سلسلہ میں جو چیز قابل ذکر ہے۔ وہ یہ ہے میری رہائی جب بھی ہوئی عدالتی فیصلہ کے تحت یا عدالتی فیصلہ کے پیش نظر ۔ ۔ ۔ ۔ پہلی مرتبہ ایک کمیونسٹ کارکن

کی حبس بے جا کا مرافعہ ہائی کورٹ نے منظور کیا۔ تو اس کی روشنی میں مجھے بھی رہائی نصیب ہوئی۔ دوسری مرتبہ جب اس وقت کے گورنر جنرل ملک غلام محمد نے آئین ساز اسمبلی کو توڑا تو اس کے خلاف اسمبلی کے سپیکر جناب تمیز الدین خان نے اس کے جواز کو عدالت عالیہ میں چیلنج کیا۔ جسٹس منیر نے گورنر جنرل کے فیصلہ کو حق بجانب قرار دیا۔ اس فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام آرڈیننس بھی خود بخود ناجائز ہو گئے جنہیں مرحوم اسمبلی نے منظور کیا تھا۔ نتیجۃً ان قوانین کے تحت جو لوگ گرفتار ہوئے تھے رہا ہو گئے۔ سابق میجر جنرل اکبر خان بھی انہیں میں شامل تھے۔ مجھے بھی چودہ سال قید سے نجات ملی۔ تیسری مرتبہ عدالت عالیہ کے فیصلہ پر رہا ہوا اور اب بھی ہائی کورٹ میں رٹ زیر سماعت تھی کہ فیصلہ سے قبل رہا کر دیا گیا۔

سوال۔

اب تک آپ کتنی کتابیں تحریر کر چکے ہیں؟

جواب۔

مجھے اپنی تصانیف کی صحیح تعداد یاد نہیں۔ نعیم صدیقی صاحب سے ملیں شاید وہ بتا سکیں۔ ..... نعیم صدیقی صاحب سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا مولانا اب تک تقریباً ایک سو کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان میں سے چھوٹی سے چھوٹی کتاب کی ضخامت ۳۲ صفحات اور بڑی سے بڑی کتاب نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہم مولانا سے معانقہ کر کے رخصت ہوتے تو یہ احساس دل میں کروٹیں لے رہا تھا کہ واقعی ہم اس عہد کے احمدؒ بن حنبل سے مل کر آئے ہیں۔

دعوتِ اسلامی کی رفتارِ کار

روزنامہ العلم (مراکش) کے نمائندے کی مولانا مودودی سے گفتگو

سوال:۔

آپ دنیا میں اس وقت سب سے نمایاں اور ممتاز اسلامی رہنما اور داعی ہیں، آپ کی رائے میں اس وقت دعوتِ اسلامی کس طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہے اور اس کا مستقبل کیا ہے؟

جواب۔

دعوتِ اسلامیہ کو تمام مسلمان ملکوں میں ایک ہی صورتِ حال سے سابقہ درپیش ہے اور وہ یہ ہے کہ استعمار نے براہِ راست اور بالواسطہ اثرات سے ہر جگہ ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا ہے جو علمی اور فکری حیثیت سے اسلام سے بہت بعید اور عادات و اخلاق اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے مسلمانوں کے لئے قریب قریب بالکل اجنبی ہو گیا ہے۔ یہی طبقہ استعمار کے زمانے میں یا تو حکومت کے مناصبِ عالیہ پر قابض ہوا یا آزادی کی تحریکوں میں سیاسی

حیثیت سے مسلمانوں کا رہنما بنا۔ پھر جب استعمار سے مسلمان ممالک آزاد ہوئے تو اس طبقے کے ہاتھ میں ہر جگہ حکومت کی باگیں منتقل ہوگئیں۔ اب یہ طبقہ ہے تو مسلمان قوموں ہی کے افراد میں سے لیکن اس کے جذبات، خیالات اور عادات سب مسلمانوں سے مختلف ہیں۔ وہ اگر مستعمرین کے نظام سرمایہ داری سے ہٹ کر کوئی چیز سوچ سکتا ہے تو وہ نظام اشتراکی ہے۔ کیونکہ جو علوم اس نے حاصل کئے اور جو عادات اس نے اختیار کی ہیں ان کے لحاظ سے وہ ان دو ہی مسلکوں میں سے کسی ایک مسلک کا تصوّر کرسکتا ہے اس کے برعکس عام مسلمان اور ان کے مذہبی طبقے فطری طور پر ہر جگہ آزادی کے طالب اس لئے ہوئے تھے کہ اسی نظام اسلامی کو تازہ کریں جس سے استعمار نے انہیں محروم کیا تھا۔ اور آزادی کے بعد وہ قدرتی طور پر اس چیز کے متوقع تھے کہ ایسا ہو۔ لیکن عملاً ایسا نہیں ہو رہا ہے اور اسی کی وجہ سے تمام مسلمان ملکوں میں از سر نو ایک نزاع برپا ہوگئی ہے جو استعمار کے خلاف جدوجہد کی بہ نسبت شدید تر ہوتی جارہی ہے عام مسلمان ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو اسلامی نظام چاہتے ہیں۔ اور اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو یہ نہیں چاہتے۔ اگر فیصلہ بندوق کی بجائے انتخابات میں لوگوں کے ووٹوں سے ہوتا تو ہر جگہ پُرامن طریقے سے اس مسئلے کا فیصلہ ہو جاتا۔ لیکن قریب قریب ہر جگہ ووٹ کے بجائے مال اور طاقت دونوں کو فیصلہ کن بنا دیا گیا ہے اور عام باشندے آئے دن کے انقلابات کے تماشائی بن کر رہ گئے ہیں۔ اسی صورت حال نے عربوں کو اسرائیل کے مقابلے میں بے بس کر دیا ہے اور اسی صورت حال نے غیر عرب مسلمان ملکوں کے اندر بھی تمام حکومتوں کو کمزور کر کے رکھ دیا ہے مستقبل کا سارا انحصار اس پر ہے کہ آیا مسلمان ملکوں میں جمہوریت اپنی صحیح شکل میں نافذ ہوتی ہے یا نہیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں آیا مسلمان ملکوں کے عوام کو اپنی قسمت کے فیصلے کا آزادانہ حق مل جاتا ہے یا نام نہاد انقلابی آمر خود اپنی قوموں کا مستقبل طے کرتے رہتے ہیں پہلی صورت میں مستقبل ان شاء اللہ شاندار ہے اور اگر دوسری صورت جاری رہی

تو انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان ملکوں کا حشر کیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ آخر کار پھر اپنی آزادی کھودیں۔

سوال :-

اسلامی تحریک کے لئے اچھے اور کارآمد داعی اور کارکن تیار کرنے کے لئے کون سے وسائل اختیار کرنا ضروری اور مفید ہیں؟۔

جواب :-

سب سے زیادہ اہم چیز تو یہ ہے کہ جو لوگ بھی اسلامی دعوت کا کام کریں وہ اس دعوت کی حقیقت وماہیت کو اچھی طرح جان لیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ علم کے بعد پورے اخلاص کے ساتھ اس دعوت کے اصول ومبادی پر ایمان لائیں۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ وہ ان تمام شرائط کو پورا کریں جو دنیا میں کسی تحریک کی کامیابی کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں یعنی توحید صفوف، منظم کام، اور حکمت وتدبر کے ساتھ اپنی دعوت کو آگے بڑھانے کے لئے حالات وظروف کے مطابق مسلسل سعی۔

سوال :-

جماعت اسلامی نے آج تک دعوتِ اسلامی کے بارے میں کتنے مراحل طے کئے ہیں اور پاکستان کے اندر اور پاکستان کے باہر اب تک جماعت نے کیا کیا کام سر انجام دیئے ہیں۔؟

جواب :-

سب سے پہلے ہم نے اپنے خیالات وسیع پیمانے پر پھیلائے۔ پھر چند سال کے بعد جب ایک معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی جو ان خیالات کو صحیح سمجھتے تھے تو ان کی تنظیم وتربیت کا کام کیا گیا اس کے بعد جیسے جیسے لوگ اس دعوت کے لئے کام کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوتے گئے ہم نے اپنی مساعی کو چار اہم شعبوں میں

صرف کرنا شروع کر دیا۔ ایک تطہیرِ افکار اور تعمیرِ افکار۔ دوسرے صالح افراد کی تلاش تنظیم اور تربیت۔ تیسرے اصلاحِ معاشرہ اور چوتھے نظامِ حکومت کی اصلاح اور اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کی کوشش۔ کئی سال گزرنے کے بعد ہم نے دنیا کی مختلف زبانوں میں اپنے لٹریچر کے تراجم اور اشاعت کا انتظام کیا اس وقت ترکی، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں میں اچھی خاصی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان کے اثرات تمام اُن ملکوں میں پھیل رہے ہیں جہاں یہ زبانیں بولی یا سمجھی جاتی ہیں جہاں تک نظامِ حکومت کی اصلاح کا تعلق ہے اسلام کو پاکستان کے دستور کی بنیاد تسلیم کرایا جا چکا ہے جس سے اب ہٹنا کسی حکومت کے لئے ممکن نہیں رہا ہے۔ اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ ملک میں ایک دفعہ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہو جائیں تاکہ عملاً اقتدار ان لوگوں کی طرف منتقل ہونے کا کم از کم آغاز ہو جائے جو حکومت کے نظام کو اسلامی اصولوں پر چلانا جانتے بھی ہوں اور چاہتے بھی ہوں۔

سوال :۔

اسلامی دستور کو بروئے کار لانے کے لئے جماعت اسلامی نے کیا اقدامات کیے ہیں۔؟

جواب :۔

اس سوال کا جواب اوپر آ چکا ہے ہم نے اپنے لٹریچر کے ذریعے سے یہ واضح کر دیا ہے کہ اسلام کا نظامِ حکومت تفصیلی شکل میں کیا ہے اور وہ معاشرے کے تمام معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور دوسرے بڑے بڑے مسائل کو کس طرح حل کرتا ہے۔

سوال :۔

پاکستانی عوام نے مسجدِ اقصیٰ کی آتش زدگی پر بلاشبہ اپنے شدید غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ فلسطینی مجاہدین کی امداد کے لئے

آپ نے مثبت طور پر کیا اقدامات کئے ہیں؟

جواب:۔

اس وقت تو پاکستان کے لوگ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ قرار دینے کی جو غلطی اب تک کی جاتی رہی ہے اس کی اصلاح ہو اور اس کو اسلامی مسئلہ قرار دے کر تمام دنیا کی مسلمان حکومتیں اور سب سے بڑھ کر پاکستان کی حکومت فلسطین کی آزادی کے لئے جہاد پر تیار ہو جائے۔ اگر اس میں کامیابی ہو جائے تو انشاء اللہ پاکستان کے مسلمان جان و مال کی کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

سوال:۔

آپ نے برتھ کنٹرول کے موضوع پر ایک کتاب تالیف کی ہے۔ کیا آپ اسلامی نقطۂ نظر سے ابھی تک برتھ کنٹرول کی پالیسی کے مخالف ہیں؟ کیا آپ اپنی کتاب میں مزید دلائل کا اضافہ کر سکتے ہیں؟

جواب:۔

اس مسئلے میں میرے خیالات اب بھی وہی ہیں جو میں اپنی کتاب میں بیان کر چکا ہوں۔ ان میں کسی ترمیم کی ضرورت میں نے محسوس نہیں کی ہے۔ اس مسئلے کے متعلق مزید مواد جمع کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ انشاء اللہ آئندہ ترتیب کے موقع پر اس کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ کتاب کی اشاعت کے بعد سے بہت سے مزید دلائل و شواہد سامنے آئے ہیں جو اس نقطۂ نظر کو زیادہ تقویت پہنچاتے ہیں جو میں نے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔

سوال:۔

کثرت کار اور مصروفیتوں کے باوجود آپ نہایت عمدہ اور مفید کتابیں تالیف کر رہے ہیں۔ اسلامی مسائل و افکار کو ترقی دینے کے لئے یہ کتابیں بڑی مددگار

ثابت ہو رہی ہیں۔ کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ آپ کی تازہ ترین تالیف کونسی ہے اور ان دنوں کون سی کتاب زیرِ تصنیف ہے؟

جواب:-

آپ نے میری کتابوں کی جو افادیت بیان کی ہے اس پر میں اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس کے فضل سے میں اسلام کی کچھ خدمت انجام دینے کے قابل ہوا۔ اللہ تعالےٰ اس خدمت کو قبول فرمائے۔ اردو زبان میں میری آخری تصنیف "خلافت و ملوکیت" ہے۔ اور آج کل میں تفسیر تفہیم القرآن کو مکمل کر رہا ہوں۔ ان دنوں ۲۸ ویں پارے کی آخری سورت "تحریم" کی تفسیر لکھ رہا ہوں۔ عربی زبان میں ان دنوں میری متعدد نئی کتابیں بیروت اور کویت میں چھپی ہیں یہ کتابیں دراصل میری شائع شدہ اردو کتابوں کے عربی تراجم ہیں۔ مثلاً نحو ثورۃ سلمیۃ (مجموعہ مقالات) مقدمۂ تفہیم القرآن، مستقبل کی تعمیر میں طلبہ کا کردار وغیرہ:-

ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۶۹ء

عُلمائے مراکش کے سوالات

[رابطۃ العلماء مراکش کے علماء اور مذہبی رہنماؤں کی تنظیم ہے اس کے سربراہ مراکش کے نامور عالم دین اور ادیب شہیر استاذ عبداللہ کنون ہیں طنجہ میں اس تنظیم کا مرکز ہے اور ملک کے مختلف حصّوں میں اس کی شاخیں قائم ہیں مراکش کے تمام دینی حلقے بلا استثناء اس تنظیم سے وابستہ ہیں۔ المیثاق کے نام سے اس کا ایک ہفتہ وار اخبار طنجہ سے نکلتا ہے۔ رابطۃ العلماء کا ایک وفد سیکرٹری جنرل شیخ ابن سعید العلوی کی قیادت میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ۲۱ ستمبر ۱۹۶۹ء کو ملا۔ اس وفد کی طرف سے مولانا محترم کی خدمت میں ایک سوالنامہ پیش کیا گیا تھا وہ سوالنامہ اور مولانا کے جوابات]

سوال:۔

آپ ہمیں جماعت اسلامی پاکستان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب:۔

جماعت اسلامی کو قائم ہوئے ۲۸ سال ہو چکے ہیں۔ اس جماعت کا مقصد اسلام کو اس کی پوری شکل اور رُوح کے ساتھ زندگی کے ہر پہلو میں قائم کرنا ہے خواہ اس کا تعلق عقائد و

عبادات سے ہو یا اخلاق اور معاشرت سے، تمدن و تہذیب سے، یا سیاست اور معیشت سے یا صلح و جنگ سے ہم دین کو ایک پورا نظامِ زندگی سمجھتے ہیں ۔ اسے اجزاء میں تقسیم نہیں کرتے اور اس کے کسی شعبے کو دوسرے شعبے کی بہ نسبت کم قدر و قیمت کا حامل نہیں مانتے اس دین کو پوری طرح قائم کرنے کے لئے جماعت اسلامی ہر میدان میں کام کر رہی ہے وہ عقائد اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے بھی کوشاں ہے سیاسی نظام کی اصلاح کی کوشش بھی کر رہی ہے اور اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لئے تمام ممکن تدابیر عمل میں لا رہی ہے ۔

سوال۔

کیا پاکستان میں دوسری اسلامی تحریکیں ہیں ؟ اور کیا ان کے درمیان تعاون و یکجہتی ہے ؟

جواب:

دوسری اسلامی تحریکیں بھی پاکستان میں کام کر رہی ہیں ۔ ایک تحریک علماء میں کام کر رہی ہے ——————— جس کا نام اتحاد العلماء ہے ۔ ایک اور تحریک طلبہ میں کام کر رہی ہے جس کا نام اسلامی جمعیت طلبہ ہے ۔ ایک اور تحریک کسانوں میں کام کر رہی ہے جس کا نام کسان بورڈ ہے ایک اور تحریک مزدوروں میں کام کر رہی ہے جس کا نام لیبر آرگنائزیشن ہے ۔ جماعت اسلامی کا اب ان سب کے ساتھ بہت گہرا تعاون ہے اس کے علاوہ متعدد سیاسی جماعتیں ملک میں قائم ہیں جو اپنا مقصد جمہوریت اور اسلامی نظام کا قیام قرار دیتی ہیں سیاسی میدان میں جماعت اسلامی اور ان کے درمیان تعاون ہو رہا ہے ملک میں علماء کی بھی متعدد جماعتیں ہیں جن میں سے صرف ایک اشتراکیت کی حامی ہے اور ہر معاملہ میں اشتراکیوں کا ساتھ دے رہی ہے باقی تمام جماعتیں ان کی اس پالیسی کی مخالف ہیں ۔ اور علماء کی عظیم اکثریت اسلامی نظام

کے قیام کی خواہاں اور اس کے لئے کوشاں ہے۔

سوال:۔

جماعت اسلامی نے کتنی کتابیں شائع کی ہیں اور کتنے اخبارات و رسائل جاری کئے ہیں؟

جواب:۔

جماعت اسلامی نے اب تک تقریباً دو سو سے زائد کتابیں شائع کی ہیں جو قریب قریب معاشرے کے ہر عنصر کی ضروریات اور حالات کو پورا کرتی ہیں۔ کچھ اہلِ قانون کے لئے ہیں اور کچھ خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے۔ کچھ اہلِ سیاست کے لئے ہیں اور کچھ اہل قانون کے لئے۔ کچھ عوام کے لئے ہیں اور کچھ عورتوں اور بچوں کے لئے۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی کا لٹریچر ۱۹ زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو رہا ہے جن میں سے تین یورپین زبانیں ہیں، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی۔ کچھ ایشیائی زبانیں ہیں، عربی، فارسی، ترکی، انڈونیشی اور جاپانی۔ کچھ افریقی زبانیں ہیں، سواحلی اور ہاؤسا اور برِصغیر ہند و پاکستان کی زبانیں ہیں۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے مختلف لوگ بنگلہ، انگریزی، اردو اور سندھی میں متعدد ہفتہ وار، ماہوار اور دوماہہ پرچے شائع کر رہے ہیں۔ ایک خاص پرچہ ماہوار عورتوں کے لئے اور ایک ماہانہ بچوں کے لئے ہے۔

سوال:۔

کیا جماعت کے اندر عورتوں کی کوئی تنظیم بھی ہے اس کی سرگرمیوں اور طریق کار کی کیا تفصیل ہے؟

جواب

جماعت کی ایک شاخ مستقل طور پر عورتوں کے لئے ہے جن کے اجتماعات مردوں سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ ان میں عورتیں ہی قرآن و حدیث کا درس دیتی ہیں اور عورتوں میں اشاعتِ دین کا کام کرتی ہیں مردوں کے اجتماعات میں اگر عورتیں مدعو کی جائیں تو وہ

پردے کے پیچھے بیٹھتی ہیں۔ جماعت سے تعلق رکھنے والی خواتین حجابِ شرعی کی پوری پابندی کرتی ہیں اور بے پردگی کے خلاف مسلسل جدوجہد کر رہی ہیں۔ ان میں نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بھی شامل ہیں جن میں سے بعض علومِ عصریہ میں ایم۔ اے ہیں اور بعض ڈاکٹرنیاں بھی ہیں یہ سب مردوں اور عورتوں کی مخلوط سوسائٹی سے، اور بے پردگی سے قطعی مجتنب ہیں۔ وہ غیروں کے سامنے سر اور منہ بھی نہیں کھولتیں جسے عرب ملکوں نے حلال کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں جو عورتیں مغربی تہذیب میں غرق ہو چکی ہیں وہ بھی منی اسکرٹ نہیں پہنتیں اور نہ غسل کے لباس میں علانیہ نہاتی ہیں پورے پاکستان میں آپ کو ایک مسلمان عورت بھی ایسی نہیں ملے گی جو اسکرٹ استعمال کرتی ہو کجا منی اسکرٹ بے شک انہوں نے سر کھول دیا ہے اور بانہیں بھی برہنہ کر لی ہیں لیکن غنیمت ہے کہ ایران، ٹرکی اور عربی ممالک کی طرح ابھی تک ان کی پنڈلیاں نہیں کھلی ہیں۔

سوال:۔

کیا حکومتِ پاکستان دیوانی اور فوجداری معاملات میں اسلامی قانون نافذ کرتی ہے؟

جواب:۔

نہیں، انگریزوں کے زمانے میں صرف احوالِ شخصیہ (پرسنل لا) تک اسلامی قانون کا استعمال محدود ہو گیا تھا اور وہی کیفیت اب تک باقی ہے۔

سوال:۔

آپ نے ان اسلامی ملکوں کا دورہ کیا ہے اُن میں اسلام سے انحراف کس حد تک پایا جاتا ہے نیز اُس انحراف کو ختم کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب:۔

تمام بلادِ اسلامیہ میں جہاں بھی میں گیا ہوں یا تو اسلام سے کھلا کھلا انحراف پایا جاتا ہے اور اگر اسلام کا اعتقاد اور اس سے محبت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خواہش موجود ہے تو وہ

زبان اور عمل کے تناقض کی شکار ہے۔ یہی اصل غفلت ہے اس حالت کو بدلنے کا طریقہ میرے نزدیک وہی ہے جسے جماعت اسلامی نے پاکستان میں اختیار کر رکھا ہے۔

سوال: وہ کون سا بنیادی طریق کار ہے جسے مسلم اقوام کو اختیار کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنی حکومتوں سے یہ تسلیم کرائیں کہ اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی، عقیدہ بھی ہے اور نظام بھی، مصحف بھی ہے اور سیف بھی؟

جواب:

تمام مسلمان قوموں کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں اور ان کے حکام پر یہ بات واضح کر دیں (جس طرح بھی مختلف ملکوں کے حالات میں ممکن ہو) کہ جب تک وہ اسلام کے مطابق کام نہیں کریں گی اس وقت تک ان کو کسی پہلو میں بھی قوم کی تائید حاصل نہ ہو سکے گی۔ کوئی حکومت بھی دنیا میں نہ طاقتور ہو سکتی ہے نہ کامیاب، جب تک اس کی پالیسی قوم کے عقیدے اور ضمیر سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ جو حکومت اپنی قوم کے ضمیر اور عقیدے کے خلاف چلتی ہے اس کی ساری قوتیں اپنے ہی گھر میں اپنی ہی قوم کے خلاف لڑنے میں ضائع ہو جاتی ہیں اور اس کا کوئی قدم ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس کی نمایاں ترین مثال اسرائیل کے مقابلے میں عرب ریاستوں کی پے در پے شکستیں ہیں جو ۱۹۴۸ء سے وہ مسلسل کھا رہی ہیں، حالانکہ اسرائیل میں یہودیوں کی تعداد ڈھائی ملین سے زیادہ نہیں ہے اور عرب ۱۱۰ ملین ہیں۔ اگر اس پر بھی مسلمان حکمرانوں کی آنکھیں نہ کھلیں تو یہ مزید تباہیوں کو دعوت دینے کی ہم معنی ہے۔ اللہ ان لوگوں کو اپنی تائید سے محروم کر دیتا ہے جو اس کی کتاب رکھتے ہوئے بھی اس سے منہ موڑ رہے ہیں۔

سوال:

تعلیمی کانفرنس کی قراردادوں اور فیصلوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: ـــــ قراردادیں اور سفارشیں ساری اچھی ہیں میں نے خود بھی ان سے

اتفاق کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اپنی آخری تقریر میں کہا ہے، اصل چیز تنفیذ ہے اور ان کی تنفیذ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ بلادِ اسلامیہ میں جو لوگ مختلف جماعتوں کو چلا رہے ہیں ان کے اندر اخلاص اور اسلامی روح موجود ہو اور وہ فی الواقع عمل کا ارادہ کریں۔

سوال :-

مسلمان سربراہوں کی کانفرنس کے لئے آپ کون سے بنیادی خطوط تجویز کرتے ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنے فیصلے صادر کرے ؟

جواب :-

اس بات کو میں اپنی اس تقریر میں بیان کر چکا ہوں جو سانحہ مسجد اقصیٰ کے عنوان پر میں نے حال میں کی ہے اور اس کا عربی ترجمہ مراکش کے بعض اخبارات میں شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ اب سے دو تین سال پہلے میں نے ۱۳-۱۴ تجاویز اس وقت پیش کی تھیں جب سومالی لینڈ کے صدر اور شاہ فیصل کی طرف سے مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس منعقد کرنے کی تحریک ہوئی تھی میں نے ان تجاویز میں متعدد ایسے مسائل کی نشاندہی کی تھی جو تمام عالمِ اسلامی کے مشترک مفاد سے تعلق رکھتے ہیں اور جنہیں مسلمان حکومتیں مل کر ہی حل کر سکتی ہیں۔

سوال :-

شاہ حسن ثانی کے عام مواقف اور خاص طور پر اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے لئے ان کی دعوت کے بارے میں پاکستانی مسلمانوں کے تاثرات کیا ہیں ؟

جواب۔

اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کو شکست کے موقع پر جتنے بیانات بھی عالمِ اسلامی کے اکابر کی طرف سے شائع ہوئے تھے ان میں سب سے زیادہ جس بیان کو پاکستانیوں نے پسند کیا وہ مولائی حسن الثانی کا بیان تھا اور اب پورا پاکستان سربراہوں کی اس کانفرنس

کے انعقاد پر شاہ حسن کی تعریف کر رہا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ ان کی اس سعی میں برکت عطا فرمائے۔

سوال:۔

عالم اسلامی اور علی الخصوص مراکش میں پائے جانے والے اخلاق انحطاط اور فسق و فجور کے مظاہر کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے۔

جواب:۔

بلادِ عربیہ اور بعض دوسرے بلاد اسلامیہ میں عورتوں کی بے پردگی اور بے حیائی کا فتنہ جس حد کو پہنچ گیا ہے اور علانیہ فسق و فجور کے جو مظاہر ہو رہے ہیں انہیں دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید مسلمان اُس عذاب کو بھی کافی نہیں سمجھتے جو مغربی استعمار کی شکل میں اُن پر نازل ہوا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے اس عذاب سے اُن کو نجات دے دی، وہ کسی مزید اور سخت تر عذاب کو دعوت دے رہے ہیں۔ خصوصاً مجھے عربی بولنے والی قوموں پر سخت حیرت ہوتی ہے جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے۔ اور جن کی زبان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے، وہ براہ راست خود دیکھ سکتے ہیں کہ عورتوں کے متعلق اللہ اور اس کے رسول نے کیا ہدایات دی ہیں۔ غیر عرب مسلمان تو پھر بھی یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ وہ قرآن و حدیث کی زبان سے ناواقف ہیں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اہلِ عرب خدا کے سامنے اس بے حیائی کے لئے کیا عذر پیش کریں گے جو ان کی موجودہ نسل اختیار کر رہی ہے۔

سوال:۔

رابطۃ العلماء کے ارکان کے لئے آپ کی نصیحت اور مشورہ کیا ہے؟

جواب:۔

رابطۃ العلماء کو میری نصیحت یہ ہے کہ یا تو وہ خود ایک سیاسی جماعت کی حیثیت

سے اٹھیں اور اپنے بل بوتے پر اقامت دین کی دعوت اہل مراکش کو دیں۔ یا اگر کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ تعاون کریں تو اس شرط کے ساتھ کریں کہ وہ تناقض اور نفاق سے بری ہو کر سیدھا سیدھا اسلام قائم کرنے کے لئے تیار ہو۔ اس کی پالیسی بنانے میں علماء کو دخیل ہونا چاہیئے کہ وہ فقط سیاسی پارٹیوں کے ڈھاگوبن کر رہیں یا اپنے اثر سے مسلمانوں میں ان کا اعتماد تو قائم کر دیں مگر ان کی پالیسی بنانے میں ان کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ علماء علوم عصریہ سے واقفیت پیدا کریں تاکہ موجودہ نوجوان نسل کو وہ سمجھ سکیں اور ان کی مشکلات کو حل کر سکیں۔ اگر علماء نے اس معاملے میں غفلت برتی تو صرف پرانے طرز کے دیندار ان کے ساتھ رہ جائیں گے اور نئی نسل کو راہ راست دکھانے میں وہ ناکام ہو جائیں گے۔ علماء کو یہ استعداد اپنے اندر پیدا کرنی چاہیئے کہ وہ نئی نسل کو اپنی بات سمجھا سکیں اور ان کی ذہنیت کے مطابق ان کی تفہیم کر سکیں۔

(ترجمان القرآن نومبر ۱۹۶۹ء)

ریاض یونیورسٹی کے ۵۵ رکنی وفد کی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کیساتھ سوال و جواب کی نشست

سوال:۔

کیا جماعت اسلامی صرف پاکستان میں قائم ہے یا غیر ممالک میں بھی جماعت اسلامی کی سرگرمیاں ہیں۔؟

جواب:۔

جماعت اسلامی کا زیادہ کام تو پاکستان ہی میں ہے لیکن ہندوستان اور سیلون میں بھی جماعت اسلامی کے نام سے جماعتیں قائم ہیں۔ ان کا ہمارے ساتھ کوئی تنظیمی تعلق نہیں لیکن ان کے افکار و نظریات بھی وہی ہیں جو ہماری جماعت کے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کے کئی دوسرے ملکوں میں ہماری دعوت ہماری کتابوں اور لٹریچر کی صورت میں پہنچ رہی ہے اور ہمارے کارکن بھی موجود ہیں لیکن وہاں جماعت اسلامی قائم نہیں ہے۔

سوال:۔

اس وقت اسلام کو فکری اور عسکری اعتبار سے جو زبردست چیلنج درپیش ہے آپ کے خیال میں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو مستقبل میں کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے؟

جواب:

اگر مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہوں تو وہ صرف بیرونی طاقتوں کے فکری تسلط سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے ہیں بلکہ اپنے افکار سے دنیا کو متاثر بھی کر سکتے ہیں اسی طرح اگر مسلمان واقعی مسلمان بن جائیں تو وہ اپنے سے دس گنا بڑی طاقت سے لڑ کر اسے شکست بھی دے سکتے ہیں۔

سوال۔

اس وقت دنیا طاقت کے مختلف کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے، مذہب کے خلاف زبردست سیلاب ہے۔ مسلمان باہمی کشمکش اور انتشار سے دوچار ہیں اور افکار و نظریات کا فساد ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے اس صورت حال کے پیش نظر مسلمان ممالک ایسی خارجہ پالیسی کس طرح مرتب کر سکتے ہیں جس پر اسلامی رنگ غالب ہو؟۔

جواب۔

میرے نزدیک سب سے مقدم یہ ہے کہ جتنے مسلمان ملک ہیں ان کا نظام حکومت اسلامی ہو اگر دنیا کے چالیس مسلمان ملک صحیح معنوں میں اسلامی ملک بن جائیں وہ بجائے خود ایک عظیم بلاک اور عظیم طاقت بن سکتے ہیں۔

آپ کے پاس دولت کی کمی نہیں آپ سے پاس وسائل کی کمی نہیں آپ کے پاس دماغوں کی کمی بھی نہیں، آپ ایک ناقابلِ تسخیر قوت بن سکتے ہیں بشرطیکہ آپ اسلام کے سچے پیرو کار بن جائیں۔

سوال۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن کریم اور سائنسی نظریات میں تعارض ہے۔ لیکن تعارض کے اس نظریئے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود غلطیوں پر مشتمل ہے آپ کا اس ضمن میں کیا خیال ہے؟ ۔

جواب:۔

جس حد تک میں نے مطالعہ کیا ہے میرے علم میں آج تک کوئی مثال ایسی نہیں آئی ہے کہ جس سے مجھے قرآن کریم اور سائنس کے مابین تعارض محسوس ہوا ہو اگر تعارض ہے تو وہ سائنس کے نظریات سے ہو سکتا ہے۔ حقائق FACTS کا اسلام سے کوئی تعارض نہیں ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ سائنس کے نام پر جو نظریہ قائم کیا گیا ہو وہ واقعی حقیقت بھی ہوا ہیئے کہ میرے علم میں ایسے سائنسی نظریات آئے ہیں کہ جو پہلے درست سمجھے جاتے تھے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ غلط تھے اور یہ عین ممکن ہے کہ جو نظریات آج حرف آخر سمجھے جا رہے ہیں وہ کل غلط ثابت ہو جائیں۔

آجکل کے زمانہ میں بعض مفسرین کا یہ خیال ہے کہ قرآن پاک کی تعبیر و تفسیر نظریات کے مطابق ہو اور سائنسی نظریات کا یہ حال ہے کہ وہ ادلتے بدلتے رہتے ہیں آج ایک نظریہ ہے، تو کل دوسرا چنانچہ اس طرح قرآن کی تعبیر و تفسیر میں غلط چیزیں شامل ہو جاتی ہیں، اس لئے میں ایسے تمام لوگوں کو غلطی پر سمجھتا ہوں جو قرآن مجید کو آج کل کے یا کسی زمانے کے نظریات پر ڈھالتے ہیں قرآن جس چیز کو جس انداز سے بیان کرتا ہے اسے اسی طرح بیان کرنا چاہیئے۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ قیامت تک قرآن کی پیش کردہ کسی حقیقت کی کسی سائنسی نظریئے سے تردید نہیں کی جا سکے گی۔

سوال:۔

آپ نے اب تک کس قدر کتابیں لکھیں ہیں؟

جواب:۔

میں نے کیا لکھا کتنا لکھا، یہ میں آپ کو اس لئے نہیں بتا سکتا کہ میں نے کبھی اس کا حساب نہیں رکھا۔

سوال:۔

معلوم ہوا ہے کہ آپ سیرت نبوی پر کتاب لکھ رہے ہیں اور اس کی دو جلدیں شائع بھی

ہو چکی ہیں کیا آپ بتائیں گے کہ سیرت نگاری میں آپ کا اسلوب کیا ہے؟

جواب:۔

دراصل معاملہ یہ ہے کہ آج تک میں نے رسول اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو مقالے یا مضمون لکھا ہے میرے دو رفقاء نے ان سب کو یکجا مرتب کر دیا ہے میں نے جب اس کو دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کے اندر ربط نہیں ہے اس لئے کہ مختلف اوقات اور مختلف حالات میں لکھے گئے تھے چنانچہ میں ان میں ربط پیدا کرنے اور مختلف حصوں کے درمیان خلا کو بھر کر اسے ایک مسلسل کتاب بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اس کتاب کی تالیف سے میرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح میں نے قرآن کی تفسیر میں یہ دکھایا ہے کہ یہ ایک تحریکی کتاب ہے اسی طرح اب میں سیرت میں دکھانا چاہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک تحریک کے قائد کی سی ہے اور ان کی سیرت ایک تحریک کے قائد کی سیرت ہے۔

سوال:۔

ہم چاہتے ہیں کہ آپ کشمیر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں اور یہ بتائیں کہ وہ کس طرح ہندوستان کے چنگل سے رہائی حاصل کر سکتا ہے؟

جواب۔

کشمیر کا معاملہ یہ ہے کہ ایک ہمارے طاقتور ہمسایہ نے ہماری کمزوری کو دیکھ کر ہمارے جسم کے ایک حصے پر قبضہ کر لیا ہے اور اس سے نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم اتنی طاقت حاصل کر لیں کہ جس کی مدد سے اپنا چھینا ہوا حق واپس لے سکیں اس لئے کہ ہمارا حریف دلیل سے ماننے والا نہیں وہ حق و صداقت کی زبان نہیں سمجھتا وہ صرف طاقت کی دلیل سے مانتا ہے۔

(''ایشیا'' لاہور ۷ مارچ ۱۹۷۶ء)

سقوط مشرقی پاکستان

- سقوطِ مشرقی پاکستان کے اسباب
- کیا نام نہاد "بنگلہ دیش" کو تسلیم کر لینا چاہیئے؟
- تسلیم کرنے کے فائدے کیا ہیں؟
- تسلیم کرنے کے نقصانات کیا ہیں؟

روزنامہ "جسارت" کراچی کی طرف سے قائدِ تحریکِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی" کی خدمت میں المیۂ مشرقی پاکستان اور نام نہاد "بنگلہ دیش" کے بارے میں چند سوالات بھیجے گئے ہیں جن کے جوابات مولانا نے مرحمت فرمائے مولانا کے جوابات روزنامہ "جسارت" کراچی کے شکریہ کے ساتھ افادۂ عام کے لئے شائع کئے جا رہے ہیں۔

سوالنامہ

- آپ کی رائے میں سقوطِ مشرقی پاکستان کا بنیادی سبب کیا ہے؟
- کیا المیۂ مشرقی پاکستان کے پیچھے کوئی بین الاقوامی سازش کارفرما تھی؟ اگر ایسا تھا تو اس کو عملی جامہ پہنانے میں پاکستان کے کن کن عناصر اور کن شخصیتوں نے تعاون کیا؟
- بھارتی جارحیت سے روسی سامراجیت کے کھلا کھلم تعاون اور امداد کے باوجود اس مقصد سے دلچسپی رکھنے والی دیگر بڑی طاقتوں چین و امریکہ نے پاکستان کی مدد سے کیوں گریز کیا کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ غداری اور سازش سے باخبر تھے؟
- کیا نام نہاد "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرنا پاکستان کے مفاد میں ہے؟
- کیا موجودہ حالات میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے دوبارہ اتحاد کی توقع کی جا سکتی ہے اگر ایسے امکانات ہیں تو مغربی پاکستان کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے؟

سقوط مشرقی پاکستان کے اسباب

سقوط مشرقی پاکستان کا بنیادی سبب یہ ہے کہ جس اسلام اور اسلامی قومیت کے تصور پر پاکستان بنا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اول روز سے ہی اس کو طاقت پہنچانے اور مضبوط کرنے سے صرف گریز ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کی ــــــ جڑوں کو روز بروز کمزور کیا جاتا رہا اور دشمنوں کو پورا موقع دیا گیا کہ وہ باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ ان جڑوں کو کاٹتے رہیں۔ مشرقی پاکستان میں خود ہندو کافی تعداد میں موجود تھے۔ اور اچھے خاصے طاقتور تھے۔ ان کو پاکستان کا بننا سخت ناگوار تھا اور وہ اس کو ختم کرنے کے کسی ممکن موقع کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہتے تھے مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں ان کے بہت سے شاگرد موجود تھے۔ ان کے ذہن ہندو استادوں کی تعلیم اور ہندو مصنفین کے بنگلہ لٹریچر سے پوری طرح متاثر تھے۔ ہندوستان یہ بھی جانتا تھا کہ مشرقی پاکستان، پاکستان کا کمزور ترین حصہ ہے۔ اور وہاں اس دو قومی نظریئے کو جس پر پاکستان بنا ہے، زیادہ آسانی کے ساتھ زک پہنچائی جا سکتی ہے اس غرض سے یے قیام پاکستان کے بعد ہی کلکتہ سے ایسا لٹریچر بارش کی طرح برسنا شروع ہو گیا جو اس نظریئے کی بیخ کنی کرنے والا تھا۔ ان سب لوگوں کی کوشش یہ تھی کہ بنگالی زبان کی بنیاد پر مسلمان بنگالی اور ہندو بنگالی کو ملا کر ایک قوم بنایا جائے اور اس کے اندر غیر بنگالی مسلمانو اور مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کا زہر پھیلایا جائے۔

پاکستان کے حکمرانوں نے ایک دن بھی اس ابھرتے ہوئے خطرے کو محسوس نہ کیا اور نہ اس کے تدارک کی کوئی فکر کی۔ درس گاہوں میں، صحافت میں اور وسائل نشر و اشاعت میں یہ زہر مسلسل پھیلتا رہا۔ ہمارے کارفرماؤں نے نہ تعلیم کے نظام کی اصلاح کی، نہ دیکھا کہ درس گاہوں میں کیسے استاد درس دے رہے ہیں، نہ اس بات کا کوئی نوٹس لیا کہ طلباء کی کیسی کھیپ اُن سے تیار ہو کر نکل رہی ہے، نہ ان خیالات کی اشاعت سے کوئی خطرہ محسوس کیا جو ہندو زدہ بنگلہ لٹریچر اور بنگالی قوم پرستی کو ہوا دینے والی صحافت کے ذریعہ

سے پھیل رہے تھے۔

کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ مشرقی پاکستان میں یہ پروپیگنڈہ شروع ہوا کہ مغربی پاکستان اسے لوٹے کھا رہا ہے۔ اس سلسلے میں نہایت ہوشیار لوگوں نے جھوٹے سچے اعداد و شمار مرتب کر کے بڑے پیمانے پر پھیلائے جو کالجوں کے طلبہ اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں اور سرکاری ملازموں کے نوکِ زبان پر چڑھ گئے۔ بچے بچے نے ان کو رٹ رکھا تھا۔ جس سے بھی بات کرنے کا اتفاق ہوتا وہ فرفر ان کو سُنانا شروع کر دیتا حکومت پاکستان کو بار بار توجہ دلائی گئی کہ وہ ان اعداد و شمار کی تحقیق کرے، اگر ان میں کوئی صداقت ہے۔ تو فوراً ان معاشی و مالی شکایات کی تلافی کر لی جائے جو وہاں کے لوگ پیش کرتے ہیں اور اگر وہ جھوٹے اعداد و شمار ہیں تو ان کو بروقت تردید کر کے صحیح اعداد و شمار شائع کئے جائیں، مگر آخر وقت تک اس پروپیگنڈے کے مقابلے میں کوئی مستند چیز شائع نہیں کی گئی۔

اس کے بعد خواجہ ناظم الدین مرحوم کو بیک بینی و دو گوش نکال باہر پھینکنے، محمد علی بوگرہ مرحوم کے ساتھ ذلت آمیز برتاؤ کرنے ۱۹۵۴ء کے دستور کی منظوری سے پہلے ہی مجلس دستور ساز کو توڑ ڈالنے کے واقعات پے در پے پیش آئے جن سے فطری طور پر مشرقی پاکستان کے سیاسی عناصر اور تعلیم یافتہ لوگوں نے یہ تاثر لیا کہ مغربی پاکستان کے لوگوں نے اقتدار پر کلیتہً قبضہ کر لیا ہے اور ان کا صوبہ محض ایک ماتحت کالونی بن کر رہ گیا ہے اس تاثر کو ۵۸ء کے فوجی انقلاب اور ایوب خاں صاحب کی دس سالہ آمریت نے اور زیادہ مستحکم کر دیا۔

علیحدگی کی طرف ایک اور قدم اور بڑا موثر قدم مخلوط انتخاب تھا۔ ۱۹۵۶ء میں جس طرح پاکستان کی سیاسی پارٹیوں نے مِل جُل کر ایک دستور بنایا تھا۔ اور اس میں اسلام کی بنیاد پر نظامِ حکومت تعمیر کرنے کی جو بناء رکھی گئی تھی۔ اسے اگر کام کرنے کا موقع دیا جاتا تو شاید ان اسباب کی تلافی کی جا سکتی جو ملک کے دونوں حصّوں کو علیحدگی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

لیکن سہروردی صاحب اور سکندر مرزا صاحب نے زبردستی مخلوط انتخاب کا قانون پاس کرا کے اس دستور میں ایک ایسی نقب لگا دی جس سے وہ پاکستان کی وحدت برقرار رکھنے کے لئے کوئی خدمت انجام دینے کے قابل نہ رہا ہم نے اس وقت یہ سمجھانے کی انتہائی کوشش کی کہ مخلوط انتخاب پاکستان کے لئے مہلک ثابت ہوگا۔ اس کے بجائے جداگانہ انتخاب باقی رہنا چاہیئے، بلکہ وہ بھی اس طرز کا نہ ہونا چاہیئے جو انگریزوں نے ہندوستان میں رائج کیا تھا کہ ایک طرف مسلمان تنہا ہوں اور دوسری طرف تمام غیر مسلموں کو ملا کر ایک کر دیا جائے جس کا پورا فائدہ اونچی ذات کے ہندوؤں کو حاصل ہو، بلکہ مسلمان، اونچی ذات کے ہندو، آدی باسی ہندو (شیڈولڈ کاسٹ)، عیسائی، بودھ سب کے الگ الگ حلقہ ہائے انتخاب ہونے چاہئیں۔ اور آبادی کی بنیاد پر ان کو جداگانہ نمائندگی دینی چاہیئے۔ لیکن ان لوگوں کے پیش نظر یہ تھا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کسی طرح نہ چلنے پائے اور یہ ایک سیکولر ریاست ہی بن کر رہے۔ اس لئے مشرقی اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں کی سخت مخالفت کے باوجود انہوں نے مخلوط انتخاب کا قانون پاس کر کے چھوڑا۔ یہ اگرچہ اصولی حیثیت سے پورے پاکستان ہی کے لئے غلط تھا۔ لیکن عملاً اس کا اصل نقصان مشرقی پاکستان کو پہنچا تھا۔ اور اسی کے واسطہ سے پورا پاکستان اس سے متاثر ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں غیر مسلم آبادی بڑی تعداد میں موجود تھی اور بہت با اثر تھی۔ وہاں مخلوط انتخاب سے دو نتیجے برآمد ہوئے ایک یہ کہ اس نے وہاں مسلم اور غیر مسلم کو ملا کر ایک جغرافی قومیت کی بنا ڈال دی۔ دوسرے یہ کہ انتخاب میں اس نے اسلامی نظریہ کے حامیوں کی کامیابی وہاں سخت دشوار اور سیکولر نظریہ کے حامیوں کی کامیابی نہایت آسان بنا دی۔ کیونکہ اسلامی نظریہ کے حامیوں کا انحصار بالکل مسلمانوں کے ووٹوں پر ہو گیا۔ اور سیکولر نظریات کے حامی لوگوں کے لئے بیس سے تیس فیصد تک غیر مسلم ووٹ قطعی یقینی ہو گئے جب کہ مسلمانوں کے ووٹ دونوں گروہوں میں بہرحال تقسیم ہونے تھے۔ یہاں اس بات کو نگاہ میں رکھنا چاہیئے کہ مشرقی

اور مغربی پاکستان کی وحدت اسلامی نظریہ کے حامیوں کی کامیابی پر ہی موقوف تھی سیکولر نظریہ کے حامی تو ہر حال پاکستانیت پر بنگالیت کو ترجیح دینے والے ہی ہو سکتے تھے اس طرح مخلوط انتخاب کا قانون پاس ہوتے ہی مشرقی پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کا رنگ بالکل بدل گیا جن پارٹیوں کے لئے بھی انتخاب جیتنا اصلی اہمیت رکھتا تھا انہوں نے اسلام کا نام تک زبان پر لانا چھوڑ دیا تاکہ وہ غیر مسلم ووٹوں سے محروم نہ ہو جائیں ۔

اس کے بعد جب ۶۶ء میں ایوب خاں صاحب کے خلاف تحریک کا آغاز ہوا تو شیخ مجیب الرحمٰن صاحب اپنے چھ نکات لے کر اٹھ کھڑے ہوئے جو صریحاً مشرقی پاکستان کو علیحدگی کی طرف لے جاتے تھے۔ اس کے مقابلے میں تحریک جمہوریت (پی۔ ڈی۔ ایم) نے مشرقی پاکستان کے سیاسی عناصر کی تائید اور خود عوامی لیگ کی موافقت سے آٹھ نکات کا پروگرام پیش کیا جو ملک کی وحدت کو باقی رکھتے ہوئے مشرقی پاکستان کو اس سے زیادہ حقوق دیتا تھا جو مجیب الرحمان صاحب نے چھ نکات میں مانگے تھے مگر ایوب خاں کی حکومت نے محض حزب اختلاف میں پھوٹ ڈالنے کی خاطر چھ نکات کا اتنا زبردست پروپیگنڈا کیا کہ آٹھ نکات اس کے مقابلے میں دب گئے اور مشرقی پاکستان کے لوگ بالعموم بغیر سمجھے بوجھے چھ نکات کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگے۔ بغیر سمجھے کے الفاظ میں اس لئے استعمال کرتا ہوں کہ یہ ہمارا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ کہ مشرقی پاکستان میں جاہل عوام تو درکنار، اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ چھ نکات ہیں کیا جن کی وہ تائید کر رہے ہیں صرف پروپیگنڈا کا ایک طلسم تھا جس نے ان کو مبتلائے فریب کر رکھا تھا، ورنہ جس پڑھے لکھے آدمی کو بھی ہم نے چھ نکات اور آٹھ نکات کا فرق اچھی طرح سمجھایا وہ مان گیا کہ ہمارے آٹھ نکات ان سے بہتر طور پر مشرقی پاکستان کو اس کے جائز حقوق دلواتے ہیں ۔

پھر جب ایوب خان صاحب کے خلاف تحریک نے زور پکڑا اور آٹھ جماعتوں کی شرکت سے جمہوری مجلس عمل (ڈی۔ اے۔ سی) بنی تو ان سب جماعتوں نے

بالاتفاق دو سیاسی مطالبات پیش کئے۔ ایک یہ کہ صدارتی نظام کے بجائے پارلیمنٹری نظام قائم کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ بنیادی جمہوریتوں کے بجائے بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات ہوں۔ انہی دو نکات کی تائید ملک کی رائے عام نے ایک پرزور ایجی ٹیشن کے ذریعے سے کی جس سے عاجز آکر ایوب خاں صاحب گول میز کانفرنس منعقد کرنے پر مجبور ہوئے۔ کانفرنس میں انہوں نے دونوں مطالبات تسلیم کرکے یہ فیصلہ کیا کہ جلدی سے جلدی مرکزی اسمبلی بلاکر ۱۹۶۲ء کے دستور میں ان مطالبات کے مطابق ترمیم کردیں گے۔ اگر اس وقت یہ کام ہوجانے دیا گیا ہوتا تو ملک ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ جاتا اور جمہوریت بحال ہوجاتی۔ لیکن گول میز کانفرنس کے اندر بھی اور اس کے باہر بھی ایسے عناصر موجود تھے جنہوں نے اس کانفرنس کو ناکام کردیا اور نتیجہ میں بحالیٔ جمہوریت کے بجائے ملک کو ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کا مارشل لا ملا جس کی باگیں یحییٰ خاں صاحب اور ان کے چند فوجی اور سیاسی مشیروں کے ہاتھ میں تھیں (ملک کو اب تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ دراصل یہ مشیر لوگ کون تھے۔)

اس کے بعد یحییٰ خاں صاحب کی حماقتوں کا سلسلہ شروع ہوا جس نے ملک کو تباہ کرکے چھوڑا۔ انہیں ابتدا ہی میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ ۱۹۵۶ء کا دستور بحال کرکے جلدی سے جلدی انتخابات کرالیں اور نیا دستور بنانے کا تجربہ ان نازک حالات میں نہ کریں مگر وہ نہیں مانے اور نیا دستور بنانے ہی پر مصر رہے پھر بعض اہم دستوری مسائل کا فیصلہ انہوں نے بطور خود کر ڈالا جن میں سے ایک فیصلہ جو پاکستان کی قسمت پر بڑا دوررس اثر ڈالنے والا تھا وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی مساوات (PARITY) کو بیک جنبش قلم ختم کر ڈالنا تھا حالانکہ یہ تصفیہ دونوں بازوؤں کے لیڈروں نے طویل گفت و شنید اور بڑے غور و خوض کے بعد کیا تھا۔

۶۹ء کے پورے سال میں انہوں نے مشرقی پاکستان میں مارشل لا کی پالیسی اتنی

ڈھیلی ڈھالی رکھی کہ فوج کا رعب بالکل ختم کر دیا اور متعدد بار فوجی احکام کی اعلانیہ خلاف ورزیاں کر کے وہاں کے مفسد عناصر نے پورا اندازہ کر لیا کہ وہ فوج کے مقابلے میں بے خطر سرکشی کر سکتے ہیں۔

۱۹۷۰ء کے آغاز میں یحییٰ صاحب نے لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت انتخابات کرانے کا اعلان کیا اور انتخابی جدوجہد کو حدود کا پابند رکھنے کے لئے مارشل لا کا ضابطہ نمبر ۶۰ جاری کیا لیکن پورے ایک سال کی طویل انتخابی جدوجہد کے دوران میں نہ ضابطہ نمبر ۶۰ پر عملدرآمد ہوا اور نہ لیگل فریم ورک آرڈر کی پابندی کرائی گئی اگرچہ مجیب الرحمان کا پورا پروگرام اس فریم ورک کے حدود سے باہر تھا مگر اسی کی بنیاد پر انہیں انتخابی مہم جاری رکھنے کی کھلی چھوٹ دے دی گئی، ایک سال تک مجیب الرحمان زبردستی انتخاب جیتنے کے لئے تمام ہتھکنڈے استعمال کرتے رہے اور مشرقی پاکستان کی فوجی حکومت تماشائی بنی رہی اس کے برائے نام بھی کوئی ایسی تدبیر اختیار نہ کی کہ انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہو سکیں تقریباً یہی غلطی مغربی پاکستان میں بھی کی گئی جس سے اس امر کا پورا خطرہ پیدا ہو گیا کہ علاقائی پارٹیاں بھاری اکثریت میں انتخاب جیت جائیں گی اور اس کے جیتنے کے بعد پاکستان کا ایک ملک رہنا قریب قریب ناممکن ہو جائے گا۔ پھر مجیب الرحمان نے پورے ایک سال تک اپنی انتخابی مہم مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کی بنیاد پر اتنے زور شور سے چلائی۔ کہ جب انتخابات میں وہ پورے پاکستان کی سب سے بڑی پارلیمانی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے کامیاب ہو کر نکلے تو ان کے لئے آل پاکستان لیڈر کی پوزیشن اختیار کرنا قطعی ناممکن ہو گیا۔

ان پے در پے حماقتوں کے باعث جب دسمبر ۱۹۷۰ء میں انتخابی نتائج وہی برآمد ہوئے جو ان حماقتوں کا لازمی نتیجہ تھے تو پھر حماقتوں کا ایک دوسرا سلسلہ شروع ہو گیا جس نے ۱۹۷۱ء کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے پاکستان کی وحدت کا خاتمہ کر دیا۔ چھوٹی موٹی باتوں کو چھوڑ کر میں

ان چند بڑی حماقتوں کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جو اس اندوہناک نتیجے کی موجب بنیں۔

(۱) جب یحییٰ صاحب کے اپنے ہی منعقد کرائے ہوئے انتخابات کے نتائج برآمد ہو چکے تھے تو خواہ وہ ان کی توقعات کے کتنے ہی خلاف ہوتے لازم تھا کہ وہ ان کے بعد جلدی سے جلدی اسمبلی کا اجلاس بلاتے اور اسمبلی کے اندر ہی دستور سازی کا کام شروع کرا دیتے اس صورت میں کچھ نہ کچھ امکان تھا کہ کھلے مباحثوں میں کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر ہر ایک اپنے ایک انتہائی نقطہ نظر سے ہٹ کر بیچ کی کسی بات پر مصالحت کر لیتا لیکن ایسا نہ ہونے دیا گیا اور اسمبلی کے باہر بند کمروں میں مذاکرات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا جو بدقسمتی سے دستوری مسائل کے تصفیئے سے بہت کم متعلق تھا اور کچھ دوسرے ہی امور پر لین دین کے معاملات سے تعلق رکھتا تھا۔

(۲) اسمبلی کا اجلاس منعقد کرنے کی تاریخ کا اعلان کر دینے کے بعد صرف ایک پارٹی کے لیڈر کے اصرار پر کسی دوسری تاریخ کا تعین کئے بغیر اسے منسوخ کر دینا ایک بہت بڑی اور انتہائی تباہ کن غلطی تھی جس کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جاسکتی۔

(۳) جس پارٹی کے لیڈر کے کہنے پر اجلاس ملتوی کیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یا تو اجلاس ملتوی کیا جائے یا دستور سازی کے لئے ۱۲۰ دن کی قید ختم کر دی جائے۔ لیکن یحییٰ صاحب نے دوسری صورت اختیار کرنے کے بجائے اجلاس کی تاریخ ملتوی کرنے ہی کو ترجیح دی کوئی صاحب عقل آدمی نہ اس وقت سمجھ سکا نہ اب سمجھ سکتا ہے کہ ایک دوسری بات کو ترجیح دینے کی وجہ کیا تھی۔

(۴) مجیب الرحمٰن جو آگ مشرقی پاکستان میں بھڑکا چکے تھے وہ خود ان کے قابو میں نہ رہی تھی ہندو اور کمیونسٹ اور دوسرے مفسد عناصر اس حد تک حالات پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے کہ اسمبلی کے التواء کا شاہ بہ لگتے ہی انہوں نے یک لخت بغاوت شروع کر دی اور مجیب الرحمان خواہ چاہتے ہوں یا نہ چاہتے ہوں انہیں اس سیلاب میں بہنا پڑا، کیونکہ اپنی وابستگی کے

راستے وہ خود اپنی حماقتوں سے بند کر چکے تھے اور حالات کو ان مفسدین کے ہاتھوں میں دے چکے تھے جو مشرقی پاکستان کو پورے پاکستان کا حکمران بنانے کے بجائے پاکستان سے الگ کرنے ہی پر تلے ہوئے تھے حالانکہ اگر شیخ مجیب الرحمان میں کوئی تدبر ہوتا، یا حالات ان کے قابو سے نہ نکل گئے تھے تو اسمبلی کے التواء کی کڑوی گولی صبر کے ساتھ نگلی جاسکتی تھی ذرا تحمل سے کام لیا جاتا تو یحییٰ خان صاحب کو بہرحال کبھی نہ کبھی اسمبلی بلانی ہی پڑتی اور ظاہر ہے کہ اس وقت مجیب الرحمان ہی اکثریت کے لیڈر ہونے کی حیثیت سے پاکستان کے لیڈر ہوتے۔

(۵) یکم مارچ سے ۲۵ مارچ تک کے واقعات کچھ پرانے نہیں ہیں اور ان کا بیشتر حصہ کچھ چھپا ہوا بھی نہیں ہے۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر رائے قائم کرسکتا ہے کہ اس دوران میں جو گفت و شنید ہوئی اس میں یحییٰ صاحب، مجیب الرحمٰن اور بھٹو صاحب تینوں ملک کو تقسیم کے راستے ہی پر لئے جارہے تھے ایک ملک میں دو اکثریتی پارٹیاں ایک ملک کی دو دستور ساز اسمبلیاں ایک ملک کے دو وزیراعظم، حتیٰ کہ اُدھر تم اِدھر ہم کا علی الاعلان پیش کش۔ یہ اور دوسری ایسی ہی تجاویز ایک ملک کے دو ملک ہی بنا دینے والی تھیں لیکن یہ گتھی کسی طرح نہیں سلجھ رہی تھی کہ دو ملک بن کر بھی یہ ایک ملک کیسے رہے گا۔

(۶) انہی گفتگوؤں کے دوران میں اچانک یحییٰ صاحب نے نہ معلوم کس کے یا کس کس کے مشورے سے فوجی کارروائی کا فیصلہ کر ڈالا۔ یہ فیصلہ غالباً یکم مارچ کی بغاوت شروع ہوتے ہی وہ کر چکے تھے اور ۲۵ مارچ تک گفت و شنید صرف اس لئے ہوتی رہی کہ اس دوران میں فوجی کارروائی کی تیاری کرلی جائے۔ لیکن یہ ایک فیصلہ تھا جس کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ نہ کوئی صحیح قسم کا فوجی دماغ اس نوعیت کا فیصلہ کرسکتا تھا نہ سیاسی دماغ۔ فوجی کارروائی کے وقت مشرقی پاکستان میں صرف آٹھ دس ہزار فوج تھی بعد میں ہوائی جہازوں سے (اور کچھ مدت تک بحری جہازوں سے بھی) فوج اور سامانِ جنگ بھیجنے کا

سلسلہ شروع کیا گیا۔ ہوائی جہازوں کی پرواز فوری ہی میں ہندوستان نے اپنے علاقے سے ممنوع قرار دے دی تھی اور ہمارے جہازوں کو سیلون کے راستے اڑ کر جانا پڑتا تھا ان ذرائع سے فوج تو بھیجی جا سکتی تھی لیکن اتنا سامانِ جنگ نہ بھیجا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بڑی جنگ کے لئے کافی ہو سکتا اور یہ بات ابتدا ہی میں سمجھ لینی چاہئیے تھی کہ کسی نہ کسی مرحلے پر ہندوستان وہاں فوجی مداخلت کرے گا جس سے جنگ کی صورت میں مشرقی پاکستان کا دفاع تقریباً ناممکن ہو جائے گا کیونکہ دورانِ جنگ میں کسی نوعیت کی کوئی مدد بھی وہاں لڑنے والی فوج کو نہ بھیجی جا سکتی تھی۔

(۷) فوجی کارروائی کے بعد چند ہی ہفتوں میں ہماری فوج نے باغیوں پر قابو پا لیا تھا اور ملک میں امن قائم ہو گیا تھا لیکن یکایک تمام مجرموں اور باغیوں کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا گیا اس کے بعد نہ صرف بنگال کے باغی بلکہ ہندوستان میں تربیت پائے ہوئے گوریلے اور خود ہندوستانی فوج کے بے وردی سپاہی کثیر تعداد میں اعلٰے درجے کا اسلحہ لے کر مشرقی پاکستان میں سیلاب کی طرح گھستے چلے آئے اور فوج ان سے نمٹنے میں بُری طرح الجھ گئی۔ ہندوستان نے جب یہ محسوس کیا کہ صرف یہ نام نہاد "مکتی باہنی" پاکستان کی باقاعدہ فوج کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ تو ۲۲۔ نومبر کو کسی اعلانِ جنگ کے بغیر اس کی فوج مشرقی پاکستان پر حملہ آور ہو گئی سوال یہ ہے کہ اس عام معافی کا کس عقلمند نے حکومت کو مشورہ دیا تھا۔

(۸) یحیٰی خان صاحب نے مشرقی پاکستان پر ہندوستان کے باقاعدہ حملے کے بعد بھی مغربی پاکستان سے کوئی حملہ ہندوستان پر نہیں کیا اور اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ وہ مغربی پاکستان پر بھی حملہ آور ہو جائے پھر جب اس نے ادھر بھی حملہ کر دیا تو ہمارے جنرل صاحب مدافعانہ جنگ کرتے رہے جس میں انہوں نے مغربی پاکستان کا بھی کئی ہزار مربع میل علاقہ کھو دیا پھر جب ۱۶ ردسمبر کو سقوطِ ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) کے بعد ہندوستان نے یکطرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا تو دوسرے دن انہوں نے بھی جنگ بندی کر دی۔

حالانکہ شروع سے نظریہ یہ چلا آرہا تھا کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان ہی سے کیا جاسکتا ہے اور اس طرف ہندوستان جب بھی حملہ آور ہوا اس طرف سے اس پر اتنے زور کا حملہ کیا جائے گا کہ وہاں سے دباؤ ہٹانے پر مجبور ہو جائے لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ اس نظریہ پر کیوں عمل نہیں کیا گیا بہرحال یہ سب پر روشن ہے کہ مغربی پاکستان میں جنگ دانستہ نہیں کی گئی۔

(۹) آخری چیز جو مشرقی پاکستان کے سقوط اور ہمارے ہزار ہا فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے کو روک سکتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ روس یا پولینڈ ہی کی قراردادوں کو سلامتی کونسل میں قبول کر لیا جاتا۔ اس طرح بین الاقوامی مداخلت سے جنگ بند ہو جاتی دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے علاقے خالی کر دیتیں۔ اور کوئی سیاسی تصفیہ ہو جاتا لیکن ہمارے نائب وزیراعظم اور وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ان قراردادوں کو پھاڑ دیا اور اس کا خمیازہ ہم کو یہ بھگتنا پڑا کہ مشرقی پاکستان بزور شمشیر فتح ہوا اور پاکستان کی پوری فوج ہزارہا سول ملازمین سمیت قیدی بن گئی اس نتیجہ کو آخر کس کی دانائی یا نادانی قرار دیا جائے۔

اس مختصر تاریخی بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سقوط مشرقی پاکستان نہ کوئی اتفاقی امر تھا اور نہ محض فوری اسباب کا نتیجہ۔ بلکہ قیام پاکستان کے بعد سے اس المیہ کے وقوع تک ہر دور میں مسلسل ایسی غلطیاں کی جاتی رہیں جن کی بدولت ہمیں بالآخر یہ روز بد دیکھنا پڑا ان غلطیوں میں ہر ایک کا کیا حصہ رہا ہے وہ میرے اوپر کے بیان سے ظاہر ہے۔

کیا بیرونی سازشوں کا بھی اس میں کوئی ہاتھ تھا؟

ہندوستان کے متعلق تو یہ روز اول سے معلوم ہے کہ وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لئے مسلسل ایک باقاعدگی کے ساتھ کام کر رہا تھا اور خود مشرقی پاکستان کے ہندو اور ہندو زدہ مسلمان اس سکیم میں اس کے آلۂ کار بنتے ہوئے تھے بعد میں امریکہ اور برطانیہ دونوں نے اس میں دلچسپی لینی شروع کی اور برسوں وہ اس

کے لئے کام کرتے رہے۔ آخر میں عین وقت پر روس بیچ میں آ کودا اور وہ ان دونوں مغربی طاقتوں کی پکائی ہوئی کھیر چٹ کر گیا۔ تاہم برطانیہ اب بھی مسلسل اس کے لئے کوشاں ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی مکمل ہو جائے اور پاکستان اسے تسلیم کر لے پاکستان میں جو لوگ علیحدگی کے خواہاں اور اس کے لئے کوشاں تھے ان میں سے ہر ایک کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس کے ہاتھ میں کھیل رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً سب ہی طاقتوں کے ساتھ ان کے ربط ضبط کی اطلاعات پردۂ خفا سے باہر آتی رہی ہیں حتیٰ کہ خواجہ ناظم الدین صاحب مرحوم کئی سال پہلے یہ خبر دے چکے تھے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لئے سازشیں کی جا رہی ہیں۔

ان تمام بیرونی طاقتوں کے علاوہ ایک اور طاقت بھی پاکستان کی بیخ کنی کے درپے تھی جس کی عملی دلچسپی کا ظہور بہت آخر میں منظر عام پر آیا مگر اندر اندر وہ مدتوں سے اس کام میں لگی ہوئی تھی اور وہ تھی عالمی یہودیت جو پاکستان کو عربوں کی حمایت کی سزا دینے پر تلی ہوئی تھی۔

ہماری ہمدرد طاقتوں نے کیوں مدد نہ کی:۔

روس جس طرح یکایک کھل کر بھارت کی مدد کے لئے میدان میں آ گیا اس کو دیکھ کر دوسری بڑی طاقتوں نے غالباً "وضع احتیاط" اختیار کرلی کیونکہ عالمی جنگ کا خطرہ مول لئے بغیر وہ اس برہنہ جارحیت کو نہیں روک سکتی تھیں چین کے لئے تنہا ہندوستان اور روس سے لڑنا ممکن نہ تھا۔ رہا امریکہ، تو صدر نکسن کے ذاتی رجحانات خواہ کچھ ہوں جب تک یہودی امریکہ کے سر پر سوار ہیں اس وقت تک وہ امریکہ کو پاکستان کی حمایت میں انگلی تک نہ ہلانے دیں گے یہ امید کرنا صحیح نہ ہوگا کہ نئے انتخابات میں پھر چار سال کے لئے صدر بن جانے کے بعد مسٹر نکسن پاکستان کی کوئی خاص مدد کریں گے۔

کیا بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینا چاہیئے:۔

نام نہاد "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرنا پاکستان کے لئے کچھ بھی مفید نہیں ہے البتہ اس کے

نقصانات بہت زیادہ ہیں۔

لیکن نقصان اور فائدے کی بحث تو بعد کی ہے پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ جس ملک کے ایک حصے کو دو بیرونی طاقتوں نے مل کر زبردستی اس سے الگ کیا ہو۔ کیا اس کی علیحدگی کوئی باغیرت اور باعزت ملک تسلیم کر سکتا ہے؟ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ہم بیرونی جارحیت کے آگے ہتھیار ڈال رہے ہیں اس کو سند جواز عطا کر رہے ہیں اور آئندہ کے لئے یہ مثال قائم کر رہے ہیں کہ ہمارے ملک کا کوئی اور حصہ بھی خدانخواستہ اسی طرح جارحیت کے ذریعے الگ کیا گیا تو ہم اسے بھی تسلیم کر لیں گے۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ بنگلہ دیش ایک حقیقت بن چکا ہے اس لئے اب اسے مان لینا چاہیئے۔ دنیا میں زبردست کا ہر ظلم ایک حقیقت ہوتا ہے، کمزور اس حقیقت کو طاقت سے نہیں مٹا سکتا، مگر کمزور میں کوئی حمیت ہو تو وہ ایسی حقیقتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسرائیل ایک حقیقت بن چکا ہے اور عربوں میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اسے خلاف حقیقت بنا سکیں مگر ۲۵ سال سے انہوں نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ اور پاکستان نے بھی آج تک اسے تسلیم نہیں کیا۔ مشرقی جرمنی بھی ایک حقیقت بن چکا ہے اور مغربی جرمنی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس حقیقت کو بدل سکے مگر اس نے اب تک اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ تائیوان (فارموسا) بھی ایک حقیقت ہے مگر چین اسے تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوا۔ ایک قوم کو در کنار ایک شخص کے مکان کا ایک حصہ بھی زبردستی اگر اس سے الگ کر لیا جائے تو خواہ وہ اسے واپس لینے پر بالکل قادر نہ ہو وہ یہ تسلیم نہیں کرے گا۔ کہ یہ زبردستی الگ کیا ہوا حصہ اب اس کے مکان کا حصہ نہیں ہے اور وہ اس کی واپسی کے ہر دعوے سے بخوشی دستبردار ہوتا ہے یہ ایک ایسی اصولی بات ہے جسے نفع و نقصان کی میزان پر تولنا ہماری پہلی اور بنیادی کمزوری ہوگی

تسلیم کرنے کے بیان کردہ فائدوں کی حقیقت۔

اب برسبیل تنزل دیکھئے کہ کیا اس میں نفع کا کوئی پہلو بھی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ہم

اپنے بھائیوں سے آخر کیسے بے تعلق ہو جائیں؛ ہمیں ان سے کوئی نہ کوئی تعلق تو رکھنا ہی ہو گا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ "بنگلہ دیش" کو تسلیم کر کے ہماری حکومت ڈھاکے میں جن لوگوں سے تعلق پیدا کرے گی۔ وہ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی نہ ہونگے۔ بلکہ ہندوستان کے فرمانبردار ایجنٹ ہوں گے۔ اصلی بنگالی مسلمان تو وہاں ہمارے سفارتخانے کے آس پاس بھی نہ پھٹک سکے گا نہ ہم اس کے قریب جا سکیں گے۔ ہمارے ساتھ کوئی رابطہ اگر وہاں کے عام مسلمانوں میں سے کسی نے قائم کیا تو وہ اس کی عبرتناک سزا پائے گا۔ ہم کو اپنے سفارتخانے کا عملہ بھی یہاں سے لے جانا پڑے گا اور وہ اس طرح سی آئی ڈی کی نگرانی میں ہوگا کہ گویا وہ زیر حراست بنگالی عملے کی خدمات ہم حاصل کریں گے تو اس کا ایک ایک فرد جاسوس ہوگا۔ پس ہمیں بتایا جائے کہ کن بھائیوں سے وہاں تعلق قائم ہوگا اور کیسے ہوگا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس تعلق سے ہم کو معاشی فائدے حاصل ہونگے لیکن یہ ایک خیالِ خام ہے آپ اپنے لئے کوئی ایسا خام مال وہاں سے درآمد نہیں کر سکتے جس کی آپ کو ضرورت ہے اور ہندوستان بھی اسے حاصل کرنے کا خواہاں ہے مثلاً پٹ سن یا چمڑا البتہ جس مال کا ہندوستان خواہاں نہیں ہے وہ آپ جتنا چاہیں وہاں سے منگوا سکتے ہیں مثلاً چائے، پان، چھالیا، کتھا وغیرہ دوسری طرف آپ کی مصنوعات میں سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوسکتی جو ہندوستان وہاں برآمد کرنا چاہتا ہے، نہ آپ کے خام مال سے کوئی ایسی چیز وہاں جا سکتی ہے جو ہندوستان سے یا ہندوستان کے ذریعے سے وہاں فراہم ہوسکتی ہو ہندوستان نے اسے آپ سے اس لئے نہیں چھینا ہے کہ وہ آپ کے لئے منڈی بنا رہے وہ اسے اپنی منڈی بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔ اور اس نے ۲۵ سال کا معاہدہ کر کے اسے اس کا پابند بنا لیا ہے۔ اب حساب لگا کر دیکھ لیا جائے کہ یہ تجارت ہمارے لئے کتنی مفید ہوگی اور اس کے بغیر ہمارا کیا نقصان ہوگا۔؟

یہ فائدہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے ہم اپنے جنگی قیدی واپس لے لیں گے لیکن یہ ہماری بہت بڑی غلطی ہے کہ ہم نے خود کسی معقول وجہ کے بغیر جنگی قیدیوں کے معاملہ کو "بنگلہ دیش" کے معاملے سے وابستہ مان لیا، حالانکہ یہ کسی طرح بھی اس سے وابستہ نہ تھا نہ ہے۔ ۱۶ دسمبر کو جب پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈالے اس وقت کسی بین الاقوامی قانون یا کسی قانونی اصول کے مطابق کوئی "بنگلہ دیش حکومت" موجود نہ تھی، نہ اس وقت کی مکتی باہنی کی مسلمہ قاعدہ کی رو سے کسی ملک کی برسر جنگ "فوج" کی تعریف میں آتی ہے قانونی طور پر ہتھیار صرف ہندوستان کی فوج کے آگے ڈالے گئے ہیں۔ ہمارے جنگی قیدی ہندوستان کے جنگی قیدی ہیں اور جنیوا کنونشن کی رو سے ہندوستان بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی شرط تو درکنار کسی معاہدۂ صلح کی شرط بھی ان کی رہائی کے لئے عائد کرنے کا مجاز نہیں ہے حکومت پاکستان اگر اپنے قیدیوں کی رہائی کے لئے ہندوستان کے ڈالے ہوئے بے جا اڑنگوں کے آگے سر تسلیم خم کرتی جائے گی۔ تو بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ قیدی نہ چھوٹیں گے بلکہ ہندوستان مزید شرائط عائد کرتا چلا جائے گا یہاں تک کہ وہ ساری باتیں منوا کر چھوڑے گا جن کے لئے اس نے ان قیدیوں کو یرغمال بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ میں جنگی قیدیوں کی خواتین پر حیران ہوں جو یہ سمجھ رہی ہیں کہ بنگلہ دیش تسلیم کرتے ہی ان کے بھائی، بیٹے، شوہر سب کے سب واپس آجائیں گے۔ کیا انہوں نے اخبارات میں نام نہاد بنگلہ دیش کے وزراء اور خود مجیب الرحمان کے یہ بیانات نہیں سنے کہ پاکستان خواہ "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرے یا نہ کرے، قیدیوں پر مقدمے ضرور چلائے جائیں گے۔ یہ بھی اخبارات میں آچکا ہے۔ کہ اس غرض کے لئے چار ہزار قیدیوں کی فہرست بنائی گئی ہے جن پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ ہماری ان بہنوں میں سے کسی کو معلوم ہے کہ اس فہرست میں ان کے کسی عزیز کا نام شامل نہیں ہے؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ صدر بھٹو نے بھی دبی زبان سے یہ کہہ دیا ہے کہ "بنگلہ دیش" والے کچھ قیدیوں پر مقدمہ چلانا چاہتے ہیں، تو چلالیں۔

تسلیم کرنے کے نقصانات :-

اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ ان پرفریب فائدوں کے مقابلہ میں "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرنے کے نقصانات کیا ہیں۔

(۱) ہم شاید دنیا کی وہ پہلی قوم ہوں گے جس نے اپنی ملک کے زبردستی چھینے ہوئے حصے کی علیحدگی کو اس ذلت کے ساتھ قبول کیا ہوگا۔

(۲) ہم اپنے جبراً چھینے ہوئے حصے کو بالکل خلافِ واقعہ آزاد ریاست تسلیم کریں گے حالانکہ دراصل وہ آزاد ریاست نہیں ہے نہ ہندوستان نے اس کو آزاد ریاست بنانے کیلئے فتح کیا ہے دراصل وہ ایک مفتوحہ ریاست ہے۔ ہندوستان کے تحت اس کی حیثیت برطانوی ہند کی دیسی ریاستوں سے بھی بدتر ہے دنیا کے دکھاوے کے لئے اسے "آزاد ریاست" بنا کر رکھا جائے گا۔ مگر اسے ہر معاملہ میں ہندوستان کی مرضی کے تابع رہنا ہوگا۔ اور اس کے مفادات کی خدمت کرنی پڑے گی۔ جب تک شیخ مجیب الرحمٰن اس کی خواہشات کی بندگی کرتے رہیں گے حکومت ان کے ہاتھ میں رہے گی جونہی انہوں نے آزادی کی راہ اختیار کی ان کا حشر شیخ عبداللہ کا سا ہوگا۔ اور وہاں ان کی جگہ لینے کے لئے بہت سے بخشی اور صادق موجود ہیں۔

(۳) ہمارا بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا آپ سے آپ اس بات کا ہم معنی ہوگا کہ صدر بھٹو صاحب کی بعض حالیہ تصریحات نے اس معنی کو اور زیادہ تقویت پہنچا دی ہے) کہ دراصل مشرقی پاکستان کے باشندے پاکستان سے الگ ہونا چاہتے تھے اس کے لئے انہوں نے آزادی کی جنگ لڑی اور پاکستان کی فوج نے جب اس تحریکِ آزادی کو کچلنے کی کوشش کی تو ہندوستان نجات دہندہ بن کر آیا اور اس نے ان کو آزاد کرا دیا یہ سب کچھ قطعی خلاف واقعہ ہوگا اور اس پوزیشن کو تسلیم کر کے ہم خود اپنا منہ کالا کر کے جارح ہندوستان کو (جسے اقوام متحدہ کے ۱۰۴ ملکوں نے بھی جارح قرار دیا ہے) سرخرو بنا دیں گے اصل حقائق جو بھی کچھ پرانے نہیں

ہوئے ہیں اور جن کو ساری دنیا دیکھتی رہی ہے وہ یہ ہیں کہ ۱۹۷۰ء میں ایک متحدہ پاکستان کے لئے یحییٰ صاحب کے لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت انتخابات ہوئے تھے۔ شیخ مجیب الرحمان اور ان کی عوامی لیگ نے ان انتخابات میں حصہ لیا۔ شیخ صاحب نے سارے مشرقی پاکستان میں اپنے چھ نکات کو اس حیثیت سے پیش کیا کہ یہ پاکستان کو اور زیادہ مضبوط و مستحکم بنانے کا پروگرام ہے علیحدگی کی خواہش کا کبھی اشارۃً و کنایۃً بھی وہاں کے عوام کے سامنے نام تک نہیں آیا انتخابات میں مجیب الرحمٰن کی پارٹی کو ووٹ حاصل ہوئے ان میں ہندو ووٹ تو (جو اوسطاً ۲۰ سے ۳۰ فیصد تک تھے) ضرور علیحدگی کی نیت سے دیئے گئے ہوں گے۔ مگر مسلمان ووٹروں نے ہرگز علیحدگی کے لئے ووٹ نہیں دیئے تھے۔ بلکہ مجیب الرحمان کے بیان کے مطابق ۶ نکات کو پاکستان کے مزید استحکام کا پروگرام سمجھتے ہوئے دیئے تھے۔ آزادی کا اعلان مارچ ۱۹۷۱ء کی بغاوت کے بعد بھی مجیب صاحب نے نہیں کیا۔ بعد میں بنگالی ہندوؤں نے، تعلیم یافتہ مسلمان بنگالیوں کی ایک محدود تعداد نے (سب نے نہیں) اور ہندوستان کے داخل کردہ گوریلوں نے اس تحریک کو بغاوت برائے آزادی کا رنگ دے دیا۔ اور ہندوستان ان کو مال سے، اسلحہ سے، حتیٰ کہ اپنے بے وردی فوجیوں سے بھی پے در پے مدد دیتا چلا گیا۔ اس طرح دراصل یہ ہندوستان کی برپا کرائی ہوئی بغاوت تھی جسے آخرکار اس نے براہِ راست حملہ کر کے کامیابی کی منزل تک پہنچایا پس درحقیقت یہ باشندگانِ مشرقی پاکستان کی تحریکِ آزادی تھی ہی نہیں۔ نہ ہندوستان کی اس کارروائی کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان کے مسلمان واقعی آزاد ہوئے ہیں یہ ان کا آزاد بنگلہ دیش نہیں ہے بلکہ ہندوستان کا غلام بنگلہ دیش ہے۔

اس نام نہاد بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے ہم دوہری غلطی کریں گے۔ ایک یہ کہ ہندوستان کو جارحیت کے بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ جرم سے بری الذمہ کر دیں گے دوسرے یہ کہ خود اپنی فوج کو اور اپنی صوبائی حکومت کو جس نے مارچ ۱۹۷۱ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک اپنے وطن کا دفاع

اور نظم و نسق کا انصرام کیا تھا مجرم بنوا دیں گے۔ اور ہمارے اپنے بے جا اور سراسر غلط اعتراف کی بدولت بنگلہ دیش کی نام نہاد حکومت ان پر مقدمہ چلانے میں حق بجانب قرار پائے گی۔

۵۔ ہم یہ فعل کر کے مشرقی پاکستان کے عام مسلمانوں پر ظلم عظیم کریں گے وہ نہ اُس وقت پاکستان سے الگ ہونا چاہتے تھے جب یہ بغاوت برپا ہوئی تھی اور نہ اب وہ اس علیحدگی پر راضی ہیں جو زبردستی ان پر مسلط کی گئی ہے بغاوت کے زمانے میں وہاں کے عام مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ ان کی عظیم تعداد نے فوج کا ساتھ دے کر ملک کو بچانے کی کوشش کی اور اس راہ میں جان و مال کے بے حساب نقصانات برداشت کئے۔ اب بھی وہاں مزاحمت کی تاریخ موجود ہے اور جس قدر عوام کی تکالیف بڑھ رہی ہیں۔ اسی قدر ان کی مزاحمت بھی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ۵۰ پچاس ہزار کے قریب آدمیوں کا پاکستان کی حمایت کے الزام میں جیلوں میں ڈالا جانا، اور متحدہ پاکستان کے مخالفین تک کا یہ تسلیم کرنا کہ وہاں کم از کم ایک کروڑ آدمی اب بھی پاکستان کے حامی ہیں اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان بالعموم اس زبردستی قائم ہونے والے "بنگلہ دیش" سے راضی نہیں ہیں۔ اس حالت میں ہمارا اس ناجائز ریاست کو تسلیم کرنا ان کو مایوس کر دے گا۔ اور ہم گویا جبراً انہیں ہندوستان کی غلامی میں دھکیل دیں گے۔

۶۔ مشرقی پاکستان میں داخل ہوتے ہی ہندوستان کی فوج نے جو لوٹ مار مچائی اور اس کے بعد خود عوامی لیگ اور مکتی باہنی نے جس طرح وہاں کے عوام و خواص کو لوٹا اور جو شدید گرانی اور عام بدامنی آج وہاں برپا ہے کہ زندوں کو روٹی کپڑا تو درکنار مُردوں کو کفن تک نصیب نہیں ہو رہا ہے اس کی بدولت عام مسلمان ہی نہیں، بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو پہلے علیحدگی پسند ہو گئے تھے، اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ جس

مغربی پاکستان پر برسوں سے استحصال کا الزام لگایا جا رہا تھا اس نے پورے ۲۴ سال میں اس کا ہزارواں حصہ بھی استعمال نہ کیا تھا جواب نام نہاد نجات دہندگان نے چند مہینوں میں کر ڈالا ہے۔ اسی وجہ سے وہاں ہندوستان اور اس کے ایجنٹ بنگلہ دیشیوں کے خلاف عوام کا غصہ روز بروز زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک رہا ہے۔ لیکن ہمارے "بنگلہ دیش" تسلیم کرتے ہی ہمارے خلاف اربوں روپے کے مطالبات پیش کئے جائیں گے اور ہندوستان حساب بنا بنا کر روز بنگلہ دیشیوں کو دے گا پاکستان سے اپنا یہ حصہ مانگو اور فلاں چیز کا مطالبہ کرو۔ پھر اخباروں اور جلسوں میں بے تحاشا شور مچایا جائے گا۔ کہ پاکستان ہمارا حصہ ہمیں نہیں دے رہا ہے اس طرح پوری کوشش کی جائے گی کہ عوام کے غیظ و غضب کا سارا رُخ ہماری طرف مڑ جائے اور اس کے پیچھے وہ ساری شکایات چھپ جائیں جو وہاں کے لوگ موجودہ صورت حال کے خلاف رکھتے ہیں۔

اگر "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرنے کے ان نقصانات میں سے کسی ایک نقصان کی بھی کوئی صاحب تردید کر سکتے ہیں تو براہ کرم ضرور کریں لیکن اگر اس فعل کے یہ سب نتائج ناقابلِ انکار ہیں تو مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے کہ اس کے جو فوائد بیان کئے جاتے ہیں وہ ان نقصانات کے مقابلہ میں کیا وزن رکھتے ہیں

کیا اب مشرقی پاکستان کی واپسی کی کوئی صورت ہے؟

ظاہر بات ہے کہ نہ مشرقی پاکستان پہلے کسی فوجی طاقت سے پاکستان میں شامل ہوا تھا اور نہ اب دوبارہ وہ اس طریقہ سے واپس حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اوّل تو اس کی جغرافیائی پوزیشن ہی ایسی ہے کہ دشمن ہندوستان کے علی الرغم مغربی پاکستان کی طرف سے وہاں فوج کا استعمال ممکن نہیں ہے دوسرے ہمارا اور مشرقی پاکستانیوں کا رشتہ فاتح و مفتوح کا رشتہ نہیں بلکہ برابر کے بھائیوں کا رشتہ ہے جو اپنی رضامندی سے ملے تھے اور اپنی رضامندی ہی سے پھر باہم مل سکتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ خواہ وہ ساری

دنیا "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرلے، ہم اسے تسلیم نہ کریں واضح رہے کہ اگر وہ اقوام متحدہ کا رکن بھی بن جائے تو ہم اسے تسلیم کرنے کے پابند نہیں ہے اس کے بجائے ہمیں کچھ مدت تک صبر کے ساتھ حالات کو ان کے فطری رُخ کی طرف جانے دینا چاہیئے۔ ہندو ایک تنگ نظر، کم ظرف، اور حریص قوم ہے۔ اس کا برتاؤ رفتہ رفتہ مشرقی پاکستان کی عام آبادی ہی کو نہیں، بلکہ بڑے بڑے کٹے بنگلہ دیشیوں تک کو اس سے متنفر کر دے گا اور اس کے ساتھ بنگالی مسلمانوں کا محض ایک مٹھی بھر طبقہ رہ جائے گا جو بدقسمتی سے مسلمانوں کے دشمنوں کو ہر جگہ مل جایا کرتا ہے۔ یہ حالات وہاں پھر ایک پُرزور تحریک آزادی مسلمانوں میں برپا کردیں گے جسے ہم تقویت پہنچانے کی بے شمار تدبیریں اختیار کر سکتے ہیں۔ اس تحریک کو دبانے کے لئے لامحالہ ظلم و ستم ہوگا۔ ہمارا کام یہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہم اس ظلم و ستم کے خلاف دنیا بھر میں آواز اٹھائیں۔ ہندوستان کی تابع فرمان بنگلہ دیشی حکومت اگر اس تحریک کو کچلنے سے عاجز ہوگی۔ تو ہندوستان براہ راست مداخلت کرے گا، اور اس وقت ہم ساری دنیا کو اس سے آگاہ کر سکیں گے۔ کہ جس ریاست کو یہ مکار حکومت آزاد کہتی تھی اب اس میں خود فوجی مداخلت کر رہی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ حالات پیدا ہو سکیں گے جن میں مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کا ہمارے ساتھ پھر کسی نہ کسی کے رشتۂ اتحاد میں منسلک ہو جانا ممکن ہوگا ۔۔۔۔۔۔ والامر بید اللہ ۔

کیا مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان پھر ایک ہو سکتے ہیں

(۱۱ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو ایسٹ پاکستان ہاؤس لاہور میں نوجوانان مشرقی پاکستان کی ایک دعوتِ افطار سے خطاب کرتے ہوئے ان کے دو سوالات کے جوابات)

سوال :-
مشرقی پاکستان میں اس وقت تحریکِ اسلامی کس حال میں ہے اور جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبا کی تنظیمیں کس طرح کام کر رہی ہیں ؟ -

جواب :-
میرے پاس براہِ راست معلومات کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ مختلف ذرائع سے جو خبریں ملی ہیں وہ یہ ہیں کہ خدا کے فضل سے وہاں جماعت اور جمعیت کے جو لوگ بچ گئے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ بہت بڑی تعداد میں بچ گئے ہیں وہ سب از سرِ نو منظم ہو چکے ہیں اور اتنے (DEVOTION) کے ساتھ کام کر رہے ہیں کہ چاہے کھانے یا پہننے کو نصیب نہ ہو لیکن تحریک اسلامی کا کام پوری تندہی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اپنی اپنی تنظیم کی شکل انہوں نے دوسری بنائی ہے کیونکہ جماعت اسلامی وہاں ممنوع ہو چکی ہے اور اس نام سے جماعت وہاں

کام نہیں کر سکتی، اسی طرح اسلامی جمعیت طلبہ کا نام بھی اب ان کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو حیثیت سپین کے سانڈوں کے لئے سُرخ رومال رکھتا ہے۔ اسی لئے اسلامی جمعیت طلبہ بھی اپنے نام سے کام نہیں کر رہی ہے اور اس کام کے لئے ان کا جذبہ وہی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے جو لوگ پہلے ان تنظیموں سے وابستہ تھے ان میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں ہٹا ہے کوئی کسی خطرے سے نہیں ڈرا ہے۔ وہ لوگ برابر اپنے ایمان پر، اپنے عزم پر اور اپنے مقصد پر قائم ہیں جہاں تک اس سلسلے کی تفصیلات کا تعلق ہے وہ مجھے معلوم نہیں ہیں۔ لندن میں پروفیسر غلام اعظم صاحب ملے تھے ان کے پاس بھی یہی معلومات تھیں جو میں نے بیان کر دی ہیں۔

سوال:۔

کیا آپ کے خیال کے مطابق مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کے ساتھ مل سکتا ہے؟ اس کا ملنا ممکن ہے تو کس طرح؟

جواب:۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان مل کر ایک ریاست، ایک معاہدے (AGREEMENT) کی بنا پر بنے تھے انگریزوں کی حکومت رخصت ہونے کے وقت برطانوی حکومت، مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ایک معاہدہ قرار پایا تھا جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان مل کر ایک ملک اور ایک ریاست (STATE) بنے تھے اب یہ صورت پیش آئی کہ ہندوستان نے موقع پا کر اس معاہدے کو توڑ دیا جسے توڑنے کی خواہش قیام پاکستان کے وقت سے وہ رکھتا تھا۔ یہ کام اس نے ملک کے اندر موجود غداروں کے ساتھ سازش کر کے انجام دیا۔ ملک کے اندر غدار موجود تھے، باہر سے ایک عہد شکن طاقت موجود تھی، اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان الگ ہوا ۔۔۔۔۔۔۔ میں نے بارہا اس بات کا اظہار کیا کہ مشرقی پاکستان کو کسی نے فتح کر کے مغربی پاکستان کے ساتھ نہیں ملایا ہے بلکہ وہ اپنی

رضامندی سے ملا ہے۔ فوج اس ملک کو ملا کر ایک نہیں رکھ سکتی۔ آخری مرتبہ اکتوبر ۱۹۷۰ میں میں نے سنت نگر لاہور کی تقریر میں یہ بات کہی تھی کہ فوج کے ذریعے سے بھی اس کو ایک نہیں رکھا جاسکتا ہے ـــــ فوج کی مدد سے کبھی سیاسی مسائل حل نہیں ہو سکتے ـــــ بہت احمق تھے وہ لوگ جنہوں نے یہ سمجھا تھا کہ ہم فوج کی طاقت سے اس کو ملا کر رکھ سکتے ہیں۔ حالانکہ فوجی طاقت استعمال کرنے کا آخری نتیجہ اس کی قطعی علیحدگی ہوتا اور وہ ہو گیا ـــــ

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ دونوں حصے مل کر ایک ملک بن سکتے ہیں تو میرا جواب یہ ہے کہ جب تک دونوں جگہ مشرقی پاکستان میں بھی اور مغربی پاکستان میں بھی، تحریک اسلامی کامیاب نہ ہو جائے دونوں جگہ ایک صحیح اسلامی ریاست نہ بن جائے، اس وقت تک ان کے ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کو لکھ کر رکھ لیجئے۔ کہ چاہے کوئی سیکولر طاقت ہو یا سوشلسٹ طاقت ہو وہ ان دونوں کو ملا کر ایک نہیں بن سکتی نہ پہلے یہ سیکولر اور سوشلزم اور سیکولرزم کی بنیاد پر ایک ملک تھے۔ نہ یہ چیزیں انہیں جوڑ کر رکھ سکیں اور نہ آئندہ وہ ان کے ذریعے سے ایک ملک بن سکتے ہیں۔ پہلے بھی یہ اسلام کا نام لے کر ایک جگہ جمع ہوئے تھے آئندہ بھی یہ اسی طرح ایک ملک بن سکتے ہیں۔ البتہ آئندہ اسلام کے نام سے کام نہیں چلے گا بلکہ اسلام کے کام سے کام چلے گا۔ اگر دونوں جگہ اسلام کا کام کیا جائے تو مشرقی اور مغربی پاکستان ایک ہو سکتے ہیں اور اگر اسلام سے وہی غداری جاری رکھی جائے جو اس سے پہلے رکھی گئی ہے تو ان دونوں کے ملنے سے ہاتھ دھو لیجئے۔

سوال:

جماعت اسلامی گال پر ایک تھپڑ کھا کر دوسرا گال آگے کرنے والی پالیسی کب ختم کرے گی کیا اسلامی جمعیت طلباء کی طرح کام کرنا ہرگز ممکن نہیں؟

جواب:

جماعت اسلامی کوئی عیسائی جماعت تو ہے نہیں جو ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال آگے

کر دے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھئے کہ صبر اور حکمت سے کام لینا اور مضبوط ارادے اور مضبوط کردار سے کام لینا زیادہ مفید ہے بہ نسبت اس کے کہ آدمی بے صبر ہو کر غلط قدم اٹھائے۔ طاقت کا استعمال صحیح موقعے پر جتنا مفید ہوتا ہے غلط موقعے پر ______ اتنا ہی نقصان دہ ہوتا ہے۔ ہماری یہ کوئی پالیسی نہیں ہے کہ ایک تھپڑ کھا کر دوسرا گال پیش کر دیا جائے بلکہ ہماری پالیسی یہ ہے کہ ہم صبر اور مضبوطی کے ساتھ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کریں اور لوگوں کی رائے کو اتنا ہموار کر لیں کہ اس مسلمان معاشرے میں جمہوری طریقے سے نظام کو تبدیل کر سکیں اور ہم انشاءاللہ ایسا کریں گے۔ اگر اللہ تعالےٰ نے مدد فرمائی اور اس کی طرف سے توفیق شامل حال رہی تو انشاءاللہ ایک دن ہم کامیاب ہوں گے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنی مدت لگے گی۔ لیکن بہر حال یہ کام اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کل سورج کو نکلنا ہے۔

سوال:۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ عام طور پر مایوسی اور ذہنی خلفشار کے شکار ہو رہے ہیں انہیں اس (FRUSTRATION) سے نکالنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

جواب:۔

FRUSTRATION (مایوسی اور ذہنی خلفشار) ہمیشہ ایسی حالت میں ہوا کرتا ہے جبکہ لوگ غلط توقعات لے کر چل رہے ہوں اور نتائج ان کی توقعات کے خلاف برآمد ہوں۔ ہمارے ہاں بھی فرسٹریشن اسی طرح ہوا ہے۔ عوام نے کچھ تو ان سے دھوکا کھایا جو روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا رہے تھے۔ اب ظاہر بات ہے کہ جس وقت یہ نعرہ لگایا گیا تھا۔ یہ اسی وقت سے فریب تھا۔ لیکن لوگوں نے اس کی حقیقت کو نہیں سمجھا اب جبکہ ان کا سابقہ اس نعرے کے برعکس حالات سے پڑ رہا ہے تو وہ فرسٹریشن کے شکار ہو رہے ہیں۔ پھر کچھ اور عناصر بھی دھوکا دینے والے یہاں موجود تھے تو جہاں

ایسے ایسے لوگ موجود ہوں وہاں فرسٹریشن لازماً ہوتا ہے مگر ہمیں کوئی فرسٹریشن نہیں ہے کیونکہ ہم کوئی غلط توقع نہیں لئے بیٹھے تھے ہم ایک ایک قدم سوچ سمجھ کر اٹھا رہے تھے ایک ایک چیز جو ہو رہی تھی اس کے نتیجے کو سمجھتے تھے۔ اور اس ملک کے لوگوں کو بتا بھی رہے تھے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے چنانچہ جب وہ نتیجہ برآمد ہوا تو ہمیں کوئی فرسٹریشن لاحق نہیں ہوا ہمیں پورا اندازہ تھا کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے اور جس قسم کی سیاست یہاں چلائی جا رہی ہے اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان الگ ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ ہمیں جو رنج ہوا ہمارا جو حال ہوا اسے وہ علیم و خبیر ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن ہمیں (FRUSTRATION) نہیں ہوا ہم مایوس نہیں ہوئے اسی طرح ہم یہاں کے متعلق بھی جانتے تھے کہ جس طرح کے لوگوں کو برسر اقتدار لایا جا رہا ہے یہ آخر کار ملک کو تباہ کر کے چھوڑیں گے چنانچہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مگر چونکہ ہمیں پہلے سے اندازہ تھا اس لئے جو تباہی نازل ہو رہی ہے اس سے ہم غمزدہ ہیں، ہمارے دل زخمی ہیں لیکن ہم مایوس نہیں ہیں۔ فرسٹریشن میں مبتلا ہونے کے بجائے تباہی کو روکنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

——— فرسٹریشن اور مایوسی ہمیشہ غلط توقعات لے کر بیٹھ جانے سے ہوتی ہے۔

——— اب فرسٹریشن کی یہ کیفیت جو لوگوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ دور کرنے کی براہ راست کوئی کوشش نہیں ہو سکتی۔ یعنی ان کو بتایا جائے کہ بھائی! تم لوگ اس عادت کو چھوڑو کہ جب کوئی دھوکے باز آتا ہے۔ تم اس کے دھوکے میں آجاتے ہو۔ اور جب کوئی ایمانداری کے ساتھ تمہارے سامنے کوئی مخلصانہ پروگرام رکھتا ہے۔ تو تم اس پر توجہ نہیں دیتے جب تک تم اپنی اس روش سے باز نہیں آؤ گے ایک ایک سوراخ سے ڈسے جاؤ گے، اگر ہم لوگوں کو یہ بات سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں اور وہ یہ سمجھ لیں کہ ان کے لئے اخلاص کے ساتھ کام کرنے والے کون ہیں اور ان کو دھوکا دینے والے کون ہیں تو ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ ان کو اس طرح کی مایوسیوں سے سابقہ پیش نہیں آئے گا۔

سوال:۔

کیا اسلامی ریاست قائم کرنے کا مقصد زیر زمین کام کرنے سے حاصل نہیں کیا جا سکتا؟

جواب:۔

یہ بات میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ جب تک ہمت اور جرأت اور عزم و استقلال کے ساتھ برسرزمین (OVER GROUND) کام نہیں کیا جائے گا اسلامی ریاست قائم نہیں ہوسکتی زیر زمین (UNDER GROUND) کام کے نتیجے میں اسلامی ریاست نہیں بن سکتی۔

خاص قسم کے حالات میں زیر زمین کام عارضی طور پر اور کچھ مدت کے لئے کیا جا سکتا ہے مثلاً جیسے حالات اس وقت مشرقی پاکستان کے ہیں وہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک حد تک زیر زمین کام کیا جائے۔ لیکن یہ بھی ایک عارضی مدت کے لئے ہے۔ کیونکہ درحقیقت جب تک برسرزمین کام کرکے عام لوگوں کے خیالات کو تبدیل نہیں کیا جائے گا ان کو پوری طرح ہم خیال نہیں بنایا جائے گا اور معاشرے کو اسلامی نظام کے لئے تیار نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اسلامی ریاست کے قیام کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ـــــــــــ

اسلامی ریاست پہلے بھی جب قائم ہوئی تھی تو وہ برسرزمین کام سے ہی ہوئی تھی۔ زیر زمین کام صرف تھوڑی مدت کے لئے کیا گیا اور کچھ سرفروش اور جانباز آدمی (DEVOTEES) فراہم ہو جائیں۔ اس کے بعد سارا کام برسرزمین کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگوں نے ماریں کھائیں، پتھر کھائے، تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹے گئے، دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹائے گئے۔ سب کچھ ہوا۔ اس سے جو لوگ نکلے وہ ایسے نکلے کہ پھر ان کے مقابلے میں پورے عرب میں کوئی طاقت کھڑی نہ ہوسکی۔ اس طرح کے برسرزمین کام کئے بغیر آپ نہیں چل سکتے۔

ـــــــــ آپ کھلم کھلا اپنا کام کیجئے آپ کے سر پھٹیں گے آپ کو قید کیا جائے گا، آپ کو ننگا کیا جائے گا، آپ کے ساتھ بدتمیزیاں کی جائیں گی۔ ہر قسم کی مصیبتیں بھگتنی پڑیں گی پھر جب ہر قسم کی مصیبتیں بھگتنے کے بعد آپ اپنے عزم پر قائم رہیں گے تو وہ جو مصیبتیں ڈالنے

والے ہیں ان کے اوپر ایسی مصیبت پڑ جائے گی کہ وہ اپنی جان کہاں بچائیں۔ ——————

ایک وقت ایسا آنے والا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انشاء اللہ!۔

(از "ہفت روزہ "آئین" لاہور

۲۳ اکتوبر ۱۹۶۴ء)

مولانا مودودی قاہرہ میں

رشید احمد جالندھری

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سیاحت ارض القرآن میں قاہرہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں ایک پاکستانی مسلمان جناب رشید احمد جالندھری نے کئی ان سے ملاقاتیں کیں اور ان ملاقاتوں کے حال کو انہوں نے معاصر "چٹان" کے صفحات کی زینت بنایا تھا۔ رشید صاحب نے مولانا سے مختلف اوقات میں گفتگو کی اس میں سے مولانا کے متعلق حصے کو معاصر "چٹان" کے شکریے کے ساتھ درج کر رہے ہیں۔

میں :- آپ قرآن پاک کی تفسیریں کن کن تفسیروں پر اعتماد کرتے ہیں؟

مولانا :- میرے پیش نظر طبری، ابن کثیر اور زمخشری کی کشاف رہتی ہیں، طبری اور ابن کثیر تمام روایات کو یکجا کر دیتے ہیں، ابن کثیر مگر رد روایتوں کی نشاندہی بھی کر جاتے ہیں۔

میں :- اردو کی تفاسیر و تراجم میں کونسا ترجمہ ایسا ہے جس میں اسلامی روح بھی ہو اور قرآن کی بلاغت و فصاحت کا عکس بھی ؟

مولانا :۔ (قدرے توقف کے بعد) اگر روح ہے تو فصاحت وبلاغت نہیں ہے اور اگر فصاحت وبلاغت ہے تو تفسیر نہیں۔ ویسے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے نوٹ مفید ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب کی "البیان" بھی اچھی ہے۔ مگر زبان اچھی نہیں۔

یہاں میں نے مولانا شبیر احمدؒ اور مولانا اشرف علی صاحبان کی تفسیر و ترجمہ پر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

میں :۔ اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تفسیر کیسی ہے۔؟

مولانا :۔ میرا خیال ہے کہ ان کی تفسیر جدید پڑھے لکھے طبقہ کو اپیل نہیں کر سکے گی۔ میں نے ان کی تفسیر نہیں دیکھی۔ البتہ صدق میں اس تفسیر کا نمونہ دیکھا ہے۔ (یہاں میں نے تفسیر ماجدی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا اور حوالہ میں "صدق" میں شائع ہونے والے ترجمے کا نام لیا)

مولانا :۔ انھوں نے (عبدالماجد صاحب) اپنی تفسیر میں مولویوں کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے یہ تفسیر کامیاب تفسیر نہ بن سکی۔

میں :۔ اور ان کی انگریزی تفسیر ؟

مولانا :۔ میرا خیال ہے وہ بھی شاید انگریزی داں طبقہ کو اپیل نہ کر سکے

پھر کوئی بات مولانا عبدالماجد کے نام سے شائع ہونے والے مترجم پاروں کے متعلق اٹھی تو مولانا نے کہا۔ میری سمجھ میں تو یہ پارے پارے کی تقسیم بھی نہیں آئی ہاں سورتوں کے لحاظ سے کوئی تقسیم ہو تو بھی کوئی بات ہے۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ لکھنا بے جا نہ ہوگا کہ جب میں نے بعد میں پارے کی تقسیم کا ذکر اپنے دوست مالک رام سے کیا تو انہوں نے کہا یہ تقسیم مولانا عبدالماجد نے نہیں کی بلکہ تاج کمپنی والوں کے ذہن کا اختراع ہے ورنہ مولانا نے

تو ساری تفسیر ان کے حوالے کر دی تھی۔

میں :- اور مولانا آزاد کی تفسیر کیسی ہے۔؟

مولانا :- اس کے بعض مقامات بہت خوب ہیں اور بعض سے ہمیں اختلاف ہے۔

میں :کسی آدمی کی تمام رایوں سے اتفاق نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان کے نفس ترجمہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید کے پر شکوہ اسلوب بیان کو اردو میں منتقل کرنے میں مولانا آزاد[2] کا قلم کامیاب رہا ہے ؟

(میں نے مولانا کے ترجمہ و تفسیر کے محاسن کو بیان کرتے ہوئے ایک تفصیلی مضمون بھی لکھا تھا۔)

مولانا :- ہاں فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ترجمہ کامیاب ہے لیکن بعض مقامات پر مولانا نے بریکٹ میں جو لکھا ہے اس سے ترجمہ طول پکڑ گیا ہے۔ ایسے ہی بعض نوٹ اتنے طویل ہو گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کی توجہ دوسری طرف منتقل ہو جاتی ہے۔

میں :- اور آپ کے اپنے ترجمے کا اسلوب کیا ہے ؟ (میں نے سید صاحب کی تفسیر و ترجمہ نہیں دیکھا۔ اسی لئے یہ سوال کیا تھا۔

مولانا :- میں اپنے با محاورہ ترجمے میں نہ تو قرآن کے الفاظ کا حرفاً حرفاً پابندی کرتا ہوں اور نہ ہی اسے بہت زیادہ آزاد بناتا ہوں بلکہ متن کے (قرآن) مفہوم کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں :- انگریزی میں کونسا معتمد علیہ ترجمہ ہے ؟

مولانا :- واقعہ یہ ہے کہ ایک بھی نہیں۔ جسے ہم دوسروں (غیر مسلم انگریزی داں کے سامنے پیش کر سکیں۔

میں :- کیا آپ اپنے ترجمے کو انگریزی میں منتقل کریں گے ؟

مولانا :- دیکھئے ! چاہتے تو یہی ہیں کام کر رہے ہیں ۔

میں :- ویسے مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر سورۂ فاتحہ کا ترجمہ و تلخیص مسٹر اشفاق حسین اور ڈاکٹر عبداللطیف نے الگ الگ شائع کی ہے ۔ ؟

مولانا :- ہاں ڈاکٹر عبداللطیف میرے دوست ہیں ۔

میں :- سنا ہے مسٹر پرویز صاحب نے بھی ترجمہ کیا ہے ؟

مولانا :- اس ترجمہ کے بارے میں نہ پوچھئے تو اچھا ہے ۔

میں :- آپ پرویز صاحب کو جانتے ہیں ؟

مولانا :- جی ہاں ! خوب جانتا ہوں بلکہ ان کو انٹروڈیوس کراتے میں گناہ گار کا ہاتھ ہے ۔

میں :- مولانا ! آخر ان اسباب و علل کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہئیے ۔ جو پرویز تحریک کے موجب بنے ہیں ؟

مولانا :- آخر کیسے مان لیا جائے کہ اسلام کو گزشتہ تیرہ سو سال میں کسی نے نہیں سمجھا ۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پرویز صاحب قرآن مجید کی آیات تک غلط پڑھتے ہیں ۔ لاہور کے اسلامی مذاکرے میں ان کے خیالات پر خود عربوں نے دہائی دی کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں ۔

یہاں ایک ساتھی نے سید صاحب سے جماعت کے حساب کا ذکر کیا جس کا آپ کے ساتھی مسٹر غلام احمد نے تفصیلی جواب دیا ۔ کہ یہ بے بنیاد خبر کیونکر اڑی اور پھر حقیقت کیونکر ظاہر ہو کر رہی ۔

ایک دوسری آواز ۔

مولانا :- اصلاحی صاحب جماعت سے کیوں الگ ہو گئے ۔ ؟

رشید بھائی یہ قصہ اخباروں میں آچکا ہے۔

مولانا۔ ہاں! اصلاحی صاحب نے اپنے خروج کے اسباب خود ہی بیان کر دیئے ہیں اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہاں پر میں نے سید صاحب کو ان کے موقف پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ میرا آپ کی سابق جماعت سے کوئی لگاؤ تھا اور نہ ہی مولوی نعمانی (جن کے مضامین مدینہ و چٹان میں شائع ہوتے رہتے ہیں) سے کوئی سروکار۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں مولانا آزاد مرحوم کی مثالی شخصیت کے بعد جنہوں نے کبھی کسی کا جواب نہیں دیا آپ دوسرے آدمی ہیں جنہوں نے اس گزشتہ ہنگامے میں سکوت اختیار کیا۔ میں آپ کو آپ کے اس مؤقف پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے میں نے انہی خیالات کا اظہار "چٹان" میں بھی کیا تھا۔ اس لئے حالیہ کلام کسی خوشامد کا نتیجہ نہ سمجھیئے۔

مولانا۔ رشید جالندھری آپ ہیں۔؟ جی ہاں۔ اس کے بعد مولانا نے فرمایا کہ میرا یہ طریق ہی نہیں کہ دوسروں کے خلاف کیچڑ اچھالوں میں اپنے وقت کا بہتر مصرف تلاش کرتا رہتا ہوں۔ بسا اوقات اپنے بارے میں شائع ہونے والے مضامین بھی نہیں پڑھتا۔ صرف اس ڈر سے کہ کہیں شیطان ان کی جوابدہی کے لئے میرے نفس کو نہ اکسائے۔

میں:۔ مولانا! قرآن مجید کے علاوہ آپ عربی کی کس کتاب سے متاثر ہوئے؟

مولانا:۔ میں ابن تیمیہ، ابن قیم اور شاہ ولی اللہ سے متاثر ہوں۔ ابن قیم کی کتاب "اعلام الموقعین" تو یہ ہے۔

مولانا کے اس مشورے سے عربی دان حضرات کو خاص طور پر فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ یہاں پر مرزائیوں کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے مرزا غلام احمد

کی تحریروں میں متوسط ذہن کا آدمی بھی نظر نہیں آیا چہ جائیکہ وہ کچھ اور ہوں ایک مرزا غالب ہیں کہ ہم ان کی تحریروں پہ سر دھنتے ہیں اور ایک مرزا غلام احمد ہیں کہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

مولانا:۔ میرا خیال تھا۔ کہ اردو دان طبقہ اس تحریک سے متاثر نہیں ہوگا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مرزائیوں کے ہاں مرزا غلام احمد کی کتاب "براہین احمدیہ" مرزا کا شاہکار و تصور کی جاتی ہے۔ لیکن اسے بڑی مشکل سے نصف گھنٹہ تک پڑھ سکتا ہوں۔ ژولیدہ عبارت جگہ جگہ حاشیے اور پھر حاشیوں پہ حاشیے۔

مرزائی دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ مولانا کے اس معقول جواب پہ ٹھنڈے دل سے غور و فکر کریں۔

مولانا کے اس جواب کے بعد فلسطین کے تین طالب علم آ گئے جنہوں نے چند دینی سوالات پوچھے۔ مثلاً پردہ کیا ہے۔ جبر و اختیار، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تشریح ؟۔

مولانا نے عربی میں مختصر جواب دیئے۔ ظاہر ہے کہ مولانا پاکستان میں رہتے ہیں۔ جہاں عربی زبان قومی زبان نہیں ہے اس لئے مولانا کہنے کو تو عربی ہی کے الفاظ اردو میں بول رہے تھے لیکن یہ عربی آپ کے مافی الضمیر کی ترجمان بننے سے قاصر تھی۔

ان طالب علموں نے اپنی گفتگو میں روائتی مولویانہ بحث و جدل کی راہ اختیار کی جس سے پوری محفل پر اوس پڑ گئی لیکن مولانا صبر و تحمل اور وقار و متانت سے ایجاز و اختصار سے جوابات دیتے رہے آخر جب بات حد سے طول پکڑ گئی اور رات پونے بارہ بجے کے مقام پر پہنچ گئی تو ہم نے خود

عرب ساتھیوں سے کہا اب محفل کو برخاست کیجئے چنانچہ محفل برخاست ہوگئی میں نے اٹھتے اٹھتے مولانا سے پوچھا آپ صدر ناصر سے ملاقات کریں گے؟

مولانا:- ہاں! پریذیڈنسی میں جا کر دستخط کر آؤں گا۔ بلا لیا تو چلا جاؤں گا۔ ورنہ نہیں۔ ایسا ہی شاہ حسین سے ہوا تھا کہ انھوں نے بلا بھیجا تھا۔ تو ان سے مل لیا تھا۔

مجھ سے پاکستانی سفارت کے ایک سرگرم کارکن مسٹر عبدالحمید باجوہ نے جو پریذیڈنسی میں مولانا کے ہمراہ تھے۔ کہا کہ مولانا نے خود صدر سے ملنے کی خواہش نہیں کی۔ اور صدر کے آفس میں نشریاتی ادارے کے ڈائریکٹر سے ٹیلی فون پر کہا کہ افسوس ہے ہمیں پریذیڈنسی میں مولانا کی آمد سے پہلے اطلاع نہیں تھی۔ ورنہ ہم ان کے اعزاز میں ایک پارٹی دیتے۔

ویسے معتبر ذرائع سے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ صدر کے آفس سے سرکاری اداروں کو ہدایات بھیج دی گئی تھیں کہ مولانا جس مقام کا دورہ کرنا چاہیں وہاں انہیں تمام سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور ان کے مقام و منزلت کا خیال رکھا جائے۔ مولانا نے جونہی اپنی بات ختم کی تو میں نے فوراً ان کا کافی وقت لے لینے پر معذرت کی اور گھر کی راہ لی۔ مولانا نے فرمایا کہ میں کل نو بجے یہاں مل سکتا ہوں۔

یہ تھی مولانا سے میری پہلی ملاقات۔

دوسرے دن میں شام دوبارہ مولانا کے پاس پہنچا اور یہ ارادہ لے کر پہنچا کہ مولانا اور آپ کے ساتھیوں کے اعزاز میں ایک پارٹی کا انتظام کیا جائے لیکن آج محفل کا رنگ ہی دوسرا تھا۔ مولانا کو عرب طالب علم گھیرے ہوئے تھے۔ سوال وجواب بڑی تیزی سے منصۂ بحث پہ آرہے

تھے اور صاف نظر آرہا تھا کہ مولانا بارہ بجے سے پہلے فارغ نہ ہو سکیں گے۔ چنانچہ میں صرف دو یا تین منٹ تک محفل کا رنگ دیکھ کر چپکے سے چلا آیا۔

اس رات مولانا کے ہاں حاضری دینے کا چنداں خیال نہیں تھا کیونکہ مولانا ۲۰ کی صبح کو موسیٰ و رب موسیٰ کی مناجات سننے کے لئے سینا (طور) جارہے تھے۔ لیکن رات کے دس بجے ایک ساتھی نے کہا کہ چلئے مولانا سے فلاں بات کرنا ہے۔

چنانچہ ہم دس بجے شب مولانا کے پاس پہنچ گئے آج سابقہ رات کی ہما ہمی نہیں تھی۔ دو چار عرب طالب علم مولانا سے مصروف کلام تھے مولانا جونہی ان سے فارغ ہوئے تو مجھ سے فرمایا کہ کیا رات آپ آئے تھے؟ میں نے دیکھا تو تھا لیکن بعد میں پھر آپ نظر نہ آئے۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ مولانا کی بصیرت ہی نہیں بصارت بھی تیز ہے عرض کیا جی ہاں! حاضر ہوا تھا۔ تاکہ عرض کروں کہ آپ نے شاہ حسین اور دوسرے امراء کی دعوت کو تو اعزاز بخشا ہے اب ہمارے نان و نمک کو بھی اعزاز بخشیں لیکن محفل کا رنگ دیکھ کر واپس ہو گیا تھا۔

یہ جواب سن کر مولانا کے لبوں پر ایک دل آویز تبسم پھیل گیا اب عرب ساتھی اٹھ کر جارہے تھے۔ میں نے مولانا سے کہا کہ دو ایک باتیں اور کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا کمرہ میں چلے آئیے۔ چنانچہ مولانا میں اور دوسرے چند ہندی و پاکستانی حضرات مولانا کے ساتھ کے کمرے میں جا پہنچے اور مولانا نے بیٹھتے ہی فرمایا کہیئے۔

میں نے جواب میں مختصر تمہید باندھتے ہوئے کہا کہ میں جن دنوں

مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں چند سوالات ابھرے تھے۔ جن کا جواب وہی دے سکتے تھے ان سے رجوع کرنے کا خیال پیدا ہوا افسوس کہ وہ رحلت فرما گئے بس وہی بات ہوئی کہ غالب جس کی مدح کرتے وہی چل بستا۔ اس جملہ پر مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ لیکن میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

میں نے عرض کی کہ اس لئے سوال کرتا ہوا ڈرتا ہوں۔ پھر اس تمہید کے بعد ان سے پوچھا کہ آپ کے ذہن میں خدا کا تصور کیا ہے؟ مجھے اس مسئلے نے بڑا بے تاب کر رکھا ہے۔

مولانا:۔ میں خدا کو اپنا خالق جانتا ہوں۔ پھر قدرے توقف سے شاید انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرے سوال کا منشا کیا ہے، کہا کہ اس موضوع پر زیادہ سوچنا نہیں چاہیئے جن لوگوں نے فلسفہ کی راہ اختیار کی وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے بس اتنا ہی تصور کافی ہے کہ وہ اس کائنات کا خالق ہے۔

میں:۔ اگر کوئی آدمی خدا کی وحدت پر یقین رکھتا ہے اس کے رسول کی تصدیق کرتا ہے اور اپنی زندگی بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے وقف کر دیتا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

مولانا:۔ وہ مومن نہیں ہے مثلاً گاندھی جی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرتے تھے لیکن انہوں نے خود ۔ ۔ ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہیں کی اس لئے وہ مومن نہیں ہیں۔

میں:۔ مومن نہیں تو کیا مسلمان ہیں؟ میرا اشارہ سورہ حجرات کی آیت قالت الاعراب آمنا قل لم تومنو" کی طرف تھا۔

مولانا:- نہیں! مسلمان کے تو معنی ہی فرماں بردار و مطیع کے ہیں۔

میں:- قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے کہ یہود و نصاریٰ میں سے ہر گروہ حق و صداقت کو صرف اپنا ہی حصہ تصور کرتا تھا۔ کیا اب مسلمانوں کا تو یہ حال نہیں؟ کہ وہ اپنی مخصوص جماعت کے علاوہ کسی کو حق پر مانتے ہی نہیں ہیں؟

مولانا:- ہاں! مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ہے جو اس وہم میں مبتلا ہے

میں:- ہر چند اب انسانوں کو اسلام کے علاوہ دوسرے اصول کی ضرورت نہیں اور یہ دین مکمل و کامل ہے آخر آسمان نے زمین سے اپنے رشتے کیوں توڑ لئے؟ اتنی وسیع و عریض دنیا میں سے خدا کسی سے براہ راست اپنا تعلق کیوں نہیں قائم کرتا جیسے کہ عہد رسالت میں رسولوں کے ساتھ تھا۔

مولانا:- اب کسی نبی کی ضرورت نہیں، لیکن اگر نبی آتا تو اس سے امت میں مزید اختلاف پیدا ہو جاتا۔

میں:- اختلاف تو اب بھی ہے۔

مولانا:- حالیہ اختلاف خود انسانوں (مسلمانوں) کا پیدا کردہ ہے دوسری صورت میں (نبی کی آمد پر) خدا کی طرف سے آزمائش ہوتی۔ الحمد للہ یہ صورت پیدا نہیں ہوئی۔ میں الحمد للہ علیٰ ذلک

اب رات کے بارہ بجا چاہتے تھے چونکہ اب آسماں کے تیور بدل رہے تھے اس لئے اس سے یہ کہنا بے سود تھا۔ کہ وہ "شب فراق" کے کسی ٹکڑے کو آج کی شب وصال کے ساتھ جوڑ دے چنانچہ اب جمعیت خاطر سے کوئی بات ممکن نہ تھی۔ لیکن پھر بھی ہم نے اٹھتے اٹھتے ایک دوسرا سوال پوچھ ہی لیا۔ اور وہ یہ کہ روسی راکٹ نے چاند کو چھو کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ آسمان کا مفروضہ درانشتی تصور جس کی حفاظت کرتا ہم اپنا مقدس فریضہ جانتے رہے ہیں یک

قلم غلط بے بنیاد ہے۔ اس لئے ہمیں قرآن میں وارد شدہ لفظ "اسماء" کی جو بیسیوں جگہ وارد ہے کچھ اور ہی تشریح کرنی چاہیئے "سورہ جن" میں آیا ہے کہ آسمان پر جا کر چوری چوری عالم بالا کی خبریں سنا کرتے تھے ایسے ہی شب معراج میں آسمان کے دروازے کھلنے کا ذکر حدیثوں میں وارد ہے اس کی بھی کوئی دوسری تعبیر ڈھونڈنی چاہیئے اور پرانی تمام تشریحات کو سینے سے لگائے رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

مولانا:۔ روسی راکٹ کی حالیہ کامیابی سے انسان خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ ایسی ہی خوشی اس انسان نے منائی ہوگی۔ جس نے سب سے پہلے پتنگ اڑایا ہوگا اور آج سے پچاس برس بعد حالیہ کامیابی بچوں کا کھیل شمار ہوگی

مولانا کے اس جواب پر میں نے انہیں ذرا غور سے دیکھا وہ فوراً سمجھ گئے۔ کہ یہ جواب کیسا ہے؟ مولانا نے توقف سے خود ہی فرمایا کہ میں نے یہ بات تشبیہاً کہی ہے ورنہ سائنس کی حالیہ کامیابی سے کسے انکار ہے لیکن ابھی تک ان کامیابیوں سے تو ان کے کسی اصول پر زد نہیں پڑی۔

ہاں! آسمانوں کے دروازوں کا کھلنا تو یہ ایک استعارہ ہے معنویات کو بیان کرنے کے لئے محسوس انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ورنہ یہاں یہ معنی نہیں کہ وہاں کوئی دروازہ کھلا تھا جس کا تصور ہمارے ذہنوں میں ہے۔

میں:۔ آپ ڈاکٹر طہٰ حسین سے ملے؟

مولانا:۔ نہیں۔

میں:۔ ان کی مشہور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" پڑھی؟

مولانا:۔ جی ہاں! میں نے اسے پڑھا ہے۔

میں:۔ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا

اس سے کہیں زیادہ طٰہٰ حسین نے لکھا ہے۔

مولانا:۔ اس موضوع پر طٰہٰ حسین اور دوسرے لوگوں نے کافی لکھا ہے البتہ یہ خوش نصیبی میرے مقدر میں تھی۔ کہ مولوی صاحبان نے مجھے ہدف تنقید بنالیا۔

اب مولانا اپنے کمرے کی طرف چل دیئے اور کہا کہ وہ سنیچر کی شام یا اتوار کی صبح کو (سینا سے) قاہرہ پہنچ جائیں گے اور ہم نے گھر کی راہ لی۔

مولانا ۲۳ رجنوری کی شب کو سینا سے واپس قاہرہ پہنچ گئے۔ ہم دوسرے دن پانچ بجے شام کو ان کے پاس پہنچے۔ دیکھا کہ آج کی محفل میں ممتاز اصحاب علم شریک ہیں۔ مولانا کے دائیں بائیں ڈاکٹر عبدالواحد اور مصطفیٰ زرقانی بیٹھے ہوئے ہیں اور سامنے ہندی و پاکی حضرات ہیں ڈاکٹر عبدالواحد اور زرقانی عورت کے مسائل پر گفتگو کر رہے تھے مصری دوستوں کی عادت ہے کہ وہ بحث کرتے وقت دور دور تک نکل جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی یہاں ہوا۔ مولانا ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے۔

آخر بیس پچیس منٹ بعد ڈاکٹر عبدالواحد نے مولانا سے اس طویل بحث پر معذرت کی۔ مولانا نے جواب میں کہا کہ نہیں! میں تو استفادہ کر رہا ہوں۔

لطف یہ کہ اس معذرت کے بعد پھر مباحثہ شروع ہوگیا۔ جسے بالآخر نماز مغرب کی آمد نے ختم کیا۔ مولانا نے نماز پڑھائی۔ ترنم کے ساتھ قرأت کی، جس سے مرحوم مولانا حسین احمد مدنی کی یاد تازہ ہوگئی۔

مولانا کی آواز کے زیر و بم سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ حلق سے نہیں رباب دل سے اٹھ رہی ہے نیز مولانا کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ کیا

پڑھ رہے ہیں اور کس کے سامنے پڑھ رہے ہیں۔

مولوی نصراللہ خاں عزیز صاحب نے مولانا آزاد سے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔ کہ نماز میں مولانا کے چہرے کا رنگ شدت تاثر سے سرخ ہو جاتا تھا۔

ظاہر ہے یہ کیفیت انہی لوگوں پر طاری ہوتی ہے جن کے دل خوف خدا سے معمور ہوں اور دماغ بارگاہ خداوندی میں حاضر۔ مودودی صاحب کا چہرہ تو میں نے دیکھا نہیں کہ سرخ تھا یا نہیں البتہ ان کی قرأت نہ صرف ان کی بیداری قلب کی خبر دے رہی تھی بلکہ مجھ نامراد کو جھنجھوڑ رہی تھی کہ تم خدا ئے لم یزل کی بارگاہ میں کھڑے ہو۔

نماز کے بعد شیخ ابو زہرہ کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ مولانا ان کا خیر مقدم کرنے کے لئے لفٹ تک گئے دونوں حضرات خوب گلے لگ کر ملے۔ شیخ صاحب نے آتے ہی محفل کو باغ وبہار بنا دیا اور ہر طرف لطائف و نکات کے پھول بکھیر دیئے۔ خدا معلوم ہمارے ہاں یہ غلط خیال کیونکر پیدا ہوا کہ یبوست وخشکی زہد و تقویٰ کی پہلی نشانی ہے۔

کاش ایسے لوگ شیخ کی محفل میں ہوتے اور شیخ کی زبان و بیان اور لطائف ونکات سے اپنے دل و دماغ کے خشک کھیتوں کو سیراب کرتے یہ روح پرور منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ کیا مصری کیا فلسطینی کیا پاکستانی کیا ہندوستانی کیا شامی سبھی وحدت فکر کے گلشن میں محو خرام تھے۔ اور سیاست و وطنیت کی قائم کردہ حدبندیوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ آخر سات بجے شیخ الازہر کا مندوب کار لے کر آن پہنچا اور مولانا مودودی صاحب شیخ صاحب سے ملنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں نے روانہ ہوتے سے

چند لمحے قبل اسی دن کی صبح کو حسب وعدہ نہ آنے پر معذرت کی اور اس کے اسباب بتائے۔ سید صاحب نیچے اتر گئے اور میں شیخ لقمان اور باری کو لے کر امریکن ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں ہم کافی کے جرعہ ہائے نیم تلخ سے کام و دہن کی تشنگیوں کو بجھاتے ہوئے شیخ کے دل پسند موضوع "مرزائیت" کے تحلیل و تجزیہ میں کھو گئے۔

ہفت روزہ "ایشیا" لاہور جلد ۹ شمارہ ۱۰۔ ۱۱ مارچ ۱۹۶۰ء

لندن میں

۵- یو۔ کے اسلامک مشن کی سہ روزہ کانفرنس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا پیغام

(۲۷ر اگست ۱۹۶۶ء اسلامک کلچرل لندن)

عزیز دوستو! اگرچہ آپ جسمانی طور پر دور ہیں۔ مگر دلی طور پر قریب ہیں۔ کیونکہ مومن دور ہو کر بھی ایک دوسرے کے قریب ہوتا ہے۔ آپ جس سرزمین میں ہیں وہ نورِ اسلام سے کبھی منور نہیں ہوئی۔ بلکہ اس میں مسخ شدہ مذہب کا دَور دَورہ رہا ہے۔ یہیں خدا کے رسول کو خدا کا بیٹا بنا لیا گیا ہے۔ خدائی شریعت کو چھوڑ کر دین سے بے نیاز قانون سازی اختیار کی ہے۔ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں ہماری تہذیب کی جڑیں ہلا دیں ہمارے نظامِ فکر و عمل کو ہلا کر رکھ دیا اور معاشرتی زندگی کو بگاڑ دیا۔ طلبہ ان کے رنگ میں رنگ گئے اوراق کا چربہ بن کر ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں چھا گئے اگرچہ اب ہم آزاد ہیں لیکن عملاً ان کی تہذیب و تمدن اور طور طریق کا غلبہ آج تک اسی طرح ہے آپ ان کی اندھی تقلید نہ کریں۔

بلکہ اپنے دین، اخلاق، تہذیب اور انفرادیت کو قائم رکھنے کی پوری پوری سعی جمیل کریں۔ اور اپنے ذرائع وسائل کے ذریعہ وہاں کے مقیم مسلمانوں میں جو کہ وہاں کے معاشرہ کا ایک حصہ ہیں، اپنے روابط بڑھائیں نشر واشاعت اور تبلیغ کے ذریعے ان میں ایک ملت کا احساس اور دین کا شعور بیدار کریں۔ وہاں پر کارکنوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کریں، جو مسلمانوں کے مسائل کو سمجھ کر حل کرنے کی کوشش کریں۔ وہاں پر آئندہ نسلوں کا معاملہ زبردست غور وفکر کا محتاج ہے یہ نسل کفر والحاد اور فسق وفجور کے ماحول میں تربیت پا رہی ہے اگر ان کی اسلامی تربیت کا اہتمام نہ کیا گیا تو اس قیمتی سرمایہ سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے مسلمان کی بقا اپنی ذات کے لئے نہیں ہے بلکہ اسے فریضۂ شہادت حق سرانجام دینا ہے۔ جو قوم آپ پر فاتحانہ شان سے آئی تھی آج آپ اسی قوم میں مبلغانہ شان سے جائیں دین اور اسلام کو رسوا نہ کریں۔ آپ وہاں پر اسلام اور امت مسلمہ کے سفیر ہیں۔ آپ کے ایک ایک عمل سے وہ آپ کے دین کا اندازہ کریں گے اس لئے اپنے برتاؤ، عادات، معاملات اخلاق اور مضبوط سیرت وکردار کے ذریعے اس غیر مسلم معاشرہ میں اپنی اسلامی شان کو قائم رکھیں سخت تکلیف اٹھا کر بھی حرام چیزوں سے پرہیز کریں اور وہاں کے معاشرہ میں اپنے طور طریقوں کی برتری ثابت کیجئے نماز روزہ کی پوری طرح پابندی کریں۔ اور اپنے آپ کو ہر قسم کی گندگی وآلائش سے محفوظ رکھیں اگر آپ نے اسلامی کردار کا مظاہرہ کیا تو اس معاشرہ میں بھی ایسے لوگ ہیں جو کہ آپ کی تہذیب کے اثرات کو قبول کریں گے خداوند کریم آپ کا حامی وناصر ہو اور آپ کی کوششوں کو قبول فرمائے۔

سوال۔

کیا ہی اچھا ہو کہ آپ یو کے اسلامک مشن کے لئے کچھ ہدایات دیتے جائیں؟

جواب۔

یو۔ کے اسلامک مشن ایک انڈی پینڈنٹ باڈی (آزاد ادارہ) ہے اس کے بنانے یا چلانے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں لیکن اگر یہ کسی سلسلہ میں مجھ سے مشورہ چاہیں تو میں حاضر ہوں۔

سوال۔

یہاں قبلہ کی سمت اور نمازوں کے اوقات معلوم کرنے کی بڑی دقت رہتی ہے۔

جواب۔

قبلہ کا رُخ تو یہاں سے تقریباً جنوب مشرق میں ہے۔ جو کہ قطب نما کی مدد سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے۔ اس موقع پر ایک دوسرے دوست نے بتایا کہ جہاں تک نمازوں کے اوقات کا تعلق ہے ان کے لئے یو کے اسلامک مشن کا شائع کردہ کیلنڈر استعمال کیا جا سکتا ہے جس پر سارے سال کے اوقات نماز درج ہیں)

سوال۔

یہاں ملتان کے ایک مسلمان ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ "میں پاکستان میں نمازیں پڑھا کرتا تھا۔ اور اذان بھی دیا کرتا تھا۔ لیکن یہاں آکر آنکھیں کھل گئی ہیں" اب وہ حرام کھاتا اور پیتا ہے اور کہتا ہے کہ "سود" کیوں حرام ہے"؟

جواب۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسلام کے احکامات کو اپنی سمجھ کی حد تک قبول کرتا ہے اور جو حکم اس کی سمجھ میں نہیں آتا اسے رد کر دیتا ہے اس سے کہنا چاہیئے کہ پہلے

وہ اپنی اخلاقی پوزیشن کو مشخص کرے محض مسلمانوں کا سا نام رکھ کر دوسروں کو دھوکا دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر وہ اسلام کے احکامات کو اعلانیہ نہیں مانتا تو اسے اخلاقی جرأت کر کے اور اپنا نام بدل کر اس اسلامی برادری سے بھی علیحدہ ہو جانا چاہیئے۔ جہاں تک سؤر کے حرام ہونے کا تعلق ہے اس کی کئی وجوہ ہیں لیکن جاننا چاہیئے کہ شریعت کسی چیز کو اس کے طبی یا مادی نقصانات کی وجہ سے حرام نہیں ٹھہراتی اگر ایسا ہوتا تو سب سے پہلے سنکھیا حرام ہوتا۔ شریعت جس بنا پر اشیاء کو حرام ٹھہراتی ہے وہ ان کے اخلاقی نقصانات ہیں جن کو پوری طرح معلوم کرنے کے ذرائع انسان کے پاس نہیں ہیں ماڈرن سائنس آج خود تسلیم کر رہی ہے ان غذاؤں کا اثر اخلاق پر بھی پڑتا ہے لیکن ابھی تک اس کی مکمل تحقیق نہیں کی جا سکی سؤر ایک ایسا بے حیا جانور ہے کہ اگر اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا سؤر اس کی مادہ کے قریب جائے یا اس پر ہاتھ ڈالے تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوتا اور یہی حال ان قوموں کا ہے جو اس کا گوشت کھاتی ہیں۔

سوال۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قرآن میں شراب کے لیے حرام کا لفظ نہیں آیا کیا امر واقعی یہی ہے۔؟

جواب۔

اس طرح تو قرآن میں چوری کے لئے بھی حرام کا لفظ نہیں آیا تو کیا پھر چوری بھی جائز ہو گئی۔ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں جس چیز کے متعلق حرام کا لفظ آ گئے وہی حرام ہے؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے شراب کے متعلق قرآن میں کہیں عملِ شیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے اور کہیں کوئی اور۔ لیکن ان سے شراب کی کلیتہً ممانعت و حرمت ثابت ہے اور سب مسلمان اس پر متفق ہیں۔

اس کے علاوہ اس نشست میں بھارت کے مسلمانوں پر مظالم کے بارے میں

گفتگو ہوئی ان مظالم پر مولانا نے بڑے دکھ کا اظہار کیا اور انڈین پریس کے اس دعوے کو غلط بیانی قرار دیا کہ وہاں بالکل امن و امان ہے۔)

امریکہ، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں زیر تعلیم مسلم طلباء کے حالات کا ذکر ہوا تو مولانا نے افسوس ظاہر کیا کہ کسی بھی مسلمان ملک کی حکومت نے ان طلباء کی اخلاقی اور دینی تربیت کا کوئی انتظام نہیں کیا ان طلباء کو اپنے ممالک سے اٹھا کر یک لخت مادی لحاظ سے ایک بالا دست سوسائٹی میں پھینک دیا جاتا ہے اور وہ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مسلمان ملکوں کے تقریباً ننانوے فی صد مسلمان طلباء، مغربی ممالک میں آکر خراب ہو جاتے ہیں۔ اور پھر جب واپس اپنے اپنے ملک کو جاتے ہیں تو اس کا بھی ستیاناس کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

مولانا محترم نے مزید فرمایا: "مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی اور اطمینان ہوا ہے کہ تمام مغربی ممالک میں مسلمان طلباء محض اپنے بل بوتے پر منظم ہو کر اسلام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، برطانیہ میں فاسس (FOSIS) امریکہ میں AMSA اور یورپ میں مسلم طلباء کی کانگریس خاصے بڑے پیمانے پر کام کر رہی ہیں۔ درآنحالیکہ ان بیچارے طلباء کو اپنے اخراجات اور تعلیم کے ساتھ ساتھ تمام وسائل بھی خود مہیا کرنے پڑتے ہیں اگر ان کو خاطر خواہ وسائل فراہم ہو جائیں تو انشاءاللہ وہ کافی بڑے پیمانے پر کام کر سکتے ہیں۔ بہر حال یہ بڑی ہی نیک شگون ہے کہ نوجوانوں میں اسلام کے لئے تڑپ پیدا ہو گئی ہے خدا نے چاہا تو ان کی کوششیں ضرور بار آور ہوں گی۔"

معزز مہمان نے مولانا سے کہا۔

"نئی نسل کو اسلام سے روشناس کرانے کے لئے بعض مسائل پر مزید لٹریچر کی ضرورت ہے اس لئے آپ اس طرف توجہ ضرور دیں۔"

مولانا نے فرمایا: "میں تو اب صرف یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ مجھے تفہیم مکمل

کرنے کی توفیق دیں۔"

اس پر معزز مہمان نے کہا: "مولانا آپ جیسی شخصیت صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہے اس لئے یہ کام آپ ہی بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔"

مولانا نے جواب میں فرمایا:۔

"یہ تو آپ لوگوں کا حسنِ ظن ہے تاہم اس وقت تک جو کام ہوا ہے اس سے اسلام کی خاطر مرمٹنے والی ایک نسل تیار ہو گئی ہے اصل میں اب ہمیں سب سے زیادہ اخلاص کی ضرورت ہے مجھے یقین ہے کہ اگر اخلاص کے ساتھ یہ جدوجہد جاری رکھی گئی تو انشاءاللہ خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے۔"

گفتگو کے دوران میں قادیانیت کا ذکر آیا تو کچھ دیر ان کی اس "تبلیغ" پر گفتگو ہوئی جو وہ مسلمان ممالک میں کر رہے ہیں۔ معزز مہمان نے اس موقع پر بڑی دلچسپ بات کہی۔

انہوں نے کہا "مجھے تو آج تک کوئی قادیانی یہ بات نہیں بتا سکا کہ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کا وہ کونسا اسلامی مشن تھا جس کے لئے بقول ان کے (نعوذ باللہ) اللہ تعالےٰ نے انہیں مبعوث فرمایا"

اس گفتگو کے دوران میں ایک دو لطیفے بھی ہو گئے جو قارئین کی ضیافت طبع کے لئے بیان کرتا ہوں۔

برطانیہ میں اگرچہ ہر قسم کا پھل مل جاتا ہے مگر کسی چیز کا وہ ذائقہ نہیں جو برصغیر میں پیدا ہونے والے پھلوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ کھانا کھانے کے بعد جب انگور پیش کئے گئے تو ایک دانہ کھانے کے بعد مولانا نے فرمایا: "ان میں انگور والی تو کوئی بات نہیں البتہ یہ انگور کی بیل کو لگے ضرور گئے تھے"۔

قادیانیت کا ذکر ہو رہا تھا تو مولانا نے ایک لطیفہ سنایا :-

فرمایا کہ ایک مرتبہ روزنامہ الفضل کے مدیر چوہدری روشن دین تنویر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "مرزا صاحب نے اسلام کی حمایت میں متعدد کتابیں لکھ کر دین کی بہت خدمت کی ہے اور یہی ان کی نبوت کی بہت بڑی دلیل ہے" جواب میں میں نے چودھری صاحب سے کہا میں نے تو مرزا صاحب سے بھی زیادہ کتابیں لکھ ڈالی ہیں لیکن مجھے تو معاذ اللہ نبوت کے دعوے کی ضرورت نہیں ہوئی "

مولانا نے فرمایا کہ جونہی میں نے یہ بات کہی وہ اٹھ کر چل دیئے۔ (آئین لاہور)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا خطاب

اب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا یو کے اسلامک مشن کے کارکنوں اور کانفرنس میں شریک دوسرے اسلام پسند حضرات سے خطاب :-

حضرات :-

"آپ جس کام کو کرنے اٹھے ہیں سب سے پہلے اس کے مختلف مراحل اور مختلف تقاضوں کو اچھی طرح سے سمجھ لیجئے۔

- آپ لوگوں کو سب سے پہلے اپنے آپ کو اسلام کے علم سے مسلح کرنا ہوگا تاکہ آپ اسلام کے سچے نمائندے بن سکیں۔ اس کے لئے آپ کو وقت نکال کر اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اور اسے جاری رکھنا چاہیئے۔ یہاں کا ماحول اسلام کی طرف سے غفلت اور تساہل میں مبتلا کرنے والا ہے۔ اس لئے اس کا علاج یہ ہے کہ آپ کو اپنا مقصد زندگی ہمہ وقت یاد رہے اور دین کا کام آپ سے جس کردار کا مطالبہ کرتا ہے وہ آپ کے اندر پیدا ہو۔ ان چیزوں کے لئے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

- کام کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو علم آپ کو حاصل ہوا ہے اسے آپ دوسروں تک پہنچائیں اس کام میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی حد نہیں ہے آپ کو یہ پیغام سب تک پہنچانا ہے اگر آپ یہاں الگ تھلگ رہ کر اپنے عقیدہ و اخلاق کی حفاظت کرتے رہے تو یہاں کا ماحول ایسا ہے تو آپ کو کوئی کامیابی نہیں ہو سکے گی اس لئے آپ کو دفاعی پالیسی کے بجائے داعیانہ پالیسی اختیار کرنی ہوگی آپ کو پوری جرأت سے یہاں کی مادہ پرست فضا میں لوگوں کو مادہ پرستی کے نقصانات اور خدا ترسی کے فوائد سے آگاہ کرنا ہوگا اگر آپ انگریزی آبادی سے دو یا چار WORKER حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو آپ انشاء اللہ آگے چل کر دیکھیں گے کہ یہاں اسلام کو کتنا جلدی فروغ حاصل ہوگا ۔

- تیسرا اہم کام جس کی طرف میں آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہاں مسلمان بچوں کے لئے تعلیم و تربیت کا موزوں انتظام کرنا ہے اگر آپ لوگ یہاں کے تمام مسلمانوں کو اس بات کی ضرورت کا احساس دلا کر ان کا تعاون حاصل کریں تو مجھے یقین ہے کہ یہاں کی حکومت بھی آپ کو ضروری مراعات دینے پر تیار ہو جائے گی ۔ اس سلسلے میں یہاں پر مقیم مسلمانوں کو اس اہم کام کا شعور اور احساس دلانے کی ضرورت ہے ۔

یاد رکھیں کہ اگر آپ ان خطوط پر کام کریں گے تو آپ خود بھی اسلام پر کاربند رہ سکیں گے اور انشاء اللہ یہاں کی غیر مسلم آبادی میں بھی اسلام پھیلے گا فی الحقیقت آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ اللہ نے آپ کو انگریز قوم کو فتح کرنے کا موقع دیا ہے ۔

مجھے اس امر کا کامل یقین ہے کہ روئے زمین پر جہاں بھی انسان آباد ہیں وہاں اسلام کا نفوذ ہو سکتا ہے اور وہ پھیل سکتا ہے کیونکہ یہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے ۔

یہ درست ہے کہ یہاں کا معاشرہ بہت بگڑا ہوا ہے مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جو معاشرہ جتنا زیادہ بگڑا ہوا ہو وہ اسلام کی روشنی آجانے سے اتنی جلدی ہی تبدیل ہو سکتا ہے آپ اگر اپنی مخلصانہ جدوجہد کو حکمت کے ساتھ جاری رکھیں گے تو جلد یا بدیر اس کے عمدہ نتائج برآمد ہوں گے جس طرح پانی کا ایک ایک قطرہ جب کسی بڑے سے بڑے پتھر پر متواتر گرنا شروع ہو جائے تو بالآخر اس پتھر کے اندر بھی سوراخ ہو جاتا ہے اسی طرح یہاں کی گئی گزری قوم میں بھی حکمت و تدبر کے ساتھ متواتر کام کرتے رہنے سے مطلوبہ نتائج ضرور برآمد ہو سکتے ہیں۔

تقریر کے بعد ایک صاحب نے مولانا سے استفسار کیا کہ کیا ہمیں یہاں کے غیر مسلم معاشرے میں قیام کی اجازت ہے ؟

مولانا ——— نے جواب دیا۔

اگر آپ اسلام پر نہ صرف خود کاربند ہوں بلکہ دوسروں کو بھی اس کی طرف دعوت دیتے ہوں تو یہاں کے معاشرے میں نہ صرف قیام کی اجازت ہے بلکہ آپ اجر کے بھی مستحق ہوں گے دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ آپ خود تو اسلام پر عمل پیرا ہوں اور یہاں کے معاشرے کی برائیوں سے بچتے بھی رہیں مگر دوسروں کو دعوت نہ کریں تو اس صورت میں محض قیام کی اجازت ہے لیکن اگر آپ یہاں کی برائیوں میں ملوث ہونے لگیں تو آپ کا قیام یہاں پر حرام ہے"۔

سوال۔

کیا ہمیں غربت و افلاس کو دور کرنے کے لئے یہودیوں کی طرز پر "قبوت" (KIBBUTS) بنانے چاہئیں ؟

جواب۔ "یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ دوسرے لوگ جو طریقے اختیار کریں مسلمان

بھی انہیں اپنائیں یہودیوں نے جو "قبوت" آباد کئے تھے وہ صرف اسرائیل کے وسائل پر مبنی نہیں تھے بلکہ دنیا بھر کے یہودی انہیں مالی مدد پہنچاتے رہے خود اسرائیلی بجٹ ہی فلسطین کے وسائل پر منحصر نہیں ہے جتنی رقم انہیں فلسطین سے حاصل ہوتی ہے اس سے دس گنا باقی یہودی دنیا مہیا کر رہی ہے ہمارا اصل مسئلہ غربت اور افلاس نہیں ہے بلکہ جو چیز مسلمانوں کے لیئے مہلک ہے وہ یہ ہے کہ ان میں اسلامی روح ختم ہو جائے یا ہو جائے نہ تو وہ پورے کافر بنیں کہ کافرانہ تہذیب اپنا کر "ترقی" کر سکیں اور نہ وہ مسلمان بنیں کہ اسلامی نظام کی برکتوں سے فیض یاب ہو سکیں ہمارے تمام مسائل کا اصل سبب اسلامی اخلاق کا فقدان ہے۔ اسلامی اخلاق نہ ہونے سے ہمارے وسائل بھی ہمارے کام نہیں بلکہ دشمنوں کے کام آ رہے ہیں۔

جب اسلام برسر اقتدار آئے گا

سوال

آپ کسی ملک میں برسر اقتدار آ جائیں تو ملک کو سائنٹفک ترقی دینے کیلئے آپ کے پاس کیا پروگرام ہے۔؟

جواب :-

"ایک نظریاتی تحریک کو معاشرے کے تمام افراد کے ذہنوں کو اپنے خیالات کے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے معاشرے میں ہر طرح کے لوگ صنعت کار، سائنس دان ڈاکٹر اور فلاسفر موجود ہوتے ہیں انہیں ایک نصب العین دینے کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد یہی لوگ جو پہلے نظام کفر کے لئے کام کر رہے ہوتے ہیں اسلام کے لئے کام شروع کر دیں گے۔

پاکستان اور اسلام

سوال۔ آپ پاکستان میں نفاذ اسلام کے معاملہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟

جواب۔

جماعت اسلامی نے جس مقصد کو سامنے رکھ کر کام شروع کیا تھا اس میں اسے کافی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ اگرچہ ہم پاکستان میں اسلامی نظام کو عملاً برپا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں لیکن پھر بھی ہم نے اس کے لئے کافی حد تک زمین ہموار کرلی ہے جماعت اور بعض دیگر جماعتوں اور افراد نے اس وقت تک جو کام کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں کسی شخص کے اندر یہ ہمت نہیں ہے۔ کہ وہ غیر اسلام کی دعوت دیتے ہوئے لوگوں کی تائید اور حمایت حاصل کرسکے۔ اگر کوئی غیر اسلام کا کام کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی اسلام کا نام لینے پر مجبور ہے وہاں سوشلزم بھی "اسلامی" کہہ کر سامنے لایا جاتا ہے جبکہ دوسرے مسلمان ممالک میں اس کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی ان ممالک میں کھلم کھلا غیر اسلامی نعرے اور پروگرام اٹھتے ہیں بلکہ اسلام کا مذاق اڑانے کی جسارت کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کسی کو ایسا کرنے ہمت نہیں دوسرا کام جو اس وقت تک ہم نے کیا ہے کہ تمام باشندوں پر ہم نے اسلامی نظام کا تصور واضح کر دیا ہے۔ لوگ اچھی طرح جان گئے ہیں کہ اسلامی نظام میں معیشت، معاشرت، سیاست اور اخلاق کے کیا معنی ہیں۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے ہمارے بڑے بڑے اہل علم صرف چند قضائے شرعیہ کے اجزاء اور شیخ الاسلامی کے قیام کو ہی اسلامی نظام کا آخری مقصد سمجھتے تھے مگر اب نئی نسل تک کو اسلامی نظام کی تفصیلات پورے طور پر معلوم ہوگئی ہیں"

پاکستان اور اشتراکیت۔

سوال۔

پاکستان میں اشتراکیت کی نشر و اشاعت کو روکنے کے لئے جماعت اسلامی کیا کر رہی ہے؟

جواب۔ جماعت کے وسائل قلیل ہیں مگر پھر بھی ہم اپنے لٹریچر کے ذریعے اس کا

بخوبی مقابلہ کر رہے ہیں پاکستان میں اس کے کوئی آثار نہیں ہیں کہ اشتراکی انقلاب برپا ہو اس مقابلے میں جماعت کو یہ مشکل درپیش ہے کہ اشتراکی لٹریچر کو پھیلانے کی کھلی چھٹی ہے اور جماعت کے لٹریچر کے بھیجنے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جارہی ہیں

یہ سپید و سرخ دام۔

سوال

"اگرچہ مغربی استعمار اور مشرقی لادینیت (اشتراکیت) دونوں اسلام کے دشمن ہیں لیکن اگر وقت آپڑے تو ان میں سے کس کو ترجیح دینی ہوگی۔؟

جواب

ہم ترجیح دینے کے بجائے ہر دو پر لعنت بھیجیں گے کیونکہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں اخبث کون ہے میرے نزدیک دونوں برابر ہیں مغربی استعمار اشتراکیت کے لئے خود میدان خالی کر رہا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ مسلمان کو خود اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا جتنا اشتراکیت پہنچا سکتی ہے ان حالات میں کسی کی ترجیح کا کوئی سوال نہیں دوسروں کے سہارے پر جینے والی قوم کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکتی ہماری آنکھوں کے سامنے اس کی مثالیں موجود ہیں۔"

بھارت کے مسلمان۔

بھارت کے مسلمانوں کے قتل عام کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا۔

"یہ قتل عام سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا جا رہا ہے"

خبر رساں ایجنسیاں ان کے متعلق کوئی خبر نہیں دیتیں پھر وہاں کے موجودہ صدر چیف جسٹس اور بعض سفراء مسلمان ہیں اس لئے دنیا کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ بھارت کے

مسلمانوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جاتا ہے اور قتل و غارت کے واقعات محض پاکستان کا پراپیگنڈہ ہے بھارتی پروپیگنڈے کا توڑ آپ حضرات یہاں پر اچھی طرح کر سکتے ہیں اگر چند لوگ یہاں کی لائبریریوں سے بھارتی اخبارات کا مطالعہ کر کے پچھلے بیس سال میں بھارت کے مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتیاں ہوتی رہی ہیں انہیں یکجا کر کے ایک کتاب شائع کر دیں۔ تو یہ بہت اہم کا [illegible] گا۔ اسی طرح دیگر زبانوں میں بھی پمفلٹ شائع کر کے دنیا کو وہاں کے مسلمانوں [illegible] زار سے آگاہ کریں اگر دنیا کی رائے عامہ ان مظالم سے آگاہ ہو جائے تو بھارت کی حکومت ان مظالم سے ہاتھ روکنے پر مجبور ہو جائے گی۔

غیر مسلموں کا ذبیحہ:۔

سوال۔

غیر مسلموں کے ذبیحے کے متعلق کیا حکم ہے؟

جواب۔

عرب ممالک میں سب سے پہلے مفتی عبدہٗ نے غیر مسلموں کے ذبیحے کی حلت کا فتویٰ دیا تھا اس کے بعد تقریباً تمام عرب ممالک میں یہ مسئلہ متفق علیہ ہو کر رہ گیا میں نے رسالہ ترجمان القرآن میں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے میرے مضمون کو بعض عرب اخبارات نے جب شائع کیا تو متعدد عرب علماء اور خصوصاً سعودی عرب کے علماء کی اکثریت نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔

غیر مسلم ممالک میں پردے کے احکام

سوال۔

غیر مسلم ممالک میں مسلم خواتین کو پردے کے احکامات کی تعمیل کرنی چاہیئے یا نہیں؟

جواب: مسلم خواتین کو بالکل اسی طرح غیر مسلم ممالک میں پردہ کرنا چاہیئے جس

طرح مسلم ممالک میں کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں کسی رعایت یا ہچکچاہٹ کی کوئی گنجائش نہیں دنیا میں وہی قوم عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے جو اپنے اصولوں پر فخر کرکے ان پر کاربند ہو اور کسی احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو۔ ورگرنہ اگر آپ ایک مسئلے میں "مصالحانہ" رویہ اختیار کر کے اپنے اصول کو ترک کریں گے تو پھر آپ کا کوئی اصول بھی باقی نہیں رہے گا۔

ایک بین الاقوامی اسلامی خبر رساں ایجنسی کی ضرورت۔

سوال

چند سال قبل آپ نے مسلم ممالک کی اپنی خبر رساں ایجنسی قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی اس کے قیام کی کوئی توقع ہے؟"

جواب

اب تک کے تجربہ کے مطابق اس کے قیام کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اول تو کسی کو اس اہم اور مفید کام کی ضرورت کا احساس ہی نہیں اور اگر کسی کو ہے بھی تو وہ روپیہ لگانے کو تیار نہیں اپنی خبر رساں ایجنسی نہ ہونے سے اور یہودیوں کے قبضے میں خبر رساں ایجنسیوں کے ہونے سے جو نقصان ہوا ہے اسے سب لوگ دیکھ رہے ہیں مگر کوئی آگے بڑھ کر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے تیار نہیں رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں میں نے اور بعض دیگر لوگوں نے اس تجویز کو بار بار پیش کیا ہے اور کئی کمیٹیاں بھی بنتی رہی ہیں مگر عملاً ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔

ترکی میں احیائے اسلام۔

سوال۔

ترکی میں احیائے اسلام کے کیا امکانات ہیں؟

جواب۔ اگرچہ وہاں کے ملکی قانون کے مطابق اسلام کے نام پر کوئی جماعت

بنانے کی اجازت نہیں ہے مگر پھر بھی وہاں بڑے پیمانے پر کام ہو رہا ہے وہاں پر ایک غیر منظم لہر جاری ہے جو اسلام کے احیاء کے لیئے جدوجہد کر رہی ہے گذشتہ چالیس سال کے دوران میں بعض اہلِ علم کی انفرادی کوششوں سے بھی انتہائی سخت حالات کے باوجود اتنا اچھا کام ہوگیا ہے جس سے اسلام کی خاطر جدوجہد کرنے والی ایک نئی نسل تیار ہوگئی [illegible] بدیع الزماں نورسیؒ کی کوششوں کا اس میں کافی حصہ ہے نوجوانوں کی [illegible] جذبہ سے یہودی بہت خائف ہیں اور انہوں نے پوری دنیا میں خطرے کی گھنٹیاں بجانی شروع کر دی ہیں۔ اس سے پہلے بھی یہودیوں نے خطرے کی گھنٹیاں بجائی تھیں جن کے نتیجے میں فوجی انقلاب برپا ہوا تھا اور اب وہ پھر کوشش کر رہے ہیں مگر اب انہیں کامیابی نہیں ہوگی۔ یہودیوں کی تمام کوششوں اور سازشوں کے باوجود اب انشاء اللہ ترکی میں اسلام کے احیاء کو روکا نہیں جا سکے گا۔

اسرائیلی جارحیت اور ہم

سوال:

اسرائیل کے قبضے سے عرب مقبوضہ علاقے چھڑانے کے لئے مسلمان ممالک کو کیا کرنا چاہیئے؟

جواب:

یہ مسئلہ بہت ہی پیچیدہ بن چکا ہے اور اس معاملے میں حقیقی حل کی طرف قدم نہیں بڑھایا جا رہا ہے۔ اسرائیل کو جس چیز نے قائم کیا وہ بڑی طاقتوں کی سازش بھی تھی اور مسلمانوں کی اپنی کمزوریاں بھی اس میں مددگار ثابت ہوئیں۔ مسلمانوں کی جو کمزوریاں بلا ارادہ و شعور اسرائیل کے قیام میں ممد ثابت ہوئیں بدقسمتی سے اب ان کو مزید تقویت دی جا رہی ہے۔ اسلام کو قومی حیثیت سے اپنانے کے بجائے نگاہیں آج بھی سطحی سہارے ڈھونڈ رہی ہیں۔ بعض مسلم ممالک اسرائیل کو قائم کرنے والی دو طاقتوں میں سے

ایک کو کوستے ہیں اور دوسری کی گود میں پناہ لیتے ہیں حالانکہ اسرائیل کو قائم اور زندہ رکھنے کے معاملے میں یہ دونوں طاقتیں متفق ہیں پھر بعض عرب ممالک کا حال یہ ہے کہ وہاں فخریہ انقلاب پر انقلاب برپا کئے جا رہے ہیں جو انقلاب لاتا ہے وہ اپنے سے پہلے حکمرانوں کو غدار ٹھہراتا ہے یہ کھیل مسلسل کھیلا جا رہا ہے جبکہ اسرائیل مزید آگے بڑھنے اور علاقہ ہتھیانے کے لئے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ جہاں تک باقی مسلمان ممالک کا تعلق ہے وہ اگر کچھ کرنا چاہیں بھی تو نہیں کرسکتے ان حالات میں اس سیلاب سے اللہ تعالیٰ ہی بچانے والا ہے۔ بظاہر آثار بڑے ہی خراب ہیں اور وہ سیلاب ہمیں رکتا نظر نہیں آتا جس میں بہت بڑا دخل ہماری خامیوں اور کوتاہیوں کو حاصل ہے۔

مسئلہ فلسطین اور جہاد۔

سوال۔

"کیا مسلمانانِ عالم پر اسرائیل کے خلاف جہاد فرض نہیں ہو گیا؟ اگر فرض نہیں ہوا تو کن صورتوں میں فرض ہوتا ہے"؟

جواب۔

یہ سوال کرکے آپ نے اپنے آپ کو بھی اور مجھے بھی ایک مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اسلامی اصول یہ ہے کہ جب کسی مسلمان شہر یا علاقے پر کفار حملہ آور ہوں تو پہلے وہاں کے لوگوں پر جہاد کا فرض عائد ہوتا ہے اگر وہ نہ کرسکتے ہوں تو ان کے متصل علاقے کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ وہ بھی نہ کرسکتے ہوں تو ان کے متصل علاقوں پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے یہاں تک کہ آخر کار روئے زمین کے تمام مسلمانوں پر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے اب آپ سوچ لیں کہ مسئلہ پوچھنے کے بعد اگر جہاد پر نہ جائیں تو آپ کی کیا پوزیشن ہو گی ____ دراصل جہاد کے لئے بھی کچھ شرائط

مقرر ہیں۔ اگر وہ پوری نہ ہوں تو یہ فرض نہیں ہوتا۔ جہاد کی جو شرائط ہیں بدقسمتی سے وہ اس مسئلے میں پوری نہیں ہوتیں اگر کوئی مسلمان ملک اسرائیل کے خلاف اپنی فوجیں بھیجے بھی تو انہیں لامحالہ کسی مسلمان ملک سے گزر کر جانا پڑے گا اب آپ یہ معلوم کر لیجئے کہ کون کون سا مسلمان یا عرب ملک ایسا ہے جو دوسروں کی فوجوں کو اپنے ملک میں سے گزر کر اسرائیل پر حملہ کرنے کی اجازت دینے کے لئے تیار ہے۔

[illegible]کہ اسلامی اتحاد نہ ہونے کے سبب ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکے ہیں اور اس سے سامراجی طاقتوں کے مقاصد پورے ہو رہے ہیں حالت یہ ہے کہ کانفرنسوں میں فیصلے کچھ ہوتے ہیں اور ان پر عمل ان کے برعکس ہوتے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانانِ عالم پُرنم آنکھوں کے ساتھ بے بسی سے یہ سب کچھ دیکھنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔

اس بات کو کبھی فراموش نہ کیجئے کہ آپ اس سرزمین پر اسلام کے سفیر ہیں

سوالات ختم ہونے کے بعد مولانا مودودی نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اب مجھے آپ لوگوں سے چند ضروری باتیں کہنی ہیں:۔

- پہلی بات یہ ہے کہ آپ لوگوں پر، اور ان تمام مسلمانوں پر جو یہاں رہتے ہیں اسلام کی طرف سے بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ یہ کہ آپ اس ملک میں اسلام کے سفیر ہیں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں مگر یہاں کے غیر مسلم آپ کو اسلام کا نمائندہ سمجھتے ہیں اس لئے آپ یہاں جو کچھ بھی کریں گے اسے اسلام کے ساتھ منسوب کیا جائے اس طرح آپ کے اعمال اور رویہ سے وہ جو رائے بھی اسلام کے متعلق قائم کریں گے اس کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔

قیامت کے روز جب یہاں کے غیر مسلموں کا مقدمہ پیش ہو گا تو وہ کہہ سکتے ہیں
کہ اسلام کے پیروکاروں نے نہ صرف ہمیں دین نہیں سکھایا تھا بلکہ الٹا اپنے
غلط کردار سے ہم کو اسلام سے متنفر کرنے کا موجب بنے تھے۔ اب آپ
سوچ لیجئے کہ یہ کتنی بڑی ذمہ داری ہے جس کا آپ کو آخرت میں جواب دینا
ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ حضرات اپنے آپ کو اس کام کے لئے
تیار کریں کہ آپ اسلام کے متعلق یہاں کے باشندوں کے شکوک و شبہات
دور کر سکیں۔ آپ اسلام کو عمدگی کے ساتھ اور احسن طریق سے اپناتے
ہوئے عیسائیت کے بارے میں پوری پوری معلومات حاصل کریں اس کے
لئے آپ اپنا دینی لٹریچر بھی پڑھیں اور عیسائیت کا بھی مطالعہ کریں اس
طرح آپ کو ان کے حالات کی اصلاح کرنے میں کافی آسانی رہے گی۔
عیسائیت کا مطالعہ کرنے سے آپ انہیں بتا سکتے ہیں کہ وہ لوگ خود اصلی
دین مسیح سے کتنے دور ہیں آپ ان پر ثابت کر سکتے ہیں کہ موجودہ عیسائیت
تو سینٹ پال کی پیرو ہے نہ کہ عیسٰی علیہ السلام کی۔ اس طرح ان کا اپنا
لٹریچر بھی آپ کا مددگار بن سکتا ہے۔ اور آپ یہاں اسلام کی تبلیغ
کر سکتے ہیں۔

(ہفت روزہ آئین لاہور)

مغرب کو اسلام کی دعوت

[۴ ۔ مارچ ۶۹ء کو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب سے " دنیا میں اسلام" (ISLAM IN THE WORLD) کے موضوع پر اٹلی کی ایک سرکاری ٹیلی ویژن کمپنی کے نمائندے کے سوالات اور مولانا کے جوابات]

سوال :۔

برصغیر میں اسلام کی آمد پر یہاں کے باشندوں کو کس چیز نے اپیل کیا ؟

جواب :۔

برصغیر میں اسلام پہلی صدی ہی میں آگیا تھا۔ پہلی صدی سے میری مراد پہلی صدی ہجری ہے۔ اس زمانے میں اسلام کو دو مذہبوں سے سابقہ پیش آیا۔ ایک بدھ مت، دوسرے ہندومت۔ بدھ ازم ایک ایسا ازم ہے جو انسان کو رہبانیت سکھاتا ہے اور ہندوازم ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کو طبقات میں تقسیم کرتا ہے ایسے مستقل طبقات میں جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ ہندوازم شرک و بت پرستی پر مبنی ہے اسلام جب آیا تو اس نے یہاں ایک طرف توحید کا عقیدہ پیش کیا۔ دوسری طرف اس نے طبقاتی تقسیم کو باطل ثابت کیا اور تمام انسانیت کی وحدت پر زور دیا، تیسری طرف اس نے انسان کو

یہ بتایا کہ اس کی ترقی کا فطری راستہ ترکِ دُنیا اور رہبانیت نہیں ہے بلکہ اجتماعی زندگی میں رہتے ہوئے خدا اور اس کے بندوں اور خود اپنے نفس کے حقوق ادا کرنا ہے، جو اثرات اسلام نے برصغیر کے باشندوں پر ڈالے ان کا اندازہ کرنے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جہاں اسلام کی آمد سے پہلے ایک مسلمان بھی موجود نہ تھا۔ وہاں آج کروڑوں مسلمان پائے جاتے ہیں، کیونکہ ان کے ذہن کو اسلام کی تعلیم توحید نے، وحدتِ انسانی کے تخیل نے، اور اجتماعی زندگی کی اصلاح کے پروگرام نے اپیل کیا۔

سوال:۔

جدید دور کے لئے اسلام کا اجتماعی فلسفۂ حیات کیا ہے؟

جواب:۔

اسلام کا اجتماعی فلسفۂ حیات ہر زمانے کے لئے ہے۔ وہ جدید دور کے لئے بھی اسی طرح صحیح اور درست ہے جس طرح قدیم دور کے لئے تھا اور آئندہ آنے والے ہزاروں سال کے لئے رہے گا۔ اس کا فلسفۂ حیات اس تصور پر مبنی ہے کہ انسان کے لئے صحیح رویۂ زندگی اللہ وحدہٗ لاشریک کی بندگی و اطاعت اور اس قانون کی پیروی ہے جو اللہ تعالےٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا ہے چونکہ یہ ساری کائنات اللہ تعالےٰ کی سلطنت ہے اور انسان فطری طور پر اس کا بندہ ہے، اس لئے ہر زمانے میں انسانوں کے لئے صحیح رویّہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کی بندگی اور اطاعت کریں اور اس قانون کی پیروی کریں جو اس کائنات کے بنانے والے نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا ہے یہی طریقِ زندگی ہر زمانے کے لئے ٹھیک، صحیح اور درست ہے، جب کبھی انسان نے اس سے انحراف کیا اس کو ایسے پیچیدہ مسائل سے سابقہ پیش آیا جن کو وہ اپنی عقل سے کبھی صحیح طور پر حل نہ کر سکا۔ موجودہ دور میں جو تمدّن اور تہذیب کا نظام پایا جاتا ہے وہ چونکہ خدا کی اطاعت سے منحرف اور اس کے قانون سے بے نیاز ہے اس لئے اس نے بھی بے شمار ایسے مسائل

پیدا کر دیئے ہیں جن کے حل کرنے پر انسان قادر نہیں ہو رہا ہے۔

مثلاً آج خاندانی زندگی کا نظام موجودہ تہذیب ہی کی وجہ سے درہم برہم ہو رہا ہے۔

مثلاً اسی تہذیب و تمدن کی بدولت رنگ و نسل کے امتیازات اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ دنیا میں کبھی انسانیت پر اتنا ظلم و ستم نہیں ہوا ہے جتنا اس رنگ و نسل کے امتیاز کی بدولت آج ہو رہا ہے۔

مثلاً اس تہذیب نے نیشنلزم کا طوفان برپا کر دیا جس کی بدولت دنیا میں دو عظیم الشان لڑائیاں ہو چکی ہیں اور مزید ہوتی نظر آ رہی ہیں۔

یہ سب کچھ اسی وجہ سے تو ہے کہ انسان نے علوم طبیعی کی طرح اپنی اجتماعی زندگی کے لئے بھی اپنی عقل ہی کو کافی سمجھ لیا ہے اور اپنی زندگی کا نظام اپنی عقل سے تصنیف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس فطری نظام کو اختیار کیا جائے، جو انسان کے لئے خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے تو یہ مسائل کبھی پیدا نہ ہوں اور اگر کبھی پیدا ہو بھی جائیں تو ان کو آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔

سوال:۔

نسل اور رنگ کا مسئلہ اسلام کس طرح حل کرتا ہے؟

جواب:۔

نسل اور رنگ کے مسئلے کے پیدا ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ آدمی محض اپنی جہالت اور تنگ نظری کی بنا پر یہ سمجھتا ہے اور جو شخص کسی خاص نسل یا ملک یا قوم میں پیدا ہو گیا ہے وہ کسی ایسے شخص کے مقابلے میں زیادہ فضیلت رکھتا ہے جو کسی دوسری نسل یا قوم یا کسی دوسرے ملک میں پیدا ہوا ہے حالانکہ آدمی کی پیدائش ایک اتفاقی امر ہے۔ اس کے اپنے انتخاب کا نتیجہ نہیں ہے۔ اسلام ایسے تمام تعصبات کو جاہلیت قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام انسان ایک ماں اور ایک باپ سے پیدا ہوئے ہیں اور

انسان اور انسان کے درمیان فرق کی بنیاد اس کی پیدائش میں بنیاد نہیں بلکہ اس کے اخلاق ہیں اگر ایک انسان اعلیٰ درجے کے اخلاق رکھتا ہے تو خواہ وہ کالا ہو یا گورا۔ خواہ وہ افریقہ میں پیدا ہوا ہو یا امریکہ میں یا ایشیا میں، بہرحال وہ قابلِ قدر انسان ہے۔ اور اگر ایک انسان اخلاق کے اعتبار سے ایک بُرا آدمی ہے تو خواہ وہ کسی جگہ پیدا ہوا ہے اور اس کا رنگ خواہ کچھ ہی ہو اور اس کا تعلق خواہ کسی نسل سے ہو، وہ ایک بُرا انسان ہے۔ اسی بات کو ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ فضیلت اگر ہے تو وہ تقویٰ کی بنا پر ہے جو شخص خدا کی صحیح صحیح بندگی کرتا ہے اور خدا کے قانون کی صحیح صحیح پیروی کرتا ہے، خواہ وہ گورا ہو یا کالا، بہرحال وہ اس شخص سے افضل ہے جو خدا ترسی اور نیکی سے خالی ہو۔ اسلام نے اسی بنیاد پر تمام نسلی اور قومی امتیازات کو مٹایا ہے۔ وہ پوری نوعِ انسانی کو ایک قرار دیتا ہے اور انسان ہونے کی حیثیت سے سب کو برابر کے حقوق دیتا ہے۔ قرآن وہ پہلی کتاب ہے جس نے انسان کے بنیادی حقوق کو واضح طور پر بیان کیا ہے اور اسلام وہ پہلا دین ہے جس نے تمام انسانوں کو جو کسی مملکت میں شامل ہوں، ایک جیسے بنیادی حقوق عطا کیئے ہیں۔ فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ اسلامی ریاست چونکہ ایک نظریہ اور اصول (IDEOLOGY) پر قائم ہوتی ہے۔ اس لئے اس نظریہ کو جو لوگ مانتے ہوں اسلامی ریاست کو چلانے کا کام انہی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو لوگ اسے مانتے اور سمجھتے ہیں وہی لوگ اس پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں۔ لیکن انسان ہونے کی حیثیت سے اسلام تمام ان لوگوں کو یکساں تمدنی حقوق عطا کرتا ہے جو کسی اسلامی ریاست میں رہتے ہوں۔ اسی بنیاد پر اسلام نے ایک عالمگیر امت (WORLD COMMUNITY) بنائی ہے جس میں ساری دنیا کے انسان برابر کے حقوق کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں۔ حج کے موقع پر

ہر شخص جا کر دیکھ سکتا ہے کہ ایشیا، افریقہ، امریکہ، یورپ اور مختلف ملکوں کے لاکھوں مسلمان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور ان کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں پایا جاتا۔ ان کو دیکھنے والا ایک ہی نظر میں یہ محسوس کر لیتا ہے کہ یہ سب ایک اُمّت ہیں اور ان کے درمیان کوئی معاشرتی امتیاز نہیں ہے۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو دنیا میں رنگ و نسل کی تفریق کی بنا پر آج جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اس کا ایک لمحت خاتمہ ہو سکتا ہے

سوال:۔

شراب اور سُود کی حرمت کے کیا وجوہ ہیں؟

جواب:۔

سب سے پہلے آپ شراب کے مسئلے پر غور کریں علمی بنیاد پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ الکوحل انسان کے جسم کے لئے بھی نقصان دہ ہے اور عقل کے لئے بھی۔ اس وقت دنیا میں الکوحلزم ایک خطرناک مسئلے کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ بکثرت انسان ایسے ہیں جو اسی الکوحلزم کی بدولت عملاً اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں کھو چکے ہیں اور معاشرے کے لئے ایک مسئلہ بن چکے ہیں۔ اس بات کو بھی مانا جاتا ہے کہ دنیا میں بکثرت حادثات (ACCIDENTS) اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ آدمی کے خون میں اگر ایک خاص مقدار میں الکوحل موجود ہو اور اس حالت میں وہ گاڑی چلائے تو اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے اور دوسرے انسانوں کے لئے بھی خطرہ بن جاتا ہے لیکن اس پر کوئی اتفاق نہیں ہو سکا ہے کہ وہ خاص مقدار کون سی ہے جس کا پایا جانا ذہنی توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔ بہرحال یہ مسلّم ہے کہ الکوحل ایک ایسی چیز ہے جو انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو متوازن نہیں رہنے دیتی۔ اسی وجہ سے اسلام نے الکوحل کو قطعی طور پر ممنوع قرار دیا ہے۔ آج تک کوئی شخص یہ طے نہیں کر سکا ہے کہ کتنی مقدار میں الکوحل ہر شخص کے لئے مضر ہے۔ اور کتنی مقدار میں غیر مضر۔ یہ نسبت مختلف انسانوں کے معاملہ میں مختلف ہوتی ہے

اور کوئی ایسا قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جا سکتا کہ فلاں خاص مقدار تک الکوحل کا استعمال تمام انسانوں کے لئے یکساں غیر مُضر ہوگا۔ اور اس سے زائد مقدار سب کے لئے یکساں مضر ہوگی اسی لئے اسلام نے یہ اصول قرار دیا ہے کہ جو چیز حرام ہے اس کی کم سے کم مقدار بھی حرام ہے کیونکہ اس کی کم مقدار کو حلال قرار دینے کے بعد کوئی خط ایسا نہیں کھینچا جا سکتا جہاں جواز کی حد ختم ہوسکے اور عدم جواز کی شروع ہو جائے۔ لہٰذا قابل عمل صورت یہی ہے کہ اس کو قطعی طور پر ممنوع قرار دے دیا جائے اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب یا نظام تہذیب ایسا نہیں ہے جس نے انسان کو الکوحلزم سے بچانے میں وہ کامیابی حاصل کی ہو جو اسلام نے حاصل کی ہے۔ امریکہ نے اسی صدی میں اس بات کی کوشش کی تھی کہ امریکی قوم کو شراب کے نقصانات سے بچایا جائے چنانچہ امریکی دستور میں ایک ترمیم کے ذریعہ سے شراب کو ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن یہ تجربہ ناکام ہوگیا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ شراب کا سائنٹیفک بنیاد پر مُضر ہونا پہلے ثابت ہوگیا تھا اور بعد میں اس کا غیر مُضر ثابت ہوگیا۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امریکہ کی حکومت اور اس کا پورا قانونی نظام اپنا سارا زور لگا کر بھی لوگوں کو شراب چھوڑنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ یہ دراصل امریکی تہذیب کے نظام کی کمزوری تھی اس کے برعکس اسلام کا تہذیبی نظام اتنا طاقت ور تھا کہ ایک حکم مسلمانوں کو شراب سے روک دینے کے لئے کافی ہوگیا اور اس حکم میں آج تک اتنی طاقت ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اب بھی شراب سے اجتناب کے معاملہ میں مسلمانوں کی برابری نہیں کر سکتی۔

جہاں تک سؤر کا تعلق ہے تمام آسمانی شریعتوں میں وہ ہمیشہ سے حرام رہا ہے آج بھی بائیبل میں اس کی حرمت کا حکم موجود ہے۔ اور حضرت عیسٰی علیہ السلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں آج سے سؤر کو حلال قرار دیتا ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عیسائیت نے بھی اس حکم کو برقرار رکھا جو پہلے سے بائیبل میں خنزیر کی حرمت کے لئے موجود تھا۔ اگر سؤر کسی وقت بھی حلال کیا گیا ہوتا تو اس کا ثبوت موجود ہوتا۔ کہ فلاں پیغمبر نے یا خدا کی فلاں کتاب نے

اس کو حلال قرار دیا ہے۔ لیکن میرے علم میں نہیں ہے کہ کبھی خدا کی کسی کتاب میں اس کے حلال ہونے کا حکم آیا ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ سُور کیوں حرام ہے؟ اس کے بارے میں یہ اُصولی بات سمجھ لینی چاہیئے کہ انسان ان چیزوں کی بُرائی کو تو جان سکتا ہے جو جسمانی حیثیت سے اس کے لئے نقصان دہ ہوں لیکن وہ آج تک کبھی یہ جاننے پر قادر نہیں ہوا ہے کہ کونسی غذائیں اس کے اخلاق پر بُرا اثر ڈالتی ہیں اور روحانی حیثیت سے اس کے لئے نقصان دہ ہیں۔ غذاؤں کے اخلاقی اثرات جاننے اور ٹھیک ٹھیک ان کو متعیّن کرنے کے ذرائع انسان کو حاصل نہیں ہیں۔ اسی لئے یہ کام خدا نے اپنے ذمّہ لیا ہے کہ جو چیزیں انسان کے اخلاق اور اس کی روح کے لئے نقصان دہ ہیں ان کی نشاندہی وہ خود کر دے اور انہیں حرام قرار دے۔ اب اگر کوئی شخص خدا پر اعتماد کرتا ہو تو اسے وہ چیزیں چھوڑ دینی چاہیئں جن سے اس نے منع کیا ہے، اور جو خدا پر اعتماد نہ رکھتا ہو وہ جو کچھ چاہے کھاتا رہے۔

مُجلّۃ الغُرباء کا سوالنامہ اور اُسکا جواب

{لندن سے ایک رسالہ عربی زبان میں مُجلّۃ الغُرباء کے نام سے نکلتا ہے جسے ان عرب طلباء نے جاری کیا ہے جو برطانیہ میں مقیم ہیں اور اپنی دوسری مصروفیتوں کے ساتھ اسلام کی خدمت بھی انجام دے رہے ہیں۔ اس رسالے نے مولانا مودودی سے ان کے زمانۂ قیام لندن میں چند سوالات کئے تھے جن کا جواب انہوں نے وہیں دے دیا تھا۔ ذیل میں یہ سوالنامہ اور اس کے جوابات درج کئے جا رہے ہیں ـــــ }

سوالنامہ

۱۔ الغرباء اسلام پسند طلبہ کا مُجلّہ ہے اور برطانیہ سے عربی زبان میں نکلتا ہے۔ ہمیں خوشی ہو گی کہ آپ قارئین مُجلّہ کو جماعت اسلامی پاکستان کے حالات سے مختصراً آگاہ فرمائیں۔

۲۔ پاکستانی مسلمانوں کے اندر مختلف مذہبی تصورات پائے جاتے ہیں، جماعت اسلامی نے اختلافِ مذاہب کے مسئلہ کو کس طرح حل کیا ہے؟

۳۔ موجودہ حالات میں وہ کونسا اہم ترین میدانِ کار ہے جس پر اسلامی تحریک کو اپنی

تمام تر کوششیں مرکوز کر دینی چاہئیں؟ کیا سیاسی میدان؟ یا تعلیمی میدان؟ یا کوئی اور میدان؟

۴۔ اسلامی تحریک کی ایک متحدہ عالمی قیادت قائم کرنے پر مدت سے سوچ بچار ہو رہا ہے۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے!

۵۔ عالمِ اسلام اس وقت جن حالات سے گزر رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہیں ان حالات میں امورِ ذیل کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

الف: مسلمان سربراہوں کی کانفرنس کا انعقاد،

ب: مشترکہ اسلامی منڈی کا قیام،

ج: بین الاقوامی اسلامی نیوز ایجنسی کا اجراء،

۶۔ اسلامی تحریکیں اس وقت جگہ جگہ حکومتوں کے جبر و تشدد کی فضا میں سانس لے رہی ہیں، چنانچہ آپ کی نظر میں وہ کونسا مناسب ترین رویّہ ہے جو اسلامی تحریکوں کو ان حکومتوں کے بارے میں اختیار کرنا چاہیئے؟

۷۔ آپ کی رائے میں اسلامی تحریک کو مغربی ممالک میں کس اہم پہلو پر زور دینا چاہیئے؟

۸۔ مغرب میں کام کرنے والے داعیانِ اسلام کے لئے آپ کے مشورے کیا ہیں؟

۹۔ دو حرفی سوال ہے کہ بیت المقدس کی واگزاری کا صحیح راستہ کیا ہے!

۱۰۔ آپ کے قلم نے اسلامی نظریات اور اسلامی تاریخ کے متعدد گوشوں پر وافر لٹریچر فراہم کر دیا ہے۔ مگر ابھی تک سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر آپ کی کوئی کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی۔ کیا آپ اس موضوع پر لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

۱۱۔ عہدِ حاضر کے اسلامی مفکر ہونے کی حیثیت سے کیا آپ نے اپنے دور میں اسلامی نظریہ کے اندر کوئی تبدیلی یا ترقی محسوس کی ہے؟

۱۲ اسلامی مفکرین نے موجودہ صدی میں، بلکہ کسی حد تک گذشتہ صدی میں بھی متعدد مغربی

اصطلاحیں استعمال کی ہیں مثلاً ڈیموکریسی، نیشنلزم، وطنیت، پارلیمنٹ، دستور سوشلزم وغیرہ۔ یہ اصطلاحیں ماضی قریب کے زمانے تک برابر استعمال ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض اسلامی مفکرین ان اصطلاحوں کے استعمال سے گریز کرتے ہیں، بلکہ اسلامی نظام کی تشریح میں ان اصطلاحوں کو اختیار کرنے کی مخالفت کر رہے ہیں اور ان کا رجحان ہی نہیں بلکہ اصرار ہے کہ خالص اسلامی اصطلاحات کو استعمال کرنا چاہیئے جو قرآنِ کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہوں کیا آپ اپنے تجربات اور اسلامی احساسات کی روشنی میں بتا سکتے ہیں کہ ہماری آئندہ نسلوں میں ایسے اسلامی مفکرین پیدا ہوں گے جو ہر اس چیز کو کُلیتہً رد کر دیں گے جو قرآن وسنت سے خارج ہو گی۔ اور اسلامی شریعت، احکام قرآن اور دیگر اسلامی معاملات کے بارے میں کسی بحث وجدال کو برداشت نہیں کریں گے، بلکہ ان تمام چیزوں کو اسی طرح اصل حالت میں اختیار کریں گے جس طرح دعوتِ اسلامی کے آغاز میں ان کو اختیار کیا گیا تھا؟

۱۳۔ دنیائے اسلام میں بیشتر لوگ اس خیال کا اظہار کر رہے ہیں، کہ ظہور مہدی (جس کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے) سے پہلے جس قسم کے حالات کی خبر دی گئی ہے وہ اس زمانے میں رونما ہو چکے ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

۱۴ مسلم اور اسلامی کے درمیان کیا فرق ہے؟ کیا ان دونوں لفظوں کا استعمال درست ہے؟۔

جواب

۱۔ مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ برطانیہ میں آپ لوگ مُجلّۃُ الغُرباء کے نام سے ایک عربی پرچہ شائع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی کوششوں میں برکت دے اور آپ اس پرچے کے ذریعے سے طلبہ میں اسلامی روح بیدار کرنے اور بیدار رکھنے

کے لئے کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔

جماعت اسلامی کے متعلق تمام ضروری معلومات آپ کو جماعت کے ایک ممتاز کارکن پروفیسر غلام اعظم صاحب (جنرل سیکرٹری جماعت اسلامی مشرقی پاکستان) کی ایک تازہ کتاب سے حاصل ہو سکتی ہیں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے[1]۔ اس کا ایک نسخہ اس جواب کے ساتھ آپ کو مہیا کیا جا رہا ہے۔

۲۔ پاکستان میں اس وقت تین ہی فقہی مذاہب ہیں۔ ایک حنفی، دوسرے اہل الحدیث، تیسرے شیعہ امامیہ۔ ان مذاہب کے علماء نے ۱۹۵۱ء میں باہم اتفاق سے یہ بات طے کر لی تھی کہ ملکی قانون (LAW OF LAND) اکثریت کے مسلک پر مبنی ہوگا۔ اور ہر فقہی مذہب کے پیرووں کو یہ حق دیا جائے گا کہ ان کے شخصی معاملات ان کے اپنے پرسنل لا کے مطابق طے کئے جائیں۔ رہے مختلف مذاہب کے اعتقادی اختلافات، تو نہ وہ دُور کئے جا سکتے ہیں، نہ ان کو دُور کرنا ضروری ہے۔ صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہر گروہ اپنے عقیدے پر قائم رہے اور سب ایک دوسرے کے ساتھ رواداری برتیں۔ اس کے لئے جماعت ملک میں مسلسل کوشش کر رہی ہے۔

۳۔ اسلامی تحریک کے لئے ساری دنیا میں کوئی ایک لگا بندھا طریقِ کار نہیں ہو سکتا۔ مختلف ممالک کے حالات مختلف ہیں، اور ہر جگہ کام کرنے والوں کو اپنے حالات کے مطابق طریقِ کار اختیار کرنا ہوگا۔ البتہ جو چیز مشترک رہے گی وہ اصول اور مقصد ہے جس کا منبع قرآن و سنّت ہے۔ اور وہی تحریکِ اسلامی کے تمام کارکنوں کو ایک وحدت میں منسلک کرتا ہے۔ جو گروہ جس ملک اور معاشرے میں اس تحریک کے لئے کام کرنے اُٹھے، اس کا یہ فرض ہے کہ اعتقاد اور عمل میں کتاب و سنت کی تعلیمات کا پورا اتباع کرے، اور اقامتِ دین کو اپنا مقصود بنا کر اپنی تمام مساعی اس پر مرکوز رکھے۔

---

[1] کتاب کا نام ہے (A GUIDE TO THE ISLAMIC MOVEMENT)

اس کے بعد اپنی تحریک کے لئے عملی پروگرام طے کرنا ہر علاقے کے لوگوں کا اپنا کام ہے، اور ان میں اتنی حکمت ہونی چاہیئے کہ وہ اپنی قوت، ذرائع اور حالات کے لحاظ سے اقامتِ دین کے لئے مناسب ترین طریقِ کار تجویز کریں۔

۴۔ جن حالات سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں، ان میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دنیا کے تمام ممالک کے لئے اسلامی تحریک کی کوئی ایک مرکزی قیادت قائم ہوسکے بلکہ اس وقت کے بین الاقوامی حالات تو اتنی بھی اجازت نہیں دیتے کہ ہمارے درمیان کوئی مراسلت اور تبادلۂ خیالات ہو سکے یا باہم وقتاً فوقتاً کوئی مشترک کانفرنس کر سکیں۔ سردست زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنی مطبوعات کے تبادلے کر کے ایک دوسرے کے حالات و خیالات سے واقف ہوتے رہیں، اور جہاں تک ممکن ہو، حج کے اجتماع سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔

۵۔ عالمِ اسلام کو اس وقت نہ صرف ان تینوں امور کی ضرورت ہے، بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں جو مسلم ممالک کو باہم مل کر کرنے چاہئیں۔ دو سال پہلے میں نے اس کے متعلق بارہ ۱۲ نکات پر مشتمل ایک پروگرام پیش کیا تھا۔ لیکن اس طرح کی تجویزیں اس وقت تک عمل میں نہیں آسکتیں جب تک مسلمان ملکوں کی حکومتیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں نہ ہوں جو اسلام کے رشتے کی بنا پر باہم متفق و متحد ہونے کیلئے تیار ہوں۔ سردست تو وہ "رجعت پسند" اور "ترقی پسند" کے جھگڑوں میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے ملکوں میں آئے دن انقلابات برپا کرنے سے ان کو فرصت نہیں مل رہی ہے۔

۶۔ میرے نزدیک یہ طے کرنا ہر ملک کی اسلامی تحریک کے کارکنوں اور قائدین کا کام ہے کہ جس قسم کا ظلم واستبداد ان پر مسلط ہے اس کے مقابلہ میں وہ کس طرح کام کریں۔ ہر ملک میں اس کی صورتیں اور کیفیتیں اتنی مختلف ہیں کہ سب کے لئے کوئی ایک طریقِ عمل

تجویز کرنا مشکل ہے۔ البتہ جو چیز میں ان سب کے لئے ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کو خفیہ تحریکات اور مسلح انقلاب کی کوششوں سے قطعی باز رہنا چاہیئے اور ہر طرح کے خطرات و نقصانات برداشت کر کے بھی علانیہ پُرامن اعلائے کلمۃ الحق کا راستہ ہی اختیار کرنا چاہیئے، خواہ اس کے نتیجے میں ان کو قید و بند سے دوچار ہونا پڑے یا پھانسی کے تختے پر چڑھ جانے کی نوبت آجائے۔

۷۔ مغربی ممالک میں جو لوگ اسلامی تحریک کا کام کریں ان کو چاہیئے کہ پہلے عملاً اپنی زندگی کو ٹھیک ٹھاک اسلامی سانچے میں ڈھالیں اور مغربی سوسائٹی کے اندر اپنی امتیازی شان نمایاں کریں۔ اہلِ مغرب کے ساتھ اخلاق اور اعمال اور طرزِ زندگی میں ہم رنگ ہو جانے کے بعد ان کی تحریک کے مؤثر ہونے کے امکانات آدھے سے زیادہ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری چیز یہ ہے کہ ان کو اہلِ مغرب کی تہذیب اور ان کے مذہب اور ان کے فلسفۂ حیات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے اور پھر ایسے حکیمانہ طریقہ سے تنقید اور تبلیغ کرنی چاہیئے جس سے مغربی ممالک کے سنجیدہ طبقے اسلام کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ آپ کا کم سے کم ہدف یہ ہونا چاہیئے کہ جس مغربی ملک میں بھی آپ ہوں وہاں کے کم از کم دوچار اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں کو اسلام کی طرف کھینچ لیں اور ان کو اسلامی تحریک کے لئے عملاً کام کرنے پر آمادہ کر دیں۔ اس کے بعد یہ ان کا کام ہوگا کہ اپنے ملک میں دعوتِ اسلامی کے کام کی ذمہ داری سنبھال لیں۔

۸۔ سوال نمبر ۸ کا جواب اوپر آچکا ہے۔ میرے نزدیک کسی مغربی ملک میں کام کرنے والے داعی اسلام کو مشرقی ممالک میں کام کرنے والوں سے بھی بڑھ کر اسلامی احکام کا سخت متبع ہونا چاہیئے۔

۹۔ بیت المقدس کی واپسی کا کوئی امکان میرے نزدیک اس وقت تک نہیں ہے جب تک فلسطین کے گرد و پیش کی عرب ریاستیں اپنی اس روش کو چھوڑ نہ دیں جس کی وجہ سے

انہوں نے ۱۹۴۸ء سے اب تک پے در پے یہودیوں سے شکستیں کھائی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ بیت المقدس کسی سیاسی تصفیے کے ذریعہ سے اب مسلمانوں کے قبضے میں نہیں آسکتا۔ اس کے لئے لامحالہ لڑنا ہوگا اور اتنی طاقت سے لڑنا ہوگا کہ اسرائیل کو پوری شکست دی جاسکے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ شام، عراق، مصر اور اردن میں اس وقت جو حالات پائے جاتے ہیں ان میں جنگ کا نتیجہ بیت المقدس کی واپسی کی بجائے رہے سہے کچھ مزید علاقے کھو دینے کی صورت میں رونما ہوگا رہے دوسرے اسلامی ممالک، تو وہ اسرائیل کے خلاف کوئی عملی اقدام نہیں کر سکتے جب تک وہ عرب ملک ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے تیار نہ ہوں جن کی سرحدیں اسرائیل سے ملتی ہیں۔

۱۰۔ میں ایک مدت سے تمنا رکھتا ہوں کہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی کتاب لکھوں، مگر مجھے ابھی تک اس کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ سردست میں نے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن مجید کی جو تفسیر آج کل میں لکھ رہا ہوں اس میں قرآن اور سیرت کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے اُن حالات کی تفسیر بیان کرتا جاؤں جن میں قرآن مجید کی آیات مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس تفسیر کی تکمیل کے بعد اگر مجھے اتنی مہلت اور طاقت دی کہ میں سیرت پاک پر بھی کوئی مستقل کتاب لکھ سکوں تو میرے لئے یہ بہت بڑی سعادت ہوگی۔

۱۱۔ میں نے پچھلے چالیس سال میں فکرِ اسلامی کے اندر مسلسل ایک تغیر محسوس کیا ہے، اور الحمدللہ کہ وہ بہتری کی طرف ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اب بہت زیادہ واضح شکل میں اسلامی تصوّرات دنیا کے سامنے آرہے ہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں مغربی مستشرقین کے شاگردوں نے بھی پہلے سے بہت زیادہ پُرفریب اور بظاہر علمی طریقے اختیار کر کے اسلام اور اس کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوششیں کی ہیں، مگر ہر مرحلے

پران کی سرکوبی کی جاتی رہی ہے۔ اور کم از کم مسلمان آبادیوں پر وہ اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں مسلمان بالعموم اب اسلام کو اتنی صاف شکل میں جان اور پہچان رہے ہیں کہ ان کو یہ مشرقی مستغربین دھوکا نہیں دے سکتے۔

۱۲۔ موجودہ زمانے کے لوگوں کو بات سمجھانے کے لئے جدید اصطلاحات کا استعمال تو ناگزیر ہے، لیکن ان کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے بعض اصطلاحوں سے پرہیز اولیٰ ہے، بلکہ اجتناب واجب ہے۔ مثلاً اشتراکیت۔ اور بعض کا استعمال اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ ان کے اسلامی مفہوم اور مغربی مفہوم کا فرق پوری طرح واضح کر دیا جائے، مثلاً جمہوریت، یا دستوریت، یا پارلیمنٹری سسٹم۔ اور بعض کو سرے سے کوئی اسلامی مفہوم دیا ہی نہیں جا سکتا، مثلاً نیشنلزم۔

۱۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئیاں ارشاد فرمائی ہیں ان میں سے کسی کے ظہور کی تاریخ بھی نہیں بتائی گئی ہے بلکہ صرف ان حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں کوئی واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اس طرح کے بیانات کی بنا پر قطعیت کے ساتھ کسی وقت بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کس پیشین گوئی کا ظہور ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم جن حالات کو دیکھ کر یہ رائے قائم کریں کہ یہ فلاں پیشین گوئی کے ظہور کا وقت ہے، ان کے بارے میں ہمارا اندازہ غلط ہو۔ ویسے تو ظہور قیامت کی علامات بھی اب بڑی حد تک دنیا میں پائی جاتی ہیں، لیکن قطعیت کے ساتھ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ اب اس کے برپا ہونے کا وقت آگیا ہے۔

۱۴۔ مسلم اور اسلامی میں ایک لحاظ سے تو کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے، کیونکہ مسلم حقیقت میں کہتے ہی اس کو ہیں جو اسلام کا متبع ہو۔ لیکن ایک دوسرے لحاظ سے ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے مسلم ہر اس گروہ یا شخص کو کہا جا سکتا ہے جو دائرہ اسلام سے خارج نہ ہو، خواہ وہ عملاً اسلام کی پیروی نہ کر رہا ہو۔ اور اس کے برعکس اسلامی صرف وہی چیز

ہے جو ٹھیک ٹھیک اسلام کے مطابق ہو۔ مثلاً ایک مسلم حکومت ہر اس حکومت کو کہا جا سکتا ہے جس کے حکمران مسلمان ہوں۔ لیکن اسلامی حکومت صرف اُسی کو کہا جا سکتا ہے جو اپنے دستور اور قوانین اور انتظامی پالیسی کے اعتبار سے پوری طرح اسلام پر قائم ہو۔

(ترجمان القرآن جلد ۷، شمارہ ۶)

لندن سے واپسی

لندن سے لاہور تک کے سفر کی ایک جھلک

● ــــــ ملک عبدالکریم (لندن)

● ــــــ خلیل حامدی (استنبول۔کویت۔دہران)

● ــــــ سعید اظہر خان سعید (کراچی)

● ــــــ حفیظ الرحمٰن احسن (لاہور)

لندن سے روانگی :-

مولانائے محترم جب یو کے اسلامک مشن کے صدر مولانا حبیب الرحمن، مشرقِ وسطیٰ کے مختلف حضرات اور دیگر صاحبان کے ساتھ وٹینگ روم میں داخل ہوئے تو جیسے دوری کا لمحہ اپنی واضح صورت میں سامنے آگیا ـــــــــــــــ

اس موقع پر سب حضرات کی طرف سے مولانائے محترم کی خدمت میں درخواست کی گئی کہ وہ انہیں کوئی نصیحت ارشاد فرمائیں۔

"میں تو آپ سے ایک ہی بات کہتا رہا ہوں اور اب بھی وہی کہتا ہوں کہ آپ یہاں اسلام کا عملی نمونہ بنیں۔ اپنی زندگیوں کو دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بنائیے اگر آپ ایسا کرسکیں تو یہ آپ کی خوش قسمتی ہوگی" ۔

کراچی میں

۲۸ دسمبر کو مولانائے محترم نے کراچی میں حاضرین کے ایک وسیع اجتماع میں ان کے سوالات کے جوابات دیئے چند سوالات اور ان کے جوابات ذیل ہیں۔

تخریب کار عناصر اور جماعت اسلامی

سوال :-

بعض عناصر ملک میں توڑ پھوڑ اور تشدد کی کارروائیوں کی راہ اختیار کر رہے ہیں ان کو روکنے کے لئے آپ کا لائحہ عمل تجویز فرماتے ہیں؟ کیا جمہوریت کی بحالی کے سلسلے میں ان سے کسی طرح کا اشتراک کیا جاسکتا ہے؟

جواب

اس غرض کے لیے لائحہ عمل پہلے بھی جماعت پیش کر رہی ہے تاہم اس موقع پر جو پہلی بات میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پاکستان کسی سوشلزم، برطانیہ ازم، امریکہ ازم یا مارکس ازم کے لیے قائم نہیں کیا گیا تھا یہ ملک صرف اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اس لئے یہاں صرف اسلامی نظام ہی آئے گا کسی طاقت کی یہ جرأت نہیں کہ وہ یہاں اسلام کے علاوہ کوئی اور ازم نافذ کرے۔ جب تک ہم زندہ ہیں ایسا نہیں ہو سکے گا۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم اس ملک کی اصلاح کے لئے اٹھے ہیں اسے خراب کرنے کے لئے نہیں اللہ کے فضل سے جماعت اسلامی ایک منظم جماعت ہے اور وہ صرف ایسے عناصر کے ساتھ مل کر کام کرے گی۔ جو مفسد اور غارت گر نہیں ہیں۔ جماعت اسلامی نہ تو کسی تخریب کار گروہ سے تعاون کرے گی اور نہ اسے یہاں کام کرنے دے گی۔

سوشلزم کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال۔

اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کرنے والے بعض لوگ سوشلزم کے جواز میں یہ موقف پیش کرتے ہیں کہ اسلام پر سوشلزم کے لفظ کا اضافہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں تمام ذرائع پیدائش پر حکومت کا کنٹرول ہوتا ہے اور اسلام بھی مساوات کا قائل ہے۔ یہ کہنا کہاں تک درست ہے۔؟

جواب۔

دراصل یہ لوگ خالص سوشلسٹ نظام چاہتے ہیں لیکن مجبوراً اسلام کا لفظ استعمال کرتے ہیں حالت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہاں شرک بھی پھیلانا چاہتا ہے

تو وہ کہتا ہے کہ اسلامی شراب ہے جو شخص شراب پینا چاہتا ہے اس کی کوشش بھی یہ ہے کہ وہ پہلے اسے اسلامی شراب باور کرائے پھر پیئے۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اس کے ساتھ کسی دوسرے ازم کی پیوند کاری کا سوال پیدا نہیں ہوتا جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں انہیں منافقت ترک کر کے صاف صاف کہہ دینا چاہیئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی قبول نہیں کرتے مارکس اور لینن کی رہنمائی چاہتے ہیں ہمارے نزدیک مغربی سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کفر ہیں اور اسلام دونوں کو ختم کرنا چاہتا ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ جب ہم کیمونزم کی مخالفت کرتے ہیں تو ہمیں سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا جاتا ہے اس کے برعکس جب ہم سرمایہ داری کی مخالفت کرتے ہیں تو یہی لوگ کان بند کر لیتے ہیں۔ جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انہیں صرف اسلام کہتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے بہرحال نام سوشلزم کا ہو یا اسلامی سوشلزم کا، اسلام کے خلاف اس قسم کی جو تحریک بھی چلائی جائے گی جماعت اسلامی اس کا مقابلہ کرے گی اور اسے یہاں چلنے نہیں دے گی خوش کن نعروں یا لیبلوں سے کوئی اور دھوکا کھائے تو کھائے لیکن خدا کے فضل سے جماعت اسلامی دھوکا نہیں کھائے گی۔

آئینی انقلاب کیوں ضروری ہے

سوال۔

تحریک جمہوریت کے زعماء بار بار یہ کہتے ہیں کہ تبدیلی اقتدار آئینی ذرائع سے ہونی چاہیئے، لیکن گذشتہ انتخابات سے ثابت ہو گیا کہ رائے عامہ کی واشگاف تائید کے باوجود پُرامن تبدیلی ممکن نہیں ہے، دوسری طرف یہ صورت ظاہر ہے کہ تخریب پسندی اور توڑ پھوڑ میں ہلاکت ہے پھر

آخر اس کا حل کیا ہے ؟

جواب۔

آئینی طریقے سے حالات کی تبدیلی کا مفہوم اور ہے اور کسی ملک کے آئین کی پابندی کرتے ہوئے حالات کو تبدیل کرنے کا مفہوم اور ہے۔ آئینی ذرائع سے نظام کی تبدیلی کا مطلب یہ نہیں کہ موجودہ آئین کے مقرر کردہ طریقوں کے اندر رہ کر ہی کوششیں کی جائیں گی بلکہ دنیا بھر میں آئینی ذرائع سے جو مطلب لیا جاتا ہے ان ذرائع کو اختیار کر کے تبدیلی کی جائے گی۔ اور یہ ذرائع موجودہ آئین کے مقرر کردہ طریقوں سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک توڑ پھوڑ کی کارروائیوں کا تعلق ہے اس ملک میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جو ایسی کارروائیوں کے ذریعے سے اقتدار پر قبضہ کر کے اشتراکی آمریت قائم کرنا چاہتا ہے اشتراکی انقلاب آتا ہی توڑ پھوڑ کے ذریعے سے ہے ان کا فلسفہ یہی ہے کہ بندوق کی نالی انقلاب کا سرچشمہ ہے" اگر اس وقت ملک کے حالات توڑ پھوڑ کی طرف گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک اشتراکی انقلاب کے قریب آرہا ہے لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیئے کہ توڑ پھوڑ اور تشدد کے ذریعے کوئی مستحکم اور پائیدار نظام حکومت قائم نہیں کیا جا سکتا۔ لاطینی امریکہ اور افریقہ کے ان ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جہاں اس قسم کی کارروائیوں کے بعد انقلاب لائے گئے اور پھر وہاں انقلاب در انقلاب کا سلسلہ شروع ہو گیا اس لئے نہ ہم خود تشدد کا راستہ اختیار کریں گے اور نہ دوسروں کو اختیار کرنے دیں گے۔

مولانا نے اس موقع پر اپنے خطاب میں فرمایا۔

واقعہ یہ ہے کہ ابھی آپ لوگ مجھ سے کچھ زیادہ توقعات نہ رکھیں اس لئے کہ ابھی مجھے کم از کم تین چار مہینے آرام لینے کی ضرورت ہے میں تین چار منٹ سے زیادہ

کھڑا نہیں رہ سکتا ہوں اور سو دو سو قدم سے زیادہ مسلسل چل نہیں سکتا، بیٹھ کر فی الحال جو خدمت کر سکتا ہوں اس میں انشاءاللہ کوئی کمی نہیں کروں گا اس لئے ابھی مجھ سے کچھ لمبی چوڑی توقعات نہ رکھیں اس میں شک نہیں کہ اس وقت کے حالات یہ چاہتے ہیں کہ میں ایک منٹ کے لئے بھی نہ بیٹھوں مجھے اس بات کا بڑا غم ہے کہ میری صحت نے ایسے وقت میں جواب دیا ہے جب کہ مجھے سب سے زیادہ مستعدی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت تھی لیکن اللہ تعالےٰ کی مشیت کے آگے کسی کا کچھ بس نہیں چلتا ممکن ہے کہ اس میں اللہ تعالےٰ کی کوئی حکمت اور مصلحت ہو ہمیں ہر حال میں جس میں بھی اللہ تعالےٰ نے رکھے خوش رہنا چاہیئے۔ اور صبر اور شکر کے ساتھ اس کی مشیت کو قبول کرنا چاہیئے۔

اس ملک میں جو حالات ہیں میں وہاں لندن میں بھی اخبارات کے ذریعے معلوم کرتا رہا ہوں اور کراچی پہنچنے سے برابر اب تک ان حالات کا مطالعہ کرتا رہا ہوں اپنے رفقاء سے بھی تبادلۂ خیالات کرتا رہا ہوں عنقریب مجلس عاملہ کا اجلاس ہوگا اس میں بھی پوری طرح حالات کا جائزہ لیا جائے گا انشاءاللہ جماعت اسلامی اپنی حد تک اس معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں کرے گی کہ اس ملک میں آمریت کا جلدی سے جلدی خاتمہ کیا جائے، جمہوریت کو بحال کیا جائے اور کسی ایسی تحریک کو اس ملک میں چلنے نہ دیا جائے جو اسلام کے راستے سے ہٹا کر پاکستان کو کسی اور راستے پر لے جانا چاہے۔

(نعرہ ہائے تکبیر)

حضرات! جب تک ہم زندہ ہیں اور جب تک ہمارے سر اپنی گردنوں پر قائم ہیں اس وقت تک کسی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ یہاں اسلام کے سوا کسی اور نظام کو چلا سکے یہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی امت کا ملک ہے، یہ مارکس اور ماؤزے تنگ کی امت کا ملک نہیں ہے یہاں کوئی دوسرا نظام انشاءاللہ نہ چل سکے گا۔ اور

انشاءاللہ لادین طبقے کی آمریت بھی یہاں نہیں چل سکے گی۔

(نہایت پُرجوش نعرہ ہائے تکبیر)

میں اس وقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں یہ ابھی باہمی مشورے کے بعد ہی طے کرنا ہوگا کہ ہمیں کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہے جو جماعتیں تحریک جمہوریت میں ساتھ ہیں ان سے بھی مشورہ کرنا ہے اور خود اپنی جماعت کے ذمہ دار لوگوں سے بھی مشورہ کرنا ہے اس کے بعد ہی ہم یہ طے کر سکیں گے کہ ہم کو یہاں ان دو گمراہ کن چیزوں کے مقابلے کے لیے بیک وقت کیا کرنا ہے اگر اللہ کے دین کے لیئے ہم کو لڑنا پڑے تو ہم خدا کے فضل سے دس محاذوں پر بھی لڑنے سے نہ چوکیں گے۔

(انشاء اللہ کی صدائیں اور نعرہ ہائے تکبیر)

ہم انشاءاللہ بیک وقت آمریت سے بھی لڑیں گے اور لادینیت سے بھی لڑیں گے۔

عوامی ردّعمل غیر متوقع نہیں تھا۔

سوال۔

جب موجودہ حکومت کے خلاف عوام کا لاوا اچانک پھٹ پڑا تو اس کے متعلق خبریں سُن کر آپ کے تاثرات کیا تھے؟

جواب۔

میرے لئے کوئی چیز خلاف توقع نہیں تھی۔ میں ہر وقت یہ توقع رکھتا تھا کہ جو لاوا اندر ہی اندر پک رہا ہے وہ کسی نہ کسی وقت پھوٹ بہے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ یہاں آمریت چلا رہے تھے خدا نے انہیں عقل نہیں دی ہے۔ اور افسوس ہے کہ آنکھیں بھی نہیں دی ہیں اپنے اردگرد انہوں نے ایک حصار چن رکھا ہے جس کے اندر وہ اس

غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ انہیں اس ملک میں کوئی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہے اس غلط فہمی کو بہرحال کسی نہ کسی وقت رفع ہونا تھا میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اب بھی رفع ہوئی ہے یا نہیں۔ بہرحال ڈکٹیٹروں کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ چاہے سارا ملک ان پر پھٹکار بھیجتا رہے مگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سارا ملک اس بات کا خواہش مند ہے کہ وہ ان کے سر پر سلامت رہیں۔

واحد پارٹی کا تصوّر اور جمہوریت۔

سوال :۔

بحالی جمہوریت کی تحریک کے اس دور میں پھر بعض حلقوں کی طرف سے ایک اپوزیشن پارٹی کے قیام کی تجویز آرہی ہے کیا جماعت اسلامی کے لئے ایسی کوئی تجویز قابل قبول ہو گی۔ ؟

جواب ۔

جو لوگ ایک اپوزیشن پارٹی کی تجویز پیش کرتے ہیں میرا خیال یہ ہے کہ انہیں سیاست کی ہوا بھی نہیں لگی ہے وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ ایک ملک میں ایک پارٹی نہیں بنا کرتی۔ اگر آپ جمہوریت چاہتے ہیں تو مختلف الخیال لوگوں کو اس بات کا موقع ملنا چاہیئے۔ کہ وہ اپنے ہم خیال لوگوں کو جمع کریں اپنا نقطۂ نظر پیش کریں، خلق خدا جس نقطۂ نظر کو قبول کرے گی وہی ملک میں جاری ہوگا . . . جو لوگ آج ایک پارٹی کی بات کرتے ہیں، بعید نہیں ہے کہ وہ کل یک جماعتی ریاست ONE-PARTY STATE) قائم کرنے کی فکر کریں کوئی صاحب عقل آدمی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ سارے ملک کی تمام پارٹیاں ختم ہو جائیں اور ایک پارٹی بن جائے۔ جو کچھ معقول تھا وہ یہاں ہو گیا یعنی ملک میں جو پانچ جماعتیں واقعی جمہوریت کی قائل تھیں اور جن کے پیش نظر واقعی ایمان داری سے یہ ہے کہ اس ملک میں جمہوریت قائم ہو وہ باہم متحد ہو گئی ہیں۔

جس نوعیت کا اتحاد درکار تھا۔ وہ خدا کے فضل سے قائم ہو گیا ہے۔

سوال

آئندہ یورپ میں اسلام کا مستقبل کیا ہو گا؟۔

جواب۔

میں دنیا بھر کا حالات کا مطالعہ کرتا ہوں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جب تک ہم پاکستان میں اسلام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے ہم باقی دنیا میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ (ہفت روزہ آئین لاہور)

ایک امریکی بہائی اور مودودی کے درمیان مکالمہ

بہائی فرقے سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب جناب ڈگلس جو امریکہ سے تشریف لائے ہیں اور آج کل لاہور میں تعلیم اور مطالعے کے سلسلے میں مقیم ہیں مولانا کی مجلس میں موجود تھے وہ انگریزی میں سوال کر رہے تھے اور مولانا بھی رواں انگریزی میں جواب دے رہے تھے۔ لیجئے آپ بھی مسٹر ڈگلس اور مولانا مودودی کی گفتگو میں شریک ہو جائیے۔

سوال۔

"جناب عالی! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ پاکستان میں ایک دینی جماعت کے قائد ہیں اور آپ کی جماعت پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور جیسا کہ آپ مجھے انگریزی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھ کر معلوم ہوا ہے کہ آپ اسی اسلامی انقلاب کو ساری دنیا میں برپا کرنے کا عزم بھی رکھتے ہیں تو کیا اس زمانے میں ایسا ممکن ہے؟"

مسٹر ڈگلس خاموش ہوئے تو مولانا نے فرمایا۔

جواب۔ " جی ہاں یقیناً ہم یہ عزم اور ارادہ رکھتے ہیں کہ خدا تعالےٰ کے برحق نظام

کو کائنات کے گوشے گوشے تک پہنچا دیں اور دنیا اپنی آنکھوں سے اسلامی انقلاب بپا ہوتا دیکھے اس کی خوبیاں ملاحظہ کرے اور اس کی برکات سے متمتع ہو۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ دنیا میں بالآخر اسلامی نظام آ کر رہے گا۔ بدی کی قوتیں مٹ کر رہیں گی اور نیکی کی قوتوں کو فتح نصیب ہوگی۔

مسٹر ڈگلس نے بتایا کہ وہ آج کل اسٹڈی کے لئے لاہور آئے ہوئے ہیں اور یہاں کے لوگوں کے روحانی قدروں سے گہرے شغف سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ مگر انہوں نے شکایتاً کہا۔

سوال۔

جناب والا! میرا یہ تاثر ہے کہ یہاں کے اکثر لوگ مذہبی اور جدید تعلیم سے یکسر بے بہرہ ہیں اس لئے آپ کی جماعت جو کام کر رہی ہے اس کے راستے میں اس وقت تک مشکلات حائل رہیں گی جب تک آپ تعلیمی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیتے؟"

جواب۔

پاکستان میں کسی غیر سرکاری ادارے یا جماعت کے لئے نظام تعلیم کی اصلاح کرنا اتنا آسان نہیں یہاں کی سرکاری تعلیم تقریباً لادینیت پر مبنی ہے مذہبی تعلیم جو کچھ محدود پیمانے پر دی جا رہی ہے وہ یا تو اس زمانے سے ہم آہنگ نہیں اور جو ہے بھی وہ اس لئے مؤثر ثابت نہیں ہوتی کہ اس تعلیم کا چلن نہیں۔ مذہبی تعلیم پانے والوں کو یہاں کوئی سرکاری ملازمت نہیں ملتی جب کہ سکولر تعلیم حاصل کرنے والے اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہیں ہمارے یہاں ابھی تک تعلیم کا وہی نظام رائج ہے جو ہمارے فرنگی آقا ہمیں عطا فرما گئے ہیں۔ ہمارے ارباب اختیار نے اس میں رتی برابر تبدیلی کی زحمت گوارا نہیں کی۔

مسٹر ڈگلس کا اگلا سوال تھا۔

سوال۔

اس وقت دنیا میں جو تحریک بھی چل رہی ہے قومیت کی بنیاد پر چل رہی ہے مگر آپ قومیت کو رد کر رہے ہیں میرا مطالعہ کہتا ہے کہ قومیت کسی ملک کو مربوط کرنے کے لئے دیوار کا کام دیتی ہے آپ کا اس بارے میں کیا ارشاد ہے۔؟

جواب۔

"ہماری کتاب ہدایت نے کسی مخصوص گروہ یا کسی مخصوص قوم کو خطاب نہیں کیا قرآن عرب یا عجم کی تفریق نہیں برتتا۔ قرآن نے جہاں مخاطب کیا ہے تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کیا ہے اس لئے ہماری تحریک بھی تمام بنی نوع انسان کی کسی اور قومیت پر یقین رکھتی ہے ہم تمام انسانوں کو ایک قوم سمجھتے ہیں بلا تفریق نسل و نسب اور بلا امتیاز رنگ و قامت شرط صرف یہ ہے کہ وہ سب ایک خدا کے حضور جھکتے ہوں ایک رسول کی اطاعت کرتے ہوں اور ایک کتاب کو اپنا سامان ہدایت خیال کرتے ہوں۔ اگر کوئی آدمی کلمہ توحید پڑھ لیتا ہے چاہے دنیا کے کسی دور دراز گوشے میں بستا ہوں اس کا رنگ کالا ہو یا گورا وہ ہمارا بھائی ہے اور ہماری قوم (MUSLIM) کا ایک فرد ہے اس عقیدے کی بنا پر جو میں نے بیان کیا ہے قومیت کے اس تصور کو جو آج دنیا میں رائج ہے ہم اسے مسترد کرتے ہیں۔"

سوال۔

کیا تمام دنیا "ایک قومیت" کے تصور پر ایمان لا سکتی ہے"؟

جواب۔

یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب دنیا اسلام کی صداقتوں کو قبول کرے۔ ایک خدا، ایک کتاب اور ایک لیڈر (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو تسلیم کر لے اس طرح خود بخود وہ عالمگیر قومیت (UNIVERSAL NATIONALITY) وجود میں آجائے گی تمام

دنیا کے لوگ اخوت کی ایک رسّی میں منسلک ہو جائیں گے یہ سارے ذاتی جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے اور امن و آشتی کا اجالا چاروانگ عالم کو منوّر کر دے گا۔

اس موقع پر ایک مقامی "صاحب" نے انگریزی زبان میں سوال کیا۔

سوال۔

مولانا! اسلام کے پاس بے شک ایک "تھیوری" تو ہے مگر اس پر عمل درآمد (PRACTICE) بھی ہو سکتا ہے!

جواب۔

جناب آپ مطالعہ فرمائیے آپ کی نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہے گی کہ اسلام کے پاس جو (THEORY) (نظریۂ حیات) ہے اس سے زیادہ قابلِ عمل نظریہ آج تک دنیا نے نہیں دیکھا جو نظریہ (THEORY) قابلِ عمل PRACTICEABLE نہ ہو وہ تو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دینے کے قابل ہوتا ہے کروڑوں انسان اسے تیرہ سو سال تک سینوں سے لگائے نہیں رکھتے اگر اسلام کو کوئی قابلِ عمل نہیں سمجھتا تو یہ اس کی آنکھوں کا قصور ہے جو بصیرت کے نور سے خالی ہیں اس سے اس نظریئے کی ابدی صداقتوں پر کوئی حرف نہیں آتا۔

"قرآن و سنت کا مطالعہ ڈوب کر کیجئے اس طرح کہ آپ کو اسلام کی روح دکھائی دینے لگے قرآن کی آیات میں غور کیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ کا مطالعہ فرمائیے اور اسلام کے اولین معاشرے میں صحابہ کرام کی پاکباز زندگیوں کا مطالعہ کیجئے آپ خود بخود اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اسلام کے پاس اس کا اپنا ضابطہ اخلاق ہے جو بے نظیر ہے۔ ایک بے مثال سیاسی نظام ہے اور ایک لاجواب معاشی نظام ہے اس کے دامن میں ہر زمانے کے ہر مسئلے کا بہترین حل موجود ہے اسلام نے جو کچھ پیش کیا۔ حضور علیہ السلام نے سب سے پہلے خود اس پر عمل فرمایا پھر آپ نے ایک بہترین اور مثالی

معاشرہ ان ہی نظریات پر تعمیر فرما کر اس بات کا عملی ثبوت مہیا فرما دیا کہ اسلام محض نظریاتی نہیں بلکہ انتہائی درجے کا عملی دین ہے۔

اسلام کی عالمگیر اور ابدی صداقتوں کی مثال دیتے ہوئے مولانا نے وضاحت کی۔

" جب با جماعت نماز ادا کی جا رہی ہو تو دیکھئے اخوت، اتحاد اور یگانگت کا کیسا شاندار مظاہرہ ہوتا ہے۔ خدا آپ کو حج پر جانے کی توفیق بخشے تو وہاں دیکھئے جہاں مسلمانوں کی "کل عالمی برادری" کا سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے کتنے مختلف ملکوں کے انسان وہاں یکجا ہوتے ہیں۔ کتنے مختلف رنگ ہیں کتنی مختلف زبانیں ہیں مگر نہ زبان و نسل کا کوئی تنازعہ ہے نہ قامت و رنگ کا کوئی امتیاز۔۔۔ سب ایک ہی جذبۂ توحید سے سرشار ہیں، شاہ و گدا ایک ہی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہیں۔۔ کیا نسلی امتیاز کے خلاف اس سے بہتر ضابطہ دنیا کا کوئی اور نظام پیش کر سکتا ہے"

سوال۔

مجلس کے اختتام پر مسٹر ڈگلس صاحب نے مولانا سے کہا مجھے کوئی نصیحت فرمائیے!

جواب۔

میری نصیحت آپ کو یہ ہے کہ آپ اسلام اور "بہائی ازم" کے درمیان فرق کو سمجھنے کے لئے اسلام کا اچھی طرح مطالعہ کریں بہائیز نے اسلام کے ساتھ ماڈرن ازم کا پیوند لگانے کی کوشش میں اسلام کا حلیہ تبدیل کر دیا ہے اسلام بے لگامی کی اجازت نہیں دیتا اسلام قبول کرنے کے بعد ہمارا کام یہ ہے کہ بے چون و چرا اپنے آپ کو خدا کے احکام کا پابند کریں نہ کہ خدا کے احکام کو اپنے پیچھے چلائیں خدا کے قائم کردہ اصولوں کو بدلنے کا اختیار خدا کے نبی کو بھی نہیں ہے پھر ہماری اور آپ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ خدا کے بنائے ہوئے مکمل دین میں کمی یا اضافہ کریں۔ (ایشیاء ۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء)

اسلام یا سوشلزم

سوال :۔ "اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اسلام اور سوشلزم دو الگ نظام ہیں لیکن یہ سوچنا صحیح ہے کہ ان کی بنیادی روح ایک ہی ہے ہمارے ایک فلسفی دوست کچھ انہی خطوط پر سوچتے ہیں اس میں کہاں تک وزن ہے ؟"

جواب :۔ نہیں، یہ سوچنا درست نہیں کہ اسلام اور سوشلزم کی بنیادی روح ایک ہی ہے، بلکہ درحقیقت وہ ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہے۔ سوشلزم کا تصورِ انسان عیسائیت کے عقیدے کے مطابق یہ ہے کہ انسان پیدائشی گنہگار ہے اور وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اسی بنا پر سوشلزم فرد کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اسے کسی چیز پر مالکانہ تصرف کا حق دیا جائے وہ انفرادی ملکیت کے مقابلے میں اجتماعی ملکیت کا قائل ہے لیکن اسلام کا تصورِ انسان عیسائیت اور سوشلزم کے تصورِ انسان سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان پیدائشی گناہ گار اور فطری طور پر ناقابلِ اعتماد اور غیر ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ذمہ دار اور باشعور ہستی ہے جس کے اندر اچھے اور برے دونوں رجحانات رکھے گئے ہیں۔ اسلام اس کائنات میں انسان کا یہ مقام متعین کرتا ہے کہ اسے ایک حکیم و دانا خالق نے پیدا کیا ہے اور وہ اس کے سامنے اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ہے یہ دنیا دار العمل ہے اور اس دنیا کی زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہوگی جس میں اسے اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملے گی اسلام اپنی تعلیمات کے ذریعے سے اس کے برے رجحانات کو دباتا اور اچھے رجحانات کو ابھارتا ہے اور

اپنے نظامِ عبادات کے ساتھ اس طرز پر اس کی تربیت کرتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار اور پابند حدود زندگی بسر کر سکے۔ پھر جس طرح انسان کو اپنے ارادے اور عمل کی آزادی کا مالک بنایا گیا ہے اسی طرح سے اسلام مختلف اشیاء پر اس کی ملکیت کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اس میں تصرف کے حق کو کچھ حدود و قوانین کا پابند بنا دیتا ہے۔ تاکہ فرد اور معاشرے کے باہمی حقوق و فرائض کے درمیان ایک توازن اور انضباط کی کیفیت پیدا ہو جاتے۔ اگر ایک طرف اسلامی معاشرے میں ایک فرد پر کسبِ رزق کے معاملے میں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی پابندیاں رکھی گئی ہیں تو دوسری طرف اس کے لئے کمائی ہوئی دولت کو جمع رکھنے پر کچھ قانونی پابندیاں اور خرچ کرنے کے سلسلے میں اخلاقی ہدایات تجویز کی گئی ہیں مثلاً ایک شخص اگر صاحبِ نصاب ہو جائے تو اسے قانوناً زکوٰۃ دینے پر مجبور کیا جائے گا لیکن زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد بھی اگر کوئی ضرورت مند اور محتاج شخص اس کے سامنے آتا ہے تو اس کی مدد کرنا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے اور وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ چونکہ میں زکوٰۃ ادا کر چکا ہوں اس لئے اب ایک پائی خدا کی راہ میں خرچ نہیں کروں گا اس طرح اس اخلاقی تربیت کے ذریعے اسلامی معاشرہ کے اندر ایک ایسا ماحول اور فلاحی نظام قائم ہو جاتا ہے جس میں ایک انسان قانونی فرائض سے آگے بڑھ کر دوسرے انسان کا خیر خواہ اور مددگار بن جاتا ہے یہی چیز اس کے روحانی اور اخلاقی ارتقاء کا باعث بھی بنتی ہے ظاہر بات ہے کہ اس چیز کا کوئی تصور کسی ایسے نظامِ زندگی میں ممکن نہیں جو فرد کے بارے میں بے اعتمادی اور بدگمانی سے اپنے کام کا آغاز کرے اور نتیجتاً اس کے لئے ایک ایسی جبریت پیدا کر دے جس میں انسان کے لئے اپنی آزاد مرضی سے نیکی اور بدی میں سے کسی کو اختیار کرنے کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے اس تفصیل سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلام اور سوشلزم کی بنیادی روح میں کسی درجہ میں بھی یکسانی اور ہم آہنگی تلاش کرنا سوائے پریشانیِ فکر کے اور کیا ہے۔

آئین۔ ۱۶ اپریل ۶۹ء

سوال : سوشلزم اسلام سے کن کن باتوں میں مختلف ہے ؟

جواب :۔ اس کا تفصیلی جواب تو آپ کو اس لٹریچر میں ملے گا جو عنقریب ہم لا رہے ہیں مختصر یہ ہے کہ یہ پوچھنا ہی غلط ہے کہ سوشلزم اسلام سے کن کن باتوں میں مختلف ہے اصل بات یہ ہے کہ سوشلزم اسلام سے تمام باتوں میں مختلف ہے یہ درحقیقت دو مختلف نظام ہائے فکر و نظر ہیں۔ دونوں کا مقصدِ زندگی الگ ہے دونوں تجارت، سیاست، معیشت، عدالت غرض ہر شعبۂ زندگی میں مختلف زاویہ ہائے نگاہ رکھتے ہیں اور ان کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ بکرے اور سور میں کیا ہے دونوں یکساں چار ٹانگیں رکھتے ہیں دونوں کا گوشت قابلِ استعمال ہے لیکن بکرا حلال ہے اور سور حرام۔

(ایشیاء ۲۱۔ مارچ ۶۹ء)

سوال :۔ "سوشلزم معاشی مساوات کا مدعی ہے اور اسلام بھی معاشی مساوات کی تعلیم دیتا ہے کیا اس لحاظ سے دونوں میں مماثلت موجود نہیں ؟"

جواب :۔ سوشلزم جس مساوات کو قائم کرنے کا مدعی تھا اس میں وہ عملاً ناکام ہو چکا ہے۔ سوشلزم کی "مساوات" کا تصور خلافِ فطرت بھی ہے اور خلافِ انصاف بھی، سوال یہ ہے کہ آخر اس ساری کائنات میں اس طرح کی میکانکی مساوات ہے کہاں ؟ —— انسانوں کے درمیان دو بنیادی اور فطری اختلاف پائے جاتے ہیں۔ ایک اختلاف تو فرد کی ذاتی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا ہے اور دوسرا اختلاف حالاتِ پیدائش کا ہے —— تمام انسان جسمانی قوتوں اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے جس طرح یہ بات خلافِ فطرت ہے کہ ایک عام جسمانی مزدور اور ایک ڈاکٹر یا سائنس دان کو ان کی قابلیت اور صلاحیت کے برعکس کام پر مجبور کیا جائے اسی طرح یہ بات بھی خلافِ انصاف کہ معاشی طور پر ان کی خدمات کو ایک ہی سطح کے معاوضے کا مستحق قرار دیا جائے۔

حالاتِ پیدائش کے اختلاف کا مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوتا ہے جو معاشی طور پر خوشحال ہے ظاہر بات ہے کہ وہ اپنی معاشی زندگی کا آغاز اس شخص کی بہ نسبت بہت زیادہ سازگار حالات میں کرے گا جو ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا اور معاشی زندگی کے لئے اسے اپنے والدین سے کچھ زیادہ مدد نہیں ملی۔ حالاتِ پیدائش کا اختلاف مختلف ملکوں کے حالات پر بھی منحصر ہے کسی ترقی یافتہ ملک میں ایک متوسط شخص جس مقام سے اپنی معاشی زندگی کا آغاز کرتا ہے ایک پسماندہ ملک کا متوسط شخص اس سے کہیں زیادہ ناساعد حالات میں اپنا معاشی سفر شروع کرتا ہے ان دو بنیادی اور فطری اختلافات کو کسی معاشرے کے اندر کسی مصنوعی طریقے سے ختم کرنا خلاف فطرت بھی ہے اور خلاف انصاف بھی۔ اسلام ان فطری اختلافات کو تسلیم کرتا ہے "

(آئین ، فروری ۱۹۶۹ء)

سوال: "اسلام میں سرمایہ داری اور سوشلزم کی کس حد تک گنجائش ہو سکتی ہے؟"

جواب: اگر سرمایہ داری سے آپ کی مراد سرمائے والا ہونا ہے تو ظاہر ہے کہ اس طرح ہر وہ شخص جو گھر میں تھوڑی بہت پونجی بھی رکھتا ہے۔ سرمایہ دار ہے اور اسلام اس کی ملکیت کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کا تحفظ کرتا ہے ـــــ لیکن اگر سرمایہ داری سے آپ کی مراد سرمایہ داری نظام ہے تو اسلام کی ہر قدم پر اس کے ساتھ جنگ ہے اور ان معنوں میں اسلام میں سرمایہ داری کا کوئی وجود نہیں ـــــ اسی طرح سوشلزم کا معاملہ ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ سوشلزم میں اجتماعیت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسلام سے بڑھ کر اجتماعیت کس نظام میں ہے لیکن اس کے باوجود سوشلزم اور اسلام کا ایک دوسرے سے کوئی جوڑ نہیں، اور دونوں نظام اپنی اصل اور بنیاد کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ باہم متضاد اور متصادم ہیں سوشلزم کی اجتماعیت کو اسلام کی اجتماعیت پر قیاس کرنا ہی غلط ہے۔ اس

لئے اس بات کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کہ اسلام میں سوشلزم کا وجود ثابت کیا جائے۔"

(آئین، ۲۱، مارچ ۶۹ء)

سوال: کیا سوشلزم کا اقتصادی نظام اسلامی قانون کے ساتھ چل سکتا ہے؟

جواب: یہ بات اس سے پہلے میں بارہا بتا چکا ہوں کہ جو اسلام کا قائل ہے اسے سیدھی طرح یہ کہنا چاہیئے کہ ہم اسلام کے ذریعے سے اپنے مسائل حل کریں گے جو اسلام کا نہیں سوشلزم کا قائل ہے وہ کھل کر سامنے آئے اور کہے کہ میں اس ملک میں سوشلزم چاہتا ہوں یہاں جو اسلام اور سوشلزم کا جوڑ لگانا چاہتا ہے وہ یا اسلام کو نہیں جانتا یا سوشلزم کو نہیں جانتا یا پھر دونوں کو نہیں جانتا۔

سوال:۔ اسلام کے زاویہ نگاہ سے نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم میں کیا فرق ہے؟

جواب: سرمایہ داری کوئی نظام نہیں بلکہ ایک بگاڑ کا نام ہے جس نے بڑھتے بڑھتے موجودہ شکل اختیار کر لی ہے۔ سرمایہ داری کے پاس کوئی ایسے نظریات نہیں ہیں جن کی وہ تبلیغ کر سکے۔ اس کے برعکس سوشلزم ایک ایسا نظام ہے جو انسانی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کا دعوٰے بھی کرتا ہے اور دوسروں کو اپنے نظریات کی تبلیغ بھی کرتا ہے ان دونوں کی مثال ہمارے نزدیک تبلیغی اور غیر تبلیغی مذاہب کی سی ہے ——— غیر تبلیغی مذاہب سے ہمیں خود کوئی تعرض کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ وہ ہمارے پاس تبلیغ کرنے نہیں آتے، لیکن اس کے برعکس ہمارے لئے تبلیغی مذاہب سے تعرض کرنا ضروری ہو جاتا ہے کیوں کہ اگر ہم ان کا مقابلہ نہ کریں تو وہ خود ہمیں مغلوب کرنے کی کوشش کریں گے۔

(آئین، ۲۸، فروری ۶۹ء)

سوال :- "حیرت ہوتی ہے کہ سوشلزم کے علمبرداروں نے یہاں اسلام کے مقابلے میں سوشلزم کا نعرہ کیسے بلند کر دیا۔ کیا اس ملک میں واقعی سوشلزم کی کوئی جڑیں ہیں؟"

جواب :- کلمۂ خبیثہ کی جڑیں نہیں ہوا کرتی ——— محض نعروں کے بل پر یہ لوگ یہاں اسلام کے خلاف لڑائی لڑنے چلے تھے ——— اپنی طاقت کا اندازہ انہیں اب تک ہو گیا ہو گا اور اگر کوئی غلط فہمی باقی ہے تو وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ ——— یہ وہ ملک نہیں ہے جہاں سوشلسٹوں کے ہتھکنڈے کامیاب ہو سکیں۔ آخر یہاں کے مسلمان عوام سوشلزم کی جیتی مکھی کیسے نگل جائیں گے۔"

آئین ۸ مئی ۶۹ء

سوال :- "میری زندگی میں یہ پہلا موقع ہے اور پاکستان کی اکیس سالہ تاریخ میں بھی یہ چیز پہلی مرتبہ ہوئی ہے کہ کسی گروہ کو 'اسلام مردہ باد' کا نعرہ لگانے کی جرأت ہوئی ہے۔"

جواب :- "جو بات ان لوگوں کے دلوں میں تھی اب وہ ان کی زبانوں پر آگئی ہے اس طرح یہ بات متعین ہو گئی ہے کہ 'سوشلزم زندہ باد' سے ان کا اصل مطلب کیا ہے۔"

"اچھا ہوا کہ ان لوگوں نے جلد اپنا نقاب اتار پھینکا ہے اب پاکستان کے گیارہ کروڑ عوام جو فیصلہ کریں گے کہ یہاں اسلام زندہ باد ہونا ہے یا سوشلزم کو

(آئین '۱۶ جنوری ۶۹ء)

اسلامی سوشلزم اور اسلامی جمہوریت

سوال :۔ "جب اسلامی جمہوریت کی اصطلاح بولی جاتی ہے تو اسے درست قرار دیا جاتا ہے کیا اسلامی سوشلزم کی اصطلاح بھی اسی طرح درست نہیں ہو سکتی؟"

جواب :۔ جمہوریت سے مراد وہ سیاسی نظام ہے جس میں حکومت عوام کی مرضی سے بنے، عوام کی مرضی سے قائم رہے اور عوام کی مرضی سے تبدیل کی جاسکے اب جمہوریت کا ایک مغربی تصور ہے اور دوسرا اسلامی تصور ہے۔ مغربی تصور یہ ہے کہ اس میں اقتدار اعلیٰ کے مالک عوام ہوتے ہیں ہر قسم کی قانون سازی میں آخری فیصلہ کن حیثیت عوام کی مرضی کو حاصل ہوتی ہے عوام کی اکثریت حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر سکتی ہے اس کے برعکس اسلامی جمہوریت سے مراد یہ ہے کہ حکومت تو اس میں بھی عوام کی مرضی سے بنتی ہے۔ عوام ہی کی مرضی سے قائم رہتی ہے اور انہی کی مرضی سے تبدیل ہو سکتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جمہوریت کے اسلامی تصور کے مطابق اقتدار اعلیٰ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور مسلمانوں کو قانون سازی کا اختیار صرف شریعت اسلامی کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہے۔ ان حدود سے باہر جاکر وہ کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ وہ سارے کے سارے مل کر بھی خدا کے کسی حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کر سکتے ان معنوں میں مغرب کی مطلق العنان اور بے قید جمہوریت کے مقابلے میں یہ ایک حدود آشنا جمہوریت ہے اور اسی مناسبت

ہے اس کے لئے اسلامی جمہوریت کی اصطلاح استعمال کرنا درست ہے ۔۔۔۔ گویا اگر اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کے مغربی تصور کو اقتدار اعلیٰ کے اسلامی تصور سے بدل دیا جائے تو تمام مفاسد کی جڑ کٹ جاتی ہے ۔۔۔ اس کے برعکس اسلامی سوشلزم کی اصطلاح اس لئے غلط ہے کہ سوشلزم محض کسی سیاسی نظام کا نام نہیں ہے بلکہ سوشلزم ایک IDEOLOGY (نظریہ زندگی) ہے اور اپنے ہمہ گیر سیاسی اور اجتماعی پروگرام کی وجہ سے ایک ایسے نظام کی حیثیت رکھتا ہے جس کا کوئی جز اس کے کل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک علیحدہ مذہب ہے اس کا تصور انسان اور تصور کائنات، اسلام کے تصور انسان و کائنات سے یکسر مختلف اور متصادم ہے اس کی تعبیر تاریخ سراسر مادی ہے اور اس میں روحانیت اور مذہب کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے ۔۔۔۔ اس لحاظ سے اس کے ساتھ لفظ اسلامی کا اضافہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اسلامی عیسائیت یا اسلامی یہودیت ازم وغیرہ کہہ کر انہیں مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش کرے۔"

(آئین، ۷۔ فروری ۶۹ء)

سوال:۔ جمہوریت کے ساتھ اسلام کا پیوند لگایا جا سکتا ہے تو سوشلزم کے ساتھ آخر اسلام کا پیوند کیوں نہیں لگایا جا سکتا۔

جواب:۔ جو حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ تو جمہوریت سے واقف ہیں اور نہ ہی سوشلزم سے جمہوریت کسی طرز حیات اور طریقۂ زندگی کا نام نہیں بلکہ صرف ایک سیاسی نظام ہے اس کے برعکس سوشلزم ایک مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے وہ صرف عوامی زندگی کے سیاسی شعبہ ہی میں رہنمائی کا دعویدار نہیں بلکہ معیشت، معاشرت اور اسی قسم کے دوسرے شعبہ ہائے زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی بنیاد سراسر مادیت پر ہے اس لئے آخر سوشلزم اور جمہوریت کو ایک پلڑے میں کیسے رکھا جا سکتا ہے۔

(ایشیاء ۲ فروری ۶۹ء)

سوال :۔ جب جمہوریت کے ساتھ اسلامی کا لفظ لگایا جا سکتا ہے تو سوشلزم کے ساتھ ایسا کیوں ناممکن ہے۔"

جواب :۔ آپ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جمہوریت کسی نظام کا نام نہیں ہے بلکہ محض ایک سیاسی فکر ہے جسے بجا طور پر اسلام کے حق میں استعمال کیا جاتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جمہوریت کے بنیادی تصورات اسلام ہی نے بنی نوع انسان کو عطا کئے ہیں ——— اس کے برعکس سوشلزم کسی سیاسی فکر کا نام نہیں بلکہ ایک مستقل نظامِ حیات اور نظریۂ زندگی کا نام ہے۔ جس کی بنیاد خدا کے انکار اور مادیت پر رکھی گئی ہے۔ یہ صرف معاشی مسائل کو حل کرنے کا ہی دعویٰ نہیں کرتا بلکہ تمام سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی مسائل میں بھی رہنمائی کا مدعی ہے ——— جس ملک میں سوشلزم آئے گا وہاں دوسرا نظام نہیں پنپ سکتا۔ بلکہ بزور اس دوسرے نظام کو مٹا دیا جائے گا۔ اور اس کی جگہ سوشلزم لے لے گا۔ اس کی عبرتناک مثالیں ہم سوشلسٹ ملکوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

(ایشیا، ۲۲ فروری ۶۹ء)

سوال۔ اسلامی سوشلزم کی کیا حقیقت ہے؟

جواب۔ اسلامی سوشلزم کی وہی حقیقت ہے جو عیسائی سوشلزم کی ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام کو مکمل سمجھتا ہے تو پھر اس کے ساتھ کسی ازم کے لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اسلام ناقص ہے تو پھر اعلان کر دیا جائے کہ اسلام ہماری ضروریات پوری کرنے پر قادر نہیں ہے لیکن یہ منافقانہ انداز ہرگز قابلِ تحسین نہیں ہے کہ آدمی اسلام کا نام بھی لے اور اس کیساتھ دوسرے ازموں کے دم چھلے بھی لگائے۔ میں ایک مخلص کافر کی قدر کرتا ہوں لیکن منافق کی قدر نہیں کر سکتا آخر یہ منافقت نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ کبھی یہ کہا جائے کہ ہم اسلام چاہتے ہیں۔ پھر اسی سانس میں سوشلسٹ معاشرے کے قیام کا مطالبہ کر دیا جائے یعنی جیسا موقع پاؤ ویسی بات کرو۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ دھوکہ دینے

کی کوشش کی جا رہی ہے۔

(ایشیا، ۲ مارچ ۶۹ء)

سوال:- بعض حضرات ماؤ کو لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل ظاہر کر رہے ہیں اور ماؤزے تنگ کو مسلمان قرار دے رہے ہیں۔ اس کا تدارک کیسے ممکن ہے؟

جواب۔ ایک وقت تھا کہ قیصر ولیم کو مسلمان ثابت کیا جاتا تھا اور نپولین کے مسلمان ہونے کا بھی اعلان کر دیا گیا تھا یعنی ہماری قوم جس شخص کے بارے میں دیکھتی ہے کہ اس کے نام کا چرچا ہو رہا ہے وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر اسے مسلمان بنا ڈالتی ہے اور اس طرح احساسِ کمتری کو مٹانا چاہتی ہے حالانکہ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ نہ قیصر ہی مسلمان تھا اور نہ ماؤ کا لفظ محمدؐ کی بگڑی ہوئی شکل ہے"

(ایشیا، ۲۶ جنوری ۶۹ء)

سوال۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اشتراکیت کو اس اشتراک پر قیاس کیا جائے جو ایک گھر کے اندر پایا جاتا ہے کہ ایک آدمی کماتا ہے اور کنبے کے باقی سارے افراد مل کر کھاتے ہیں تو یہ چیز خلاف اسلام نہیں یعنی یہ لوگ اشتراکیت کو اس کے لغوی معنی میں استعمال کرتے ہیں؟

جواب۔ اپنا ایک مستقل فلسفہ اور پروگرام رکھنے والی ایک مخصوص سیاسی اصطلاح کو اس کے لغوی معنوں میں استعمال کرنا ایک لغویت کے سوا کیا ہے؟

سوال۔ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کرنے والے بعض حضرات سوشلزم کے جواز میں یہ موقف پیش کرتے ہیں کہ اسلام پر سوشلزم کے لفظ کا اضافہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں تمام ذرائع پیداوار پر حکومت کا کنٹرول ہوتا ہے حقیقی مساوات اس ذریعے سے قائم ہو سکتی ہے اور اسلام بھی مساوات کا قائل ہے یہ کہنا کہاں تک درست ہے؟

جواب۔ دراصل یہ لوگ خالص سوشلسٹ نظام چاہتے ہیں۔ لیکن مجبوراً اسلام کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ کوئی شخص اگر یہاں شرک بھی پھیلانا چاہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ یہ اسلامی شرک ہے جو شخص شراب پیتا ہے اس کی بھی کوشش یہی ہے۔ کہ وہ پہلے اسے اسلامی شراب باور کرائے پھر پئے۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے اس کے ساتھ کسی دوسرے ازم کی پیوند کاری کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں انہیں منافقت ترک کرکے صاف صاف کہنا چاہیئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی قبول نہیں کرتے۔ مارکس اور لینن کی رہنمائی چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مغربی سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کفر ہیں اور اسلام دونوں کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ جب ہم کمیونزم کی مخالفت کرتے ہیں تو ہمیں سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب ہم سرمایہ داری کی مخالفت کرتے ہیں تو یہی لوگ کان بند کر لیتے ہیں۔

جو لوگ اسلامی سوشلزم کا نام لیتے ہیں سوال یہ ہے کہ انہیں صرف اسلام کہتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے بہر حال نام سوشلزم کا ہو یا اسلامی سوشلزم کا، اسلام کے خلاف اس قسم کی جو تحریک بھی چلائی جائے گی جماعت اسلامی اس کا مقابلہ کرے گی اور اسے یہاں چلنے نہیں دے گی۔ خوش کن نعروں یا لیبلوں سے کوئی اور دھوکا کھائے تو کھائے لیکن خدا کے فضل سے جماعت اسلامی دھوکہ نہیں کھائے گی۔

(آئین ۳۱ دسمبر ۶۹ء)

سوال۔ اگر سوشلزم اسلامی قسم کا نہیں ہوسکتا۔ تو پارلیمانی جمہوریت کیسے اسلامی ہوسکتی ہے۔ حالانکہ اسلام کے بطور مکمل ضابطۂ حیات نافذ ہونے میں دونوں مانع ہیں؟

جواب۔ اس سوال کے دو حصے ہیں میں اوّل پہلے حصے کا جواب دیتا ہوں۔ سوشلزم ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور جو لوگ اس کے معنی صرف لغوی حیثیت

سے لیتے ہیں۔ وہ اس کی حقیقت کو یا سمجھتے نہیں ہیں۔ یا مغالطہ دینا چاہتے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ سوشلزم لغت کے اعتبار سے اجتماعیت کے معنی رکھتا ہے۔ اور یہ مفہوم ایسا نہیں ہے۔ جو اسلام سے متصادم ہو لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ جب کوئی لفظ بطور اصطلاح استعمال ہونے لگے۔ تو وہ اپنے لئے ایک مخصوص تصور اور مخصوص مفہوم اختیار کر لیتا ہے سوشلزم اپنا ایک الگ فلسفہ اور نظام فکر رکھتا ہے اور اسی زاویے سے وہ تمام علوم اور شعبہ ہائے زندگی کو ڈھالتا اور بناتا ہے۔ یہاں تک کہ اشتراکی سائنس بھی دوسرے نظاموں کی سائنس سے الگ ہے اور سوشلزم نے اسے بھی اپنے خطوط پر ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔

یہ مخصوص نظریہ ہر پہلو سے اسلام سے متصادم ہے اشتراکیت کا عقیدہ ہے۔ کہ اس کائنات کو بنانے اور چلانے والا کوئی نہیں ہے یہ سب مادے کے کرشمے ہیں خدا کو ماننے کا عقیدہ مخصوص مفادات کے تحفظ کے لئے گھڑا گیا ہے اور مذہب کی حیثیت انسانی شعور کے لئے افیون اور سرمایہ داری کی پشت پناہی سے زیادہ کی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوشلزم خدا کے عقیدے کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور (ANTIGOD) مہمیں چلاتا ہے۔ روس کے دستور میں مذہب کے ماننے والوں کو تبلیغ کا حق نہیں دیا گیا ہے اور نہ ان کو اس امر کی اجازت ہے کہ وہ اپنی نسل کو اپنے مذہب پر قائم رکھیں۔ ان کو زیادہ سے زیادہ جو حق دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر خود قائم رہنا چاہتے ہیں تو رہ جائیں لیکن اس کو پھیلانے کا انہیں کوئی حق نہیں ہے دوسری طرف اشتراکیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ مذہب کو مٹا دیں۔

اشتراکی فلسفہ کی نگاہ میں دنیا میں مالدار اور غریب اور استحصال کرنے والوں اور اس کا شکار ہونے والوں میں ایک کشمکش کی کیفیت برپا ہے۔ مارکس غریبوں اور استحصال کا شکار ہونے والوں کو جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے چنانچہ وہ اپنے منشور میں کہتا ہے دنیا کے محنت کشو! ایک ہو جاؤ اس کے نزدیک کشمکش

کا یہ سارا عمل تاریخ کی جدلی مادیت ہے اس بنا پر سوشلزم کا مقصد منتہیٰ ایک ایسے معاشرے کا قیام ہے جس میں کوئی طبقہ باقی نہیں رہ سکے گا۔ اس غرض کے لئے وہ مزدور طبقہ کو متحد کرتا ہے۔ اور انہیں اکساتا ہے کہ وہ املاک رکھنے والوں کو مٹا دیں اس کام کی انجام دہی کے لئے اشتراکیوں پر کسی قسم کی کوئی اخلاقی پابندی نہیں ہے جھوٹ بولنا ان کے لئے جائز ہے۔ اور ہر وہ کام خواہ وہ بدعہدی ہو یا قتل و غارت اگر ان کے مقصد کے حصول کے لئے مفید ہے تو وہ نہ صرف جائز اور مباح ہے بلکہ فرضِ عین ہے۔ لینن نے خود کہا ہے۔ کہ ہر وہ فعل اخلاقی طور پر جائز ہے جو اشترا کی انقلاب کے لئے مفید و ممد ہے۔

ان کے نزدیک اصلاح کی ایک ہی شکل ہے وہ یہ کہ تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ جب یہ عمل مکمل ہو جائے گا۔ تو پھر کسی حکومت کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ آغاز کار کے لئے البتہ مزدوروں کی آمریت قائم کرنے کی ضرورت کو وہ تسلیم کرتے ہیں۔ اب جس حکومت اور آمریت کو مزدوروں کی حکومت اور آمریت کہتے ہیں ذرا اس کی صورت بھی دیکھ لیجئے۔ فرض کیجئے کسی ملک کے اندر دو کروڑ مزدور ہیں تو یہ سب کے سب حکومت نہیں بن جائیں گے بلکہ ان میں سے صرف چند ہوں گے جو حکومت بنائیں گے اور اس کا انتظام چلائیں گے اور یہ چند کیسے منتخب ہوتے ہیں۔ وہ بھی ملاحظہ طلب ہے یہ مزدور پہلے کانگرس بناتے ہیں پھر اس میں سے ایک پریذیڈیم چنی جاتی ہے اس پریذیڈیم کے اندر ایک پولیٹیکل بیورو ہوتی ہے اور اس پولیٹیکل بیورو میں چند آدمی یا ایک ڈکٹیٹر ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں کل اختیارات ہوتے ہیں۔

اس ڈکٹیٹر شپ میں کسی کو پارٹی بنانے کی اجازت نہیں اور اس نگری میں ایک ایکڑ کا مالک بھی اسی طرح جاگیر دار ہے جس طرح ہزار ایکڑ زمین کا مالک کسی کو کارخانہ دار بننے کی اجازت نہیں جو شخص اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے کسی کو اجرت پر اپنے ہاں ملازم رکھ لیتا ہے وہ بھی کارخانہ دار، تمام زمینیں اور تمام

کارخانے حکومت کے ہوتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ مزدوروں کو ہڑتال کرنے کی اجازت نہیں۔ اشتراکی تمام دنیا میں مزدوروں کے ہڑتال کے حق کے لئے لڑتے ہیں لیکن خود انہیں اس کی اجازت نہیں دیتے اور اپنی حکومت میں سب سے پہلے وہ اس حق پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔

ہڑتال کے حق کی اجازت نہ روس میں ہے نہ چین میں اب مزدور بے بس ہے حکومت جو دے اسے لینا پڑے گا اور جہاں لگائے اسے رہنا پڑے گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی مرضی سے ایک کارخانے سے کام چھوڑ کر دوسرے کارخانے میں چلا جائے کیونکہ وہ جس کارخانے کو چھوڑنا چاہے گا وہ بھی حکومت ہی کا ہوگا۔

تمام ذرائع پیداوار، سارا پریس اور پلیٹ فارم حکومت کا ہے یہاں کوئی اپوزیشن پارٹی نہیں بن سکتی۔ اور نہ حکومت کی کسی پالیسی پر تنقید ہو سکتی ہے۔ ریو شاؤ چی اشتراکی چین کا صدر تھا۔ دو سال سے اس پر پھٹکار پڑ رہی ہے لیکن کیا جواب میں اس کا کوئی بیان آپ نے کبھی دیکھا ہے؟

یہ ان کا سیاسی نظام ہے اور وہ ان کا معاشی نظام تھا اب آپ خود بتائیے کہ سوشلزم کا اسلام کے ساتھ کہیں کوئی جوڑ یا اشتراک ہو سکتا ہے ہم سے کہا جاتا ہے کہ سوشلزم معاشی مساوات چاہتا ہے اب معلوم نہیں کہنے والوں نے سوشلزم کو پڑھا بھی ہے یا نہیں؟ اشتراکیت ہرگز معاشی مساوات نہیں چاہتی۔ آغاز میں اشتراکی مفکرین کا نظریہ یہ تھا کہ ہر شخص سے اس کی قابلیت کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اس کو تنخواہ دی جائے لیکن بعد میں انہوں نے یہ نظریہ بدل لیا اور کہا کہ جو شخص اس نوع کی معاشی مساوات چاہتا ہے وہ مقصد سے غداری کرتا ہے اب اصول یہ طے پایا کہ جتنا کسی سے کام لیا جائے اسے اتنا معاوضہ دیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا اصول ہے۔

پھر اشتراکی نظام میں تنخواہوں اور اجرتوں کی مساوات بھی نہیں ہے وہاں لکھو کھا ایسے ہیں جنہیں اڑھائی سو روبل تنخواہ ملتی ہے۔ اور کئی ایسے ہیں جنہیں کئی کئی ہزار

تنخواہ ملتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض کی تنخواہیں تین لاکھ تک پہنچ گئی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ سوشلزم معاشی مساوات چاہتا ہے۔

جو لوگ آج اسلامی سوشلزم کا نعرہ بلند کر رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ وہ یا تو اسلام کو جانتے نہیں، سوشلزم کو سمجھتے نہیں، دونوں سے ناواقف ہیں اور یا پھر دھوکہ دیتے ہیں علمی حیثیت سے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ یہ سب فریب ہے۔ اور اس کے مدعی سوائے دھوکہ دینے کے اور کچھ نہیں کر رہے ہیں۔

اب رہ گیا پارلیمانی جمہوریت کا سوال تو پارلیمانی جمہوریت کا مطلب ہے کہ ایک مجلس شوریٰ ہو جسے جدید اصطلاح میں پارلیمنٹ کہتے ہیں۔ یہ مجلس شوریٰ عوام کی معتمد علیہ ہونی چاہیئے۔ ابتدائے اسلام میں عوام کا اعتماد معلوم کرنے کے ذرائع اور تھے اور عہد جدید میں اور۔ اصل چیز یہ ہے کہ مجلسِ شوریٰ معتمد لوگوں پر مشتمل ہونی چاہیئے جن کی دیانت و امانت اور اخلاق وقابلیت کے تمام لوگ قائل ہوں بنیاد انتخاب اعتماد ہے۔ اس زمانے میں اعتماد معلوم کرنے کا ذریعہ تھا۔ کہ لوگ بیعت کریں اور اس زمانے میں ذریعہ یہ ہے کہ لوگوں کی رائے لی جائے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا انتخاب جس وقت میں ہوا تھا اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی اطلاع پورے ملک میں بھجوائی جاتی تو اس میں کم از کم تین مہینے اطلاع بھجوانے اور تین مہینے لوگوں کے آنے میں لگ جاتے درآنحالیکہ ضرورت تھی کہ مملکت اسلام کا منصب خلافت ایک لمحہ کے لئے بھی خالی نہ ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اس زمانے میں انتخاب اس طرح نہیں ہو سکتے تھے جس طرح ریل اور ہوائی جہاز کے موجودہ ترقی یافتہ زمانے میں ممکن ہیں۔ اس زمانے کے لوگوں نے جس شخص کا انتخاب کیا تھا اگر آج کے زمانے میں جدید طریق کار کے مطابق انتخاب کرایا جاتا تو وہی شخص منتخب ہوتا۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد ہیں مدینہ طیبہ میں جو مسلم سوسائٹی موجود تھی وہ پوری قوم کا مکھن تھی۔ مہاجرین و انصار کے جن اکابر نے مل کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا تھا اگر خود ان کے بارے

میں بھی انتخاب کرایا جاتا تو رائے عامہ انہیں کے حق میں نکلتی اور لوگ اپنے اعتماد کا اظہار انہی پر کرتے اس لئے ان لوگوں نے مل کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا تھا تو وہ عین پوری قوم کی رائے اور مرضی تھی ۔

گویا اصول یہ ہے کہ مجلس شوریٰ جس کو خلیفہ بنائے وہ بنے کوئی شخص زبردستی نہ ہو جائے جو بھی آئے قوم کی مرضی سے آئے موجودہ پارلیمنٹ اسی کام کو انجام دیتی ہے ۔

ہمارے تصور جمہوریت اور مغربی تصور جمہوریت میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ مغربی جمہوریت مطلق العنان ہے وہ جس کو حرام کرنا چاہے کر سکتی ہے جس کو حلال کرنا چاہے کر سکتی ہے امریکہ میں شراب ممنوع ہوئی جب اس امتناع کی مخالفت نے زور پکڑا تو اسے حلال کر دیا گیا ۔

اس کے برعکس اسلامی پارلیمنٹ کسی حرام کو حلال اور کسی حلال کو حرام کرنے کی نہ مختار ہے نہ مجاز۔ اسلامی پارلیمنٹ کے حدود کار قرآن وسنت کے پابند ہیں وہ نہ ان حدود سے باہر کوئی قانون سازی کر سکتی ہے نہ کوئی انتظامی حکم دے سکتی ہے ۔

یہاں آکر یہ فرق کھلتا ہے اس وجہ سے ہم جمہوریت کے ساتھ بعض اوقات اسلامی کے لفظ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ تاکہ فرق ملحوظ رہے اس لئے اسلامی جمہوریت کی اصطلاح تو چل سکتی ہے لیکن اسلامی سوشلزم کی اصطلاح نہیں چل سکتی اسلامی سوشلزم تو ایسے ہی ہے جیسے اسلامی عیسائیت اور اسلامی بدھ ازم ، اسلامی الحاد اگر یہ اصطلاح صحیح ہو سکتی ہے تو پھر یہ اصطلاحیں بھی صحیح ہو سکتی ہیں ۔

سوشلزم

سوال۔ سوشلزم اور کمیونزم کا فرق واضح فرما دیجئے۔

جواب۔ کمیونزم اس انتہائی منزل کا نام ہے جس کی ابتداء سوشلزم ہے کمیونزم بے حکومت معاشرے (STATELESS SOCIETY) کا نام ہے اور یہ راستہ اس منزل تک سوشلزم ہی کے مرحلے سے گزر کر جاتا ہے۔ کمیونزم کی اس منزل کے حصول کا اتنا ہی امکان ہے جتنا دنیا میں جنت بننے کا امکان۔ سوسائٹی کو چلانے کے لئے حکومت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کمیونزم کا خواب یہ ہے کہ ایک وقت آئے گا جب تمام طبقے فنا ہو جائیں گے۔ اور معاشی مساوات اس مثالی انداز سے قائم ہو جائے گی کہ کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہ رہے گی۔ اور اس طرح کسی حکومت کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ ایسی بے حکومت سوسائٹی کو وجود میں لانے کے لئے کمیونزم ہمہ گیر آمریت اختیار کرتا ہے جس میں ملک کے تمام ذرائع و وسائل ایک ہاتھ میں دے دیئے جاتے ہیں۔ اور یہ آمریت نوعیت میں ایسی سخت اور ہمہ گیر ہوتی ہے کہ کوئی دوسری آمریت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ کون سی آمریت ہے جو خودکشی کے لئے تیار ہو۔ آمریت ہمیشہ اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لئے کام کرتی ہے۔ اپنے آپ کو ختم کرنے کے لئے نہیں۔ پھر وہ ڈکٹیٹرشپ جو ملک کے تمام ذرائع و وسائل کی واحد مالک ہو اپنا اقتدار کب چھوڑ سکتی ہے تو سوشلزم کی راہ سے کمیونزم کبھی

قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ محض خواب ہے۔ ایک ناممکن بات ہے۔

(ایشیا ۱۲ مارچ ۶۹ء)

سوال۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کمیونسٹ نہیں سوشلسٹ ہیں یعنی کمیونزم کے نہیں سوشلزم کے حامی ہیں۔ کیا سوشلزم اور کمیونزم مختلف چیزیں ہیں؟

جواب۔ شاید یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں سبھی جاہل بستے ہیں کہ جو بات وہ کہہ دیں گے لوگ اس پر ایمان لے آئیں گے۔

سوشلزم اور کمیونزم میں مقاصد اور بنیادی تصورات میں کوئی فرق نہیں ہے سوشلسٹ مفکرین مارکس وغیرہ کے نزدیک سوشلزم ایک عبوری مرحلہ ہے اور کمیونزم اس کی تکمیلی شکل ہے یعنی سوشلزم راستہ ہے اور کمیونزم منزل۔ چنانچہ ہمارے نزدیک اس بحث کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کہ کوئی شخص سوشلزم کا قائل یا کمیونزم کا۔ ہر دو صورتوں میں امر واقعہ ایک ہی رہتا ہے۔

خود روس اور چین سمیت اس وقت دنیا میں جتنے اشتراکی ممالک ہیں وہ اپنے آپ کو سوشلسٹ ممالک کہتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کمیونسٹ ملک ہونے کا دعویدار نہیں۔ گویا ابھی وہ گویا سب سوشلزم کی سٹیج پر ہیں۔ کمیونزم منزل ابھی نہیں آئی یہی وجہ ہے کہ جب ہم سوشلزم پر تنقید کرتے ہیں تو ہمارے پیش نظر سوشلسٹ نظریات اور ان کی وہ عملی تعبیر ہوتی ہے جو اشتراکی ممالک میں رونما ہوتی ہے۔

(آئین ۲۱ مارچ ۶۹ء)

سوال۔ کیا سوشلزم کا مفہوم اجتماعیت نہیں؟

جواب۔ سوشلزم ایک اصطلاح ہے جس کا اطلاق ایک خاص نظام پر ہوتا ہے اس نظام کے داعیوں کی کتابیں دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ کسی لغت کی کوئی رسمی اصطلاح نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرز حیات اور نظام فکر کا نام ہے۔ اس کے کچھ عقائد ہیں جن کے مطابق اس کی اپنی اخلاقیات، فلسفہ تاریخ اور قانون ہے۔ یہاں تک کہ اس کی سائنس اور فلسفہ بھی الگ نوعیت کے ہیں۔ سوشلزم کا بنیادی عقیدہ ہے کہ اس کائنات

کا کوئی خدا نہیں ہے۔ خدا کو ماننے کے معنی افیون کھانے کے مترادف ہیں اب جو شخص اس کا جوڑ اسلام سے لگانا چاہتا ہے وہ حرکت ایسے ہی ہے جیسے اسلام کا بدھ مت سے جوڑ لگا دیا جائے۔ یا اسلام کا شرک سے ناطہ باندھ دیا جائے جو شخص ایسا کرتا ہے یا تو وہ اسلام کو نہیں سمجھتا یا سوشلزم سے ناواقف ہے۔ یا دونوں کو نہیں جانتا۔ وہ یا جاہل ہے یا دھوکے باز۔

(ایشیاء ۱۴ مارچ ۶۹ء)

سوال۔ کیا اجتماعی ملکیت کا نظریہ مختلف مسائل کا کامیاب حل نہیں ہے؟

جواب۔ یہ نظریہ کہ ہر چیز اجتماعی ملکیت میں دے دی جائے اپنی اولین تجربہ گاہ میں ناکام ہو چکا ہے۔ روس میں اب یہ حالت ہے کہ ایک شخص اپنا روپیہ بنکوں میں رکھ سکتا ہے اور بنک اس کو ۸ فیصد تک سود دیتے ہیں۔ زمین کا ۴۰ فیصدی حصہ اب کاشتکاروں کی ملکیت میں دیا جا چکا ہے۔ ایک شخص اپنا مکان بھی بنا سکتا ہے قانونِ وراثت بھی اب روس میں رائج ہے غرض ہر وہ چیز جس کو قومی ملکیت کے نام پر ختم کرنے کا دعوٰی لے کر سوشلزم کے علمبردار چلے تھے ایک ایک کر کے اس سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ اس نظام کا باطل اور خلافِ فطرت ہونا خود اس کے پچاس سالہ تجربے سے ثابت ہو گیا ہے اب کیا یہ ناکام نظام مسلمانوں کو اپنے اوپر مسلط کرنا ہے؟

(آئین، ۸ مارچ ۶۹ء)

سوال۔ آج کل ہمارے ہاں بعض لوگ سوشلزم کے حق میں یہ دلیل دیتے ہیں۔ اگر انفرادی ملکیت ختم کر کے ہر چیز قومی ملکیت میں دے دی جائے تو اس سے بدعنوانیوں (CORRUPTION) کا خاتمہ ہو جائے گا؟۔

جواب۔ سوال یہ ہے کہ جب آپ ملک کی ہر چیز صنعت زراعت اور دوسرے تمام پیداواری وسائل ریاست کی ملکیت میں دے دیں گے تو ان سب کا انتظام کون چلائے گا؟ — آپ کی یہی بیوروکریسی تو اس کا انتظام کرے گی جس کے ظلم اور بدعنوانیوں

کو آپ ایک آمرانہ نظام کے تحت یہاں دس سال تک بھگتتے رہے ہیں اور اس کے مظالم سے تنگ آ کر آپ اس نظام کے خلاف اب تک لڑائی لڑ رہے ہیں ـــــ اب دیکھئے کہ یہ ساری بدعنوانیاں اور مظالم یہاں کی بیوروکریسی بہرحال ایک محدود اقتدار کے ساتھ کرتی رہی ہے لیکن اگر آپ ریاست کے جملہ وسائل اور غیر محدود اختیارات اسی بیوروکریسی کو دے دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اپنے اوپر ایک ایسی آمریت کو مسلط کریں گے جس سے پھر کبھی چھٹکارا نہیں پا سکیں گے ـــــ آپ کے یہاں اگر آمریت کا مقابلہ ممکن ہو سکا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ملک کی ساری معیشت اور تمام وسائل بہرحال ایک شخص کے ہاتھ میں نہیں تھے۔ پریس پر تمام پابندیوں کے باوجود اپوزیشن کی بات کسی نہ کسی طرح سامنے آ جاتی تھی، اظہار رائے کی آزادی نہ ہونے کے باوجود سیاسی جماعتیں کام کرنے کی کوئی نہ کوئی راہ نکالتی رہی ہیں جس سے ان کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ بحالیٔ جمہوریت اور آمریت کے خاتمے کے لئے جدوجہد کریں ـــــ لیکن جس نظام میں انسان سر اٹھا کر نہ چل سکے، زبان تک نہ کھول سکے، ظلم وہاں نہیں ہوگا تو اور کہاں ہوگا۔

کچھ توقف کے بعد فرمایا۔

"آدمی مطلق العنان ہونے کے بعد آدمی رہتا کہاں ہے جو وہ دوسروں کے ساتھ آدمیت سے پیش آ سکے"۔

(آئین ۸ مارچ ۶۹ء)

سوال۔ جب ملکیت زمین کی عارضی تحدید قبول کی جا سکتی ہے۔ تو مستقل تحدید یا بدرجۂ آخر اجتماعی ملکیت کی گنجائش کیوں نہیں نکالی جا سکتی جبکہ شریعتِ اسلامی میں یہ بات مسلّمہ ہے کہ اجتماعی مصالح کی خاطر افراد پر بعض پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں؟

جواب۔ ملکیت زمین کی مستقل تحدید خود شریعت اسلامی ہی سے ٹکراتی ہے سب سے پہلے اس کی زد میں اسلامی قانون وراثت آتا ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے

شرعی قوانین اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے محض اس بنا پر کہ اجتماعی مصالح کی خاطر افراد پر بعض پابندیاں عائد کرنے کی اجازت ہے ملکیت زمین کی مستقل تحدید کی گنجائش نہیں نکالی جاسکتی ـــــ رہی یہ بات کہ یہ مستقل تحدید یا اجتماعی ملکیت زیادہ بہتر معاشی پالیسی کی بنیاد بن سکتی ہے۔ تو عملاً یہ بات کلی طور پر غلط ثابت ہو چکی ہے۔ اشتراکی ممالک میں جہاں زمین کو اجتماعی ملکیت میں لیا گیا اور اس پر اجتماعی کاشت (COLLECTIVE FARMING) کی گئی وہاں پیداوار اس حد تک گر گئی کہ حکومت کو مجبور ہو کر کچھ زمین کاشت کاروں کی ملکیت میں دینا پڑی۔ مثلاً روس میں اس وقت کیفیت یہ ہے کہ کل رقبہ زمین کا ۹۸۰۶ فیصدی حصہ تو اجتماعی کاشت کے تحت ہے اور باقی کا ۱۰۴ فیصدی انفرادی ملکیت میں دیا گیا ہے۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ اس ۱۰۴ فیصدی حصے کی پیداوار کل پیداوار کا تقریباً ۳۳ فیصدی ہے یہ صورت حال خاصی عبرت انگیز ہے معلوم ہوا کہ جب کاشت کار کا ذاتی مفاد ختم کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے حالانکہ سوشلزم کا دعویٰ یہ تھا کہ ذاتی مفاد کا جذبہ ایک غیر فطری جذبہ ہے۔ یہ محض حالات کی پیداوار ہے اور اسے مسلسل تعلیم و تربیت سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن عملاً یہ بات بچپاس سالہ تجربے نے غلط ثابت کر دی ہے۔ اب اس تجربے کا تقاضا ہے کہ غذائی صورت حال کو سنبھالنے کے لئے زیادہ سے زیادہ زمینیں انفرادی ملکیت میں دی جائیں لیکن اشتراکی حکومت کی مجبوری یہ ہے کہ اس طرح اس اشتراکی اصول سے انحراف و دستبرداری کا الزام آتا ہے اور اشتراکیت کی پوری عمارت متزلزل ہو جاتی ہے ـــــ اشتراکیت اپنی اولین تجربہ گاہ میں آج ایک عجیب چیلنج سے دوچار ہے جس کے سامنے وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس پا رہی ہے کم و بیش یہی حال دوسرے اشتراکی ممالک کا ہے ـــــ تو یہ ہے زراعت کی اجتماعی کاشت کی اشتراکی پالیسی جس کی بنیاد زمین کو اجتماعی ملکیت قرار دینے پر رکھی گئی تھی۔ اور جسے عملاً نافذ کرنے کے لئے ساٹھ لاکھ کاشت کاروں کو تباہ و برباد کیا گیا تھا۔ (آئین ۱۰ اپریل ۶۹)

"سوال ۔ روس اور چین میں تنخواہوں اور معاوضوں کے سلسلے میں "قابلیت کے مطابق محنت اور ضرورت کے مطابق معاوضہ" کا اصول رائج ہے کیا یہ اصول انصاف پر مبنی نہیں ہے

جواب ۔ آپ تو بڑی پرانی بات کر رہے ہیں ۔ آپ کے علم میں نہیں کہ خود روس اور چین میں یہ اصول مدت ہوئی (REPUDIATE) (رد) کیا جا چکا ہے اور اب ان ممالک میں معاوضوں میں تفاوت بڑے بڑے سرمایہ دارانہ ممالک میں پائے جانے والے فرق سے ہرگز مختلف نہیں ہے ۔ روس میں تو عام مزدوروں اور اعلیٰ افسروں اور چوٹی کے لوگوں کے معاوضوں میں فرق کا تناسب ایک اور تیس اور ایک اور سو تک جا پہنچا ہے ـــــ اب آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ اشتراکیت نے طبقاتی تقسیم کو ختم کیا ہے یا بیورو کریسی قائم کر کے اسے اور زیادہ سنگین بنا دیا ہے

(آئین ۷ ر فروری ۶۹ء)

سوال ۔ اشتراکی ممالک میں ان کے جابرانہ نظام کے خلاف نہ تو کوئی موثر آواز اٹھائی جا سکتی ہے اور نہ کوئی جوابی تحریک چلائی جا سکتی ہے ۔ اس کی کیا وجہ ہے ؟

جواب ۔ موثر جوابی تحریکیں صرف انہی ممالک میں چلائی جا سکتی ہیں ۔ جہاں کسی نہ کسی حد تک اظہار رائے کی آزادی ہو اور سیاسی سرگرمیوں کو برداشت کیا جاتا ہو ۔ اشتراکی ممالک میں یہ صورت حال نہیں ہے ـــــ آپ یہ دیکھیں کہ کسی تحریک کا آغاز کیسے ہو سکتا ہے اس کا آغاز اس طریقے سے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص دوسرے کو کسی معاملے میں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرے کیا یہ بات ان ممالک میں ممکن ہے جہاں ہر شخص دوسرے شخص سے حکومت کے خلاف بات کرتے ہوئے ڈرتا ہے کہ کہیں یہ سی آئی ڈی کا آدمی نہ ہو یہاں تک کہ شوہر کو بیوی پر، بھائی کو بھائی پر، باپ کو بیٹے پر اور بیٹی کو ماں پر یہ اعتماد نہیں ہے کہ وہ اس کی رپورٹ حکومت سے جا کر نہ کر دے گی ـــــ تاہم فرض کیجئے کہ دو آدمی کسی

طرح ایک دوسرے کے رازدار بن جاتے ہیں۔ لیکن اب وہ کسی تیسرے آدمی سے بات کرتے ہوئے ڈریں گے ــــــ برائے بحث یہ بھی فرض کر لیجئے کہ ہوتے ہوتے چالیس پچاس آدمی ایک نقطہ نظر پر متفق ہو جاتے ہیں لیکن اب یہ اپنی بات کو منظر عام پر کیسے لا سکتے ہیں۔ کیا ملک میں کوئی ایسا اخبار موجود ہے جو ان کا نقطہ نظر شائع کر سکے۔؟ کوئی ایسا پریس موجود ہے جو ان کے خیالات کو پمفلٹ، پوسٹر، یا کسی اور شکل میں چھاپ سکے؟ کیا کوئی ایسا پلیٹ فارم موجود ہے جس سے وہ دوسروں تک اپنی بات پہنچا سکیں اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کی کوشش کر سکیں؟ پھر کوئی جوابی تحریک چلائی جائے تو کیسے ــــــ خود ان چالیس پچاس آدمیوں میں سے کوئی ایک بھی دھوکا دے جائے یا اس سے کسی طرح راز فاش ہو جائے تو ان کا جو حشر ہوگا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایسے "مجرم" پھر زمین کی سطح پر کم ہی دیکھے جاتے ہیں ــــــ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کسی ملک میں کوئی تحریک چلانے کے لئے جن سخت سے سخت حالات کا تصور کیا جا سکتا ہے اشتراکی ممالک میں حالات اس سے بھی سخت ہیں۔ اور اس کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں پایا جاتا۔ کہ ان میں کوئی جوابی تحریک چلائی جا سکے بلکہ اس کے متعلق سوچا بھی جا سکے۔

دراصل سوشلزم وہ پھندا ہے جو اپنی خوشی سے گلے میں ڈالا تو جا سکتا ہے لیکن اپنی خوشی سے اتارا نہیں جا سکتا۔

(آئین ۸ر مارچ ۶۶۹)

سوال۔ جب اشتراکی ممالک کے حالات کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کا انحصار بیشتر مغربی پریس کی فراہم کردہ معلومات پر ہے۔ اس لئے یہ قابل اعتماد نہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟

جواب۔ اوّل تو یہ بات کہنا ہی غلط ہے کہ اشتراکی ممالک کے حالات کا تجزیہ مغربی پریس کی اطلاعات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے کیونکہ اصل صورت واقعہ یہ نہیں ہے تاہم ان لوگوں سے یہ پوچھنا چاہیئے کہ اگر بالفرض مغربی پریس کی اطلاعات

غلط ہیں۔ تو اشتراکی ممالک میں اس بات کی آزادی کیوں نہیں ہے۔ کہ غیر ملکی سیاح آزادانہ ان ممالک میں گھوم پھر کر اصل حالات معلوم کر سکیں ایسا کیوں ہے کہ ان کے شمالی اشتراکی ممالک میں جب بھی کوئی غیر ملکی وفد سرکاری یا غیر سرکاری دورے پر جاتا ہے تو اس کی پوری نگرانی کی جاتی ہے۔ اور جہاں جہاں حکومت چاہتی ہے وفد کے ارکان صرف وہیں جا سکتے ہیں۔ آخر یہ پردہ داری کس چیز کی ہے۔ کیا آمریت سے آزاد غیر اشتراکی ممالک میں بھی (ان کی تمام خرابیوں کے باوجود) اس طرح کے (CONDUCTED TOURS) کا انتظام کیا جاتا ہے؟ ——"

"رہی بات یہ کہ ان ممالک کے آہنی پردوں کے پیچھے سے خبریں باہر کیسے آتی ہیں تو ان کا اولین ذریعہ تو وہ نامہ نگار رہیں۔ جو ان ملکوں میں مقیم ہیں۔ ان نامہ نگاروں کے خبریں حاصل کرنے کے اپنے ذرائع ہوتے ہیں —— پھر ان ممالک کے بارے میں خبروں کا ایک انتہائی اہم ذریعہ ان ممالک سے فرار ہونے والے لوگ ہیں جو دوسرے ممالک میں پناہ لیتے ہیں۔ مثلاً مشرقی جرمنی سے بھاگ کر مغربی جرمنی میں اور چین سے بھاگ کر شنگھائی میں پناہ لینے والے لوگ، کیا آپ نے کبھی اس طرح کی خبر بھی سنی ہے کہ کسی غیر اشتراکی ملک سے بھاگ کر کسی نے اشتراکی ممالک میں پناہ لی ہو —— اس کے علاوہ جو لٹریچر خود اشتراکی ممالک میں چھپتا ہے۔ اس کی داخلی شہادت بھی ان ممالک کے متعلق ایک اہم ذریعہ معلومات ہے"۔

(آئین ۱۷، رفروری ۶۹ء)

سوال ۔ اسلامی ممالک میں اشتراکیوں اور قادیانیوں کی سرگرمیاں روزبروز بڑھتی جا رہی ہیں۔ کیا آپ اب بھی اسلامی قیادت کے قیام کے متعلق پُر امید ہیں؟

جواب ۔ ہم قادیانیوں اور اشتراکیوں کی سرگرمیوں کو بغور دیکھ رہے ہیں دوسرے مسلمان ملکوں میں اشتراکیوں کی سرگرمیاں زیادہ ہیں۔ قادیانیوں کی کم ہیں۔ ہمارے

ملک میں دونوں کی سرگرمیاں اچھی خاصی ہیں۔ لیکن ہم ان کو دیکھ کر کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑے ہیں۔ کہ اب یہاں اسلامی قیادت کے لئے امکانات باقی نہیں رہے اس لئے ان کے لئے میدان خالی چھوڑ دیں ــــــ جہاں تک قادیانیوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی اصل پوزیشن کیا ہے معلوم نہیں کہ آپ نے یہ منظر دیکھا ہے یا نہیں مگر ہم پٹھان کوٹ کے قریب رہتے تھے وہاں ہم نے یہ منظر دیکھا۔ کہ ایک درخت ہے (مثلاً شہتوت کا درخت) اس کے اوپر کسی جانور نے پیپل کی بیٹ لا کر ڈال دی تو پیپل نے اس کے اندر جڑیں پکڑ لیں اور بڑھنا شروع کیا۔ گویا اس کی اپنی جڑ زمین میں نہیں ہے وہ شہتوت کے درخت سے غذا حاصل کر رہا ہے اور اس کے اوپر بڑھ رہا ہے اب اگر اس درخت کو آپ بدل دیں تو طفیلی درخت خود بخود نشو ونما سے محروم ہو جائے گا۔ اس وجہ سے ہم زیادہ فکر اسی بات کی کر رہے ہیں کہ اس شہتوت کے درخت کی جگہ ایک مضبوط درخت لگے۔

باقی رہی اشتراکیت ــــــ تو اشتراکیت ایک عالمی تحریک کی بدولت یہاں چل رہی ہے اس کا اپنا زور اب بھی یہاں نہیں ہے۔ اس کو غذا باہر سے مل رہی ہے لٹریچر باہر سے مل رہا ہے گویا یہ بیرونی اثر سے چل رہی ہے باہر اگر روسی اور چینی اشتراکیت کا تنازعہ پیدا ہوتا ہے تو یہاں بھی یہ لوگ روسی اور چینی لائن میں تقسیم ہو جاتے ہیں الغرض اشتراکیت ہو یا کچھ اور، کوئی چیز ہمارے لئے پریشان کن مسئلہ نہیں ہے۔ الجھاؤ اس طرز عمل سے پیدا ہوتا ہے جب حکومت اپنے ملک کی اسلامی تحریکوں کو خطرناک تو قرار دے دیتی ہے لیکن اشتراکی اثرات کو نہ صرف یہ کہ خطرناک نہیں سمجھتی بلکہ عملاً اسے پروان چڑھانے میں خود مددگار ہوتی ہے ہمارے ہاں پی آئی اے کے جہاز باہر سے بے تحاشا اشتراکی لٹریچر لا رہے ہیں یہ لٹریچر ٹنوں کے حساب سے آ رہا ہے اور برائے نام قیمت پر بعض صورتوں میں بالکل مفت تقسیم ہو رہا ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو یہ سب کچھ اور اس کے دور رس نتائج تو نہیں دکھائی دیتے

نگاہ اگر پڑتی ہے تو اس پر کہ کوئی شخص جماعت اسلامی کی کتاب پڑھ رہا ہے
سی آئی ڈی کے آدمی ترجمان القرآن کے خریداروں کے پتے معلوم کرنے پر مامور
ہیں۔ مگر اس کی کوئی فکر نہیں کہ یہاں اشتراکیت کس طرح پھیل رہی ہے یہ وہ لوگ
ہیں جن کو دوست دشمن نظر آتے ہیں۔ اور دشمن دوست نظر آتے ہیں۔

سوال۔ اشتراکیت کی حمایت کرنے والے علماء کے بارے میں آپ
کا کیا خیال ہے؟

جواب۔ اشتراکیت کی حمایت کرنے والے ان علماء کو یہ معلوم ہونا چاہیئے
کہ جذبات سے مغلوب ہو کر یا کسی شخص سے دشمنی کی بنا پر اگر یہ لوگ سوشلزم
کی حمایت کر رہے ہیں۔ تو انہیں اس کے انجام پر نظر رکھنی چاہیئے۔ چین اور روس
میں بھی علماء کے ایک گروہ کو اسی طرح اپنے مقاصد کے لئے اشتراکی حضرات
نے استعمال کیا۔ اور جب وہ پوری طرح غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو
انہوں نے مزاحمت کرنے والوں کے ساتھ ساتھ ان حمایت کرنے والوں کو بھی
ختم کر ڈالا اس لئے کہ مذہب اور خاص طور پر اسلام اشتراکیت کے لئے سم قاتل
کی حیثیت رکھتا ہے۔

(ایشیاء ۲۲ فروری ۶۹ء)

اسلام کا معاشی نظام

سوال :- میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے اسلام کے معاشی نظام پر جو لکھا ہے اور اس سے پہلے قدیم اہل قلم نے اس موضوع پر جو کام کیا ہے وہ اس بات کے لئے کافی ہے کہ اس کی روشنی میں موجودہ دور کی معیشت کو پوری طرح اسلام کے مطابق ڈھالا جاسکے بالخصوص جبکہ موجودہ دور کے مسائل بہت پیچیدہ ہو چکے ہیں اور علم معاشیات پر بڑے وسیع پیمانے پر کام کیا جاچکا ہے؟

جواب :- پہلی بات تو آپ یہ سمجھ لیجئے کہ ایک چیز ہے معاشی فلسفہ یا معاشی تصورات (ECONMIC PHILOPHY) اور دوسری چیز ہے معاشی قوانین یا اکنامک سائنس (ECONMIC SCIENCE) جہاں تک اسلام کے معاشی نظریات اور معاشی فلسفے کا تعلق ہے وہ ہمارے قدیم لٹریچر میں بڑی تفصیل کے ساتھ مربوط اور منظم شکل میں بیان شدہ موجودہ ہے اور موجودہ دور میں بھی اس پر خاصا کام ہوا ہے۔ جس میں اپنی بساط بھر میں نے بھی حصہ لیا ہے۔ اسلام کے معاشی فلسفے کے اولین ماخذ (SOURCES) قرآن و حدیث ہیں اور پھر ان کے بعد فقہائے اسلام کا وہ سارا کام ہے جو انہوں نے تدوین کے لئے سرانجام دیا ہے۔ فقہائے اسلام نے قرآن و حدیث کی روشنی میں بڑی تفصیل کے ساتھ وہ اصول مرتب کر دیئے ہیں جو ایک اسلامی معاشرے میں معاشی زندگی کو منضبط کرتے ہیں اور پھر اپنے دور کی معیشت و تمدن کے لحاظ سے انہوں نے

ان اصولوں کو عملی طور پر مختلف مسائل پر منطبق کر کے بھی دکھایا ہے۔ ائمہ فقہا کا یہ کارنامہ تحریری طور پر محفوظ ہے اور جو شخص بھی اسلام کے معاشی نظام کو سمجھنا چاہیے وہ قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ ان کا مطالعہ کر کے مکمل رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

جہاں تک موجودہ دور کی اکنامکس سائنس (معاشی قوانین و ضوابط) کا تعلق ہے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک مسلم فلاسفر معاشی سائنس کا ماہر بھی ہو۔ اسلامی فلسفۂ معیشت کے ماہر کا کام تو یہ ہے کہ وہ اسلام کے معاشی اصولوں کو موجودہ دور کی معاشی اصطلاحات کی روشنی میں اور مروجہ علم معیشت کی معروف زبان میں بیان کر دے۔ آگے یہ معیشت دانوں کا کام ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں عملی تفصیلات مرتب کریں اور پھر پوری معاشی مشینری کو ان کے مطابق چلا کر دکھائیں۔

سوال: اس ضمن میں آپ نے جو کام کیا ہے کیا اس میں موجودہ دور کے معاشی تصورات کا تجزیہ بھی موجود ہے؟

جواب: میں نے اپنی تحریروں میں اس امر کی کوشش کی ہے کہ ایک طرف اسلام کے معاشی فلسفے کو اصولی حیثیت سے بیان کر دیا ہے اور دوسری طرف یہ بتا دیا جائے کہ موجودہ دور کے معاشی تصورات اسلام کے معاشی تصورات سے کہاں کہاں ٹکراتے ہیں اور اسلام کے تجویز کردہ معاشی نظام کے مقابلے میں اپنے اندر کیا کیا بنیادی غلطیاں اور خرابیاں رکھتے ہیں۔

اس طرح میں نے بیک وقت اسلام کے تجویز کردہ معاشی نظام کے بنیادی اصول بھی بیان کر دیئے ہیں۔ اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جدید حالات حالات پر ان کا عملی اطلاق کس طرح ممکن ہے۔ اس کے بعد ان اصولوں کی عملی تفصیلات مرتب کرنا ماہرین معیشت کا کام ہے اور عملی تفصیلات محض کتابیں لکھنے سے طے نہیں ہو سکتیں۔ اس کے لئے تو معاشرے کے اندر اس ارادے اور

عزم کا موجود ہونا ضروری ہے کہ یہاں اسلام کے معاشی نظام کو نافذ کرنا ہے۔ جب یہ عزم یہاں موجود ہو گا اور اس عزم کے مطابق ضروری کوششیں بروئے کار لائی جائیں گی تو یہ تفصیلات طے کرنا کوئی مشکل کام نہ ہو گا۔

(آئین، ۱۰ اپریل ۱۹۶۹ء)

سوال: قرآن مجید کی آیت ہے وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (اے نبیؐ! وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ کیا چیز خرچ کریں۔ ان سے کہو کہ جو کچھ بچ رہے) بعض لوگ اس سے قومی ملکیت کے حق میں استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ضرورت سے زائد (SURPLUS) جو کچھ ہو وہ العفو ہے اور اسے قومی ملکیت میں دے دینا چاہیے۔ اس استدلال کی کیا حقیقت ہے؟

جواب: بعض لوگ نظریات تو باہر سے لاتے ہیں اور پھر قرآن کو اپنے پیچھے چلاتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جو نظریات انہیں پسند ہیں قرآن ان کی تصدیق کرے۔ اس کی ایک مثال یہ سلوک ہے جو اس آیت سے کیا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس آیت سے یہ بات کیسے نکل آئی کہ جو کچھ بچ رہے اسے قومی ملکیت میں دے دیا جائے یہ آیت تو بالکل برعکس انفرادی ملکیت کو ثابت کرتی ہے کیونکہ اگر انفرادی ملکیت کی نفی کر دی جائے تو پھر مَاذَا يُنفِقُونَ (کہ وہ کیا خرچ کریں) کے کیا معنی باقی رہ جاتے ہیں۔ لوگوں کی ملکیت میں کوئی مال ہو تو اسی صورت میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ کیا خرچ کریں۔

آپ دیکھیں گے کہ اس بات کا فیصلہ فرد پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد کیا چیز خرچ کرے۔ ضرورت ایک غیر معین چیز ہے اور ایک اسلامی معاشرے میں یہ فیصلہ ایک شخص خود ہی بہتر کر سکتا ہے کہ اس کی حقیقی ضرورت کیا ہے۔ اسلام انسان کو اس دنیا میں اپنا نامۂ اعمال مرتب کرنے کی پوری پوری آزادی دیتا ہے اس لئے وہ کسی ریاست یا کسی اور شخص کو اس کا اختیار نہیں دیتا کہ وہ ایک شخص کی

جانب سے خدا کی راہ میں خرچ کئے جانے والے مال کی مقدار کا تعین کرے یا یہ فیصلہ کرے کہ اس کی ضرورت کیا ہے اور کیا کچھ وہ خرچ کر سکتا ہے۔ یہ بات بھی نگاہ میں رہے کہ ضرورت سے زائد مال خرچ کرنے کی بھی ترغیب دلائی گئی ہے یعنی اس کا حکم نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ جو لوگ خود خرچ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں انہیں ایک ہدایت دی جا رہی ہے۔

آئین ۲۸ فروری ۱۹۶۹ء

سوال:۔ مولانا ایک دفعہ درس میں آپ نے ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ آدمی کو ضرورت سے بچا ہوا مال خرچ کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں لفظ "ضرورت" وضاحت طلب ہے کیونکہ ہر آدمی کے ذہن میں اس کا ایک الگ تصور پایا جاتا ہے۔

جواب:۔ ضرورت ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے بارے میں کوئی شخص بھی کوئی ایک ہی حتمی معیار مقرر نہیں کر سکتا۔ اس کا فیصلہ ہر آدمی خود کر سکتا ہے، البتہ صحیح فیصلہ وہ شخص کرے گا۔ جس میں اسلامی ذوق اور اسلام کا پیدا کیا ہوا ذوق ہو گا، جس شخص میں مغربی تہذیب کا پیدا کیا ہوا ذوق ہو گا یا جس میں ہندو بنیوں جیسی ذہنیت پائی جاتی ہو گی اس کا ضرورت کے متعلق تصور کچھ اور ہو گا لیکن جس شخص میں اسلامی ذوق موجود ہو وہ اس بات کا ایک صحیح اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کی واقعی اور حقیقی ضروریات کیا ہیں۔ اور جو کچھ دولت وہ کما رہا ہے اس کی کمائی کی نسبت سے اس کی زندگی کا معیار کیا ہونا چاہئے۔ یہ بات کہ اس کا گھر کیسا ہونا چاہیئے اس کا فرنیچر کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کے بال بچے اور وہ خود کس قسم کا لباس پہنے اس کا صحیح فیصلہ وہ خود ہی کر سکتا ہے۔ زندگی کے اس معیار کو برقرار رکھنے کے لئے اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی کمائی میں سے خرچ کرے مثلاً فرض کیجئے کہ اگر ایک آدمی ہزار روپے مہینہ کماتا ہے تو آپ اس سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے کہ اپنی زندگی کا معیار وہ رکھے جو سو روپیہ ماہوار کمانے والے کا ہو سکتا ہے،

ظاہر بات ہے کہ اس کے بال بچوں کے اور اس کی بیوی کے اس پر حقوق ہیں۔ اس کے والدین اور اس کے بھائی بندوں کے اس پر حقوق ہیں۔ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی آمدنی کے لحاظ سے ان سب پر خرچ کرے۔ پھر ان ضروریات کو پورا کرنے کے بعد اس کے پاس جو کچھ بچے اسے سینت کر رکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے دوسرے مستحقین پر خرچ کرنا چاہیئے۔

سوال :- کیا بچوں کی تعلیم وغیرہ اور مستقبل کی دوسری متوقع ضروریات کے لئے کچھ رقم پس انداز کرتے رہنا صحیح ضرورت کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں ؟

جواب :- اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ جس معاشرے میں اسلامی نظام برپا ہو اور جس میں ایسے انتظامات موجود ہوں کہ کسی آدمی کو خود اپنے مستقبل کی کوئی فکر نہ کرنی پڑے اور اس پر کوئی افتاد آپڑے تو معاشرہ اس کی ذمہ داری قبول کرے اور اسے پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دے تو ایسے معاشرے کا معاملہ جدا ہے لیکن معاشرے کی حالت وہ ہو جو اس وقت ہے کہ ع

کسے را با کسے کارے نباشد

تو ایسے معاشرے کا معاملہ جدا ہے یہ معاشرہ تو وہ ہے کہ اس میں اگر آدمی کے لئے کوئی تحفظ ہے تو وہ اس کے اپنے ہی بچائے ہوئے مال کی وجہ سے ہے ورنہ اور کوئی انتظامات نہیں ہیں۔ اس معاشرے کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرتا ہے تو یہ معاشرہ اسے ایک لات مار کر نیچے پھینک دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے کے حالات بالکل جدا ہیں۔ اس میں اگر کوئی شخص مشکل وقت کے لئے کچھ سنبھال کر رکھتا ہو تو اس کو ملامت نہیں کی جا سکتی جیسا کہ حدیث میں بھی آیا ہے کہ اگر تم بقدر کفاف بچاؤ تو تم پر ملامت نہیں۔ اس زمانے میں بقدر کفاف کے معنی کچھ اور ہیں چنانچہ اگر ایک آدمی اس معاشرے میں ایک اعتدال کے ساتھ اپنے اور اپنے بال بچوں کے مستقبل کی حفاظت کے لئے کچھ بچا کر رکھنے کا انتظام کرتا

کرتا ہے تو اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ بات کسی حالت میں بھی صحیح نہیں ہوسکتی کہ ایک آدمی لاکھوں کروڑوں روپے جمع کرتا چلا جائے اور اسے کسی ایسے کام میں استعمال نہ کرے جس سے دوسری خلق خدا کا فائدہ ہو اور اس کی ضروریات بھی پوری ہوسکیں۔

(آئین ۱۶ جنوری ۱۹۶۹ء)

سوال :۔ کیا اسلامی حکومت حد ملکیت کا تعین نہیں کرسکتی تاکہ کچھ لوگ بہت زیادہ امیر نہ بن سکیں؟

جواب :۔ اسلام کسی مصنوعی تدبیر سے تحدید ملکیت کا قائل نہیں ہے بلکہ اس نے بعض اصولی تدابیر کے ساتھ ارتکاز دولت کو روکا ہے مثلاً ایک تو وہ پابندیاں ہیں جو اکتساب دولت کے طریقوں پر لگائی گئی ہیں۔ اسلامی حکومت میں ایسے تمام ذرائع مسدود ہوں گے جو حرام ہیں اور آپ لوگ جانتے ہیں کہ آجکل جن ذرائع سے دولت پیدا کی جاتی ہے ان میں حرام ذرائع کا کیا عالم ہے۔ اسلامی معاشرے میں دولت صرف حلال ذرائع سے کمائی جاسکے گی۔ اسلامی حکومت میں سود اور جوئے اور اسی جیسے دوسرے ذرائع کی کمائی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی اسلام میں وہ احکام بھی موجود ہیں جو ان حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو خرچ کرنے کے بارے میں ہیں سب سے پہلا حکم تو زکوٰۃ کا ہے۔ پھر ایک شخص کی کمائی میں سے اس کے بال بچوں، والدین، عزیز و اقارب، یتیموں اور مسکینوں وغیرہ کا حق مقرر کیا گیا ہے۔ ان سب پر خرچ کرنے کے بعد اگر آدمی کے پاس کچھ بچ رہتا ہے تو اسے بھی خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے لیکن اس بارے میں اسلام قانون کی جبریت سے کام نہیں لیتا بلکہ اس کا فیصلہ آدمی کے اپنے اختیار میں چھوڑتا ہے کہ وہ کیا بچائے اور کیا خرچ کرے۔ اگر آدمی سے اپنی آزاد مرضی سے نیکی کرنے کے اختیار کو سلب کرلیا جائے تو پھر اعمال کی جواب دہی کا تصور اور یوم حساب کی ضرورت اور اس کا جواز ہی ختم ہو جاتا

ہے۔ مزید برآں یہی اختیار تو انسان کے لئے اخلاقی اور روحانی ارتقا کے مواقع فراہم کرتا ہے اور اگر انسان کوئی اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے تو سوال یہ ہے کہ آخر اس کی بقا اور ارتقا کو مجروح کرنا کیسے اسلامی تصوّر ہو سکتا ہے؟

اسلامی معاشرے میں لوگوں کو بعض اصولی حد بندیوں کے اندر، اکتسابِ دولت اور انفاقِ دولت میں آزادی اسی مقصد کے لئے دی گئی ہے کہ وہ اپنے اس ٹھکانے کا انتخابات خود کریں جہاں انہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی قانونی جبریت کے ذریعے فرد کو اس کی آزادیٔ عمل سے یکسر محروم کر دینا اسلام کے مزاج اور مقاصد سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔

(آئین، ۲۸ر فروری ۱۹۶۹ء)

سوال:۔ ایک خدشہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر قانونی پابندیاں نہ ہوں تو پھر ایک فرد کو بہت زیادہ دولت جمع کرنے سے نہیں روکا جا سکتا؟

جواب:۔ جن نظاموں نے محض قانون کی طاقت سے معاشرے کی تعمیر و اصلاح کی کوشش کی ہے انہوں نے انسانوں کو قانونی جبر میں تو ضرور جکڑا ہے لیکن ان کی اصلاح و فلاح میں اگر کوئی کامیابی حاصل کی ہو تو بتائی جائے۔ یہ صرف اسلام ہے جو انسان کے اوپر قانون مسلّط کر دینے کے بجائے براہِ راست اس کے نفس سے خطاب کرتا ہے اور اس کے دل اور ضمیر سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے۔ وہ انسان میں احساس اور شعور کی تخلیق کرتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار ہستی ہے اور اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہے۔ اس طرح اسلام ایک ایک فرد کے اندر نیک و بد اور صحیح و غلط کی تمیز پیدا کرنے کے بعد اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے غلط چیزوں سے بچے اور صحیح چیز کو اختیار کرے لیکن اگر کچھ لوگ اسلام کے تربیتی نظام کی ساری تدابیر کے باوجود اصلاح کو قبول نہ

کریں تو پھر وہ قانون کو آخری چارہ جوئی کے طور پر استعمال کرتا ہے تاکہ معاشرے کو ایسے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھنے اور نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کا انتظام کیا جائے۔ فی الحقیقت اسلام نے اکتساب دولت اور جمع دولت پر جو اصولی پابندیاں لگائی ہیں وہ عدل اجتماعی کے لئے بہت صحیح ترین طریق کار پر مشتمل ہیں اور اس بات کے لئے بہت کافی ہیں کہ معاشرے کے مختلف طبقات میں معاشی توازن قائم رکھا جا سکے اور افراد کو بہت زیادہ امیر یا بہت زیادہ غریب بننے سے روکا جا سکے۔ اسلام انسانی معاشرے میں ظلم کی ہر شکل کو پیدا ہونے سے روکنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

(آئین، ۲۸ فروری ۱۹۶۹ء)

سوال:۔ زکوٰۃ، صدقہ اور خیرات سے متعلق ایک شبہ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان سے روپیہ لینے والوں کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے اور خواہ سوسائٹی کو دینی اور اخلاقی طور پر کتنا ہی بلند کر دیں پھر بھی صدقہ اور خیرات لینے والوں کے احساس میں کمزوری کا پہلو موجود رہے گا۔ مزید برآں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صدقہ اور خیرات حساس انسان کے لئے آئیڈیل معاشی نظام کا حصہ نہیں بن سکتے۔

جواب:۔ کیا آپ کے خیال میں ایک آئیڈیل معاشی نظام یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے کام نہ آئے یا پھر آئیڈیل معاشی اس کو سمجھتے ہیں کہ انسانوں کو مشینوں کی طرح استعمال کیا جائے۔ ان کی ضروریات بھی مشینوں کی طرح پوری کی جائیں اور اس امر کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کی مدد کر سکے یعنی انسان کے لئے انسان کی کوئی اہمیت ہی نہ رہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ اس کو آئیڈیل نظام قرار دیتے ہوں حالانکہ فی الاصل یہ ایک انسانیت کش نظام ہے۔ وہ نظام جس میں ؎

کسے را کسے کار سے نا شد

کے مصداق کسی آدمی کو کسی آدمی سے کوئی دلچسپی یا کوئی کوئی ہمدردی نہ ہو۔ اس میں آدمیت ختم ہوتی چلی جاتی ہے اور "مشینیت" انسانی زندگی میں داخل ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کا نقصان اس وقت پہنچتا ہے جب کوئی ایسی آفتِ عام آ جائے جس میں وہ مشینی نظام جو حکومت نے کر رکھا ہو فیل ہو جائے۔ کسی انسانی معاشرے میں ایسی آفات کسی وقت بھی آ سکتی ہیں کہ جنہیں انسان فاقوں مرنے لگے اور حکومت کا کوئی ایسا انتظام موجود نہ ہو جو ان کو راشن پہنچائے یا مثال کے طور پر جو لوگ زخمی ہو گئے ہوں یا کسی اور تکلیف میں مبتلا ہو گئے ہوں ان کے لئے سرکاری طور پر کوئی ریلیف ورک ممکن نہ رہے۔ اس وقت لازماً یہ ضرورت پیش آئے گی کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے کام آئے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت مصیبت زدہ لوگوں کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوگی؟ معلوم ہوا کہ ایسی کسی ضرورت سے انسان کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا لیکن اگر معاشرے میں آپ نے انسان کو عملاً برسوں یہ تربیت دی ہو کہ ایک آدمی کا دوسرے آدمی کے کام آنا کوئی برائی ہے۔ اس سے اس کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے تو ایسی کسی مصیبت کی گھڑی میں اس سے کسی مختلف طرزِ عمل کی کیسے توقع کر سکتے ہیں۔

آجکل بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ بھی کوئی معاشرہ ہوا کہ جس میں کچھ خیرات دینے والے ہوں اور کچھ لینے والے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسا کرنا کوئی بہت ہی بُرا کام ہے۔ حالانکہ اگر کسی مصنوعی نظام کے ذریعے آپ اس کام کی اتنی برائی لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیں گے تو جب کوئی آفتِ عام آئے گی۔ لوگوں کے اندر وہ اخلاق ہی موجود نہیں ہوں گے جن کی بناء پر ایک آدمی دوسرے آدمی کے کام آتا ہے۔ کیونکہ سرے سے آپ نے لوگوں کی تربیت ہی اس انداز میں نہیں کی ہو گی، کہ کسی کی احتیاج میں مدد کرنا کوئی نیکی کا کام ہے۔ اس لئے ایک آدمی یہ سوچے گا کہ جب میرے راشن کی بچی ہوئی روٹی میرے پاس ہے تو یہ میرے ہی لئے ہونی چاہیئے۔ اگر کوئی دوسرا آدمی بھوکا مر رہا ہے تو گورنمنٹ کا کام تھا کہ اس کو راشن

پہنچاتی۔ میں کیوں اس کی فکر کروں۔ معلوم ہوا کہ دنیا میں مشینی انسان بنانے کی کوشش کرنے سے بڑی کوئی حماقت نہیں ہے اور جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ انسانیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ انسان کو انسان سمجھ کر بات نہیں کرتے بلکہ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ معاملہ صرف بھیڑوں کے کسی گلے کے لئے چارے اور باڑے کی فراہمی کا ہے۔

" اس میں شک نہیں ہے کہ ایک آدمی جب دوسرے آدمی کی مدد کرتا ہے تو وہ اس طرح کی خفت محسوس کرتا ہے اور اسی چیز کو حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے۔ اس لئے ایک آدمی کا یہ کام ہے کہ وہ اوّل تو کچھ لینے کے لئے اس وقت تک اپنے آپ کو تیار نہ کرے جب تک کہ انتہائی مجبور نہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ وہ اس طرح کچھ حاصل کر کے بیٹھ نہ جائے بلکہ برابر ہاتھ پاؤں مارے اور اس قابل بننے کی کوشش کرے کہ وہ لینے والے کی نسبت دینے والا ہے"۔

(ڈائین، ۲۸ فروری ۱۹۶۹ء)

سوال:۔ کیا قرآن و حدیث اور سلف سے اس کی کوئی نظیر پیش کی جا سکتی ہے کہ مزدور کو اس کی اجرت کے علاوہ پیداوار کے منافع میں بھی شریک کیا گیا ہو۔

جواب:۔ یہ مسئلہ دراصل مباحات میں سے ہے۔ شریعت کا اصول یہ ہے کہ انسان کو جس چیز سے منع کیا گیا ہے اسے وہ اسلام کے حدود اربعہ کا لحاظ رکھتے ہوئے کر سکتا ہے۔ قرآن و حدیث میں ہمیں معاشیات کے بارے میں چند بنیادی اصول دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہم اپنی ضروریات کے مطابق تفصیلات طے کر سکتے ہیں۔ جہاں تک سلف سے نظیر لانے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق یہ جان لیجئے کہ اس زمانے میں سرمایہ اور محنت کے وہ مسائل ہی پیدا نہیں ہوئے تھے جن سے ہمیں یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد سابقہ پیش آیا ہے

جدید معاشی نظام نے انسانیت پر جو ظلم ڈھائے ہیں ان کا قرن اوّل میں کوئی نشان نہیں ملتا۔ اس زمانے میں چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں تھیں جن میں دس دس بارہ بارہ افراد کام کرتے تھے اور ایک کنبے کی طرح وہ اپنے معاملات طے کر لیا کرتے تھے۔ یورپ میں صنعتی انقلاب آیا تو اس نے بڑی تیزی سے پوری دنیا میں اپنے پنکھ پھیلا دیئے اور گھریلو صنعتیں (COTTAGE INDUSTRIES) دم توڑنے لگیں۔ بڑے بڑے کارخانے لگ گئے اور ہزاروں آدمی بیک وقت ایک کارخانے میں کام کرنے لگے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ وہ ایک بہت بڑے کارخانے دار کے دستِ نگر ہو گئے۔ کارخانہ دار انہیں من مانی شرائط پر ملازم رکھنے لگا اور وہ مجبور تھے کہ کارخانہ دار کی شرائط پر کام کریں کیونکہ کام نہ کرنے کی صورت میں ان کا جینا محال تھا۔ ان کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ ایک دن بھی فاقے سے بچ سکیں۔ دوسری طرف کارخانے دار اتنی دولت کا مالک تھا کہ وہ دو سال بھی کارخانہ نہ چلائے تو اسے تلے سے رہ سکتا تھا۔ مزدور کی اس مجبوری سے سرمایہ دار نے خوب فائدہ اٹھایا۔ بالآخر مزدوروں کے اندر اس ظلم کے خلاف لہر اٹھی اور انہوں نے متحد ہو کر آواز بلند کی تو سرمایہ دار کو اس متحدہ قوت کے سامنے جھکنا پڑا اور مزدوروں کے انسانی حقوق تسلیم کر لئے گئے۔ ایک مدت کی جدّوجہد کے بعد اب یورپ میں مزدور اور کارخانہ دار کے تعلقات خوشگوار مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔

اب سوال کے اصل نقطے کی طرف آتا ہوں یعنی کیا مزدور کا اُجرت کے علاوہ نفع میں بھی حصّہ ہے؟ اس کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ مزدور کو جو اُجرت ملتی ہے وہ دراصل نفع ہی کا ایک حصّہ ہوتی ہے۔ اب ضروری نہیں کہ وہ نفع میں اس کی نسبت کے عین مطابق ہو۔ چونکہ مزدور کو اپنی گذر اوقات کے لئے ایک ماہانہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ رقم اسے تنخواہ کی صورت میں مل جاتی ہے لیکن زائد منافع اس کا محفوظ رہتا ہے۔ سال چھ مہینے میں پورا حساب لگانے کے بعد اسے بونس کی شکل میں منافع ملنا چاہیئے۔

سوال :- جب مزدور منافع میں شریک ہونے کا دعوے دار ہے تو کیا یہ ضروری نہیں کہ اسے نقصان میں بھی برابر کا شریک ٹھہرایا جائے۔

جواب :- شرکت اور مضاربت دو مختلف اصطلاحیں ہیں۔ شرکت اسے کہتے ہیں کہ ایک آدمی کسی کاروبار میں اپنے سرمائے کے ساتھ شریک ہو ایسی صورت میں کاروبار میں ہونے والے نفع اور نقصان دونوں کا حصّہ دار قرار پایا ہے اور مضاربت اسے کہتے ہیں کہ ایک آدمی کسی کاروبار میں محض اپنی محنت کے ساتھ شریک ہوتا ہے اور محنت کے صلے میں وہ اس کاروبار سے نفع حاصل کرتا ہے وہ اس کاروبار میں ہونے والے کسی نقصان کا ذمہ دار نہیں ہے، مزدور اور کارخانہ دار کے درمیان بھی مضاربت کا تعلق ہے جس میں نقصان کی زد اس پر نہیں پڑتی۔

(ایشیا، ۴ اپریل ۱۹۶۹ء)

سوال :- کچھ لوگ اسلام کے اقتصادی نظام پر اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام امیر اور غریب کے وجود کو قائم رکھنا چاہتا ہے اور طبقاتی تقسیم کا حامی ہے؟

جواب :- اسلام کسی مصنوعی اور جبری تدبیر سے امیر اور غریب کے وجود کو یکسر ختم نہیں کرتا بلکہ وہ مختلف بنیادی تدابیر کے ساتھ ان دونوں کے مابین تفاوت کو کم سے کم کرتا ہے۔ اسلام اصل میں معاشی مساوات کا نہیں بلکہ معاشی انصاف کا علمبردار ہے۔ معاشی مساوات کے مادی تصوّر کے متعلق تو میں بتا چکا ہوں کہ یہ ایک خلافِ فطرت اور خلافِ انصاف تصوّر ہے اور عملاً بھی ناکام ہو چکا ہے۔ البتہ معاشی انصاف کا حصول ایک فطری تصوّر ہے اور اسلام اسے عملاً بھی قائم کرتا ہے۔ معاشی انصاف سے مراد یہ ہے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ ایک فرد اپنی ذاتی حیثیت کی بناء پر جہاں تک ترقی کر سکتا ہو کوئی مصنوعی رکاوٹ اسے روکنے والی نہ ہو۔ مثلاً ایک غریب کا بیٹا اس وجہ سے اعلیٰ تعلیم سے محروم نہ رہے گا کہ وہ غریب کا بیٹا ہے۔ اسے اعلیٰ تعلیم کے پورے پورے

مواقع میسّر ہوں گے اور وہ اپنی ذاتی قابلیت سے ترقی کرکے جس بلند سے بلند مقام پر پہنچ سکے گا اس کو اس کے لئے مکمل سہولتیں حاصل ہوں گی۔ اس کے برعکس اگر امیر کا بیٹا نالائق ہے تو اسلامی معاشرے میں اس وجہ سے کسی بلند عہدے پر نہیں جا سکے گا کہ وہ امیر کا بیٹا ہے یا اسے ترقی کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام معاشی انصاف کے لئے مواقع میں مساوات (EQUALITY IN — OPPORTUNITY) مہیا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس (EQUALITY IN — OPPORTUNITY) کی بدولت طبقات کا وجود مستقل نہیں رہ سکتا۔ یہ طبقات بجا طور پر تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر آج ایک شخص غریب ہے تو کل وہ اپنی ذاتی قابلیت اور محنت کی بدولت امیر بن سکتا ہے اور اگر ایک شخص آج امیر ہے تو کل اپنی نالائقی اور بدعنوانیوں سے مفلس ہو سکتا ہے۔

(آئین، ۷ فروری ۱۹۶۹ء)

سوال :۔ جب امیر کا بیٹا اس وجہ سے کہ وہ امیر ماں باپ کے گھر پیدا ہوا ہے۔ ایچی سن کالج میں تعلیم پائے گا اور غریب کا بیٹا غربت اور افلاس کی بدولت معمولی سکول میں پڑھے گا تو کیا یہ صحیح ہو گا؟

جواب :۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں بھی امیرزادوں کے لئے ایچی سن کالج پائے جائیں گے؟

"آپ حضرات کی اصل الجھن یہ ہے کہ اسلامی نظام کو موجودہ حالات پر قیاس کرتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی نظام آئے گا تو سب کچھ بدل جائے گا۔ امیر اور غریب دونوں کے لئے ایک جیسی تعلیم، طبی اور دوسری سہولتیں میسّر ہوں گی۔ ان کی اولاد الگ درس گاہوں میں تعلیم نہیں پائے گی۔ اسلامی نظام معاشی تفاوت کو معاشرتی نظام کا درجہ دینے کا نام نہیں ہے۔"

"معاشی انصاف کی ضمانت دینے کے ساتھ ساتھ اسلام دو تدبیریں ایسی اختیار کرتا ہے جن کی وجہ سے معاشرے میں عدم توازن پیدا نہیں ہوتا۔ پہلی تدبیر تو

یہ ہے کہ اسلام اکتساب دولت اور جمع دولت پر اصولی پابندیاں عائد کرتا ہے، مثلاً کمائی کے ذرائع میں حلال و حرام کی تمیز اور حاصل شدہ دولت میں زکوٰۃ اور صدقات وغیرہ کا حکم۔ ان پابندیوں کے ساتھ کسی آدمی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کروڑپتی اور ارب پتی بن جائے۔ دوسری تدبیر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سارے مواقع کی موجودگی میں بعض خاص حالات کی وجہ سے اپنی روزی حاصل کرنے میں اور دوسری بنیادی ضروریات پورا کرتے میں ناکام رہ گیا ہو تو اسلام اس کو معاشی تحفظ دیتا ہے۔ ایک اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لئے روزگار لباس، رہائش، علاج اور تعلیم وغیرہ کا انتظام کرے اور ریاست کی حدود میں کوئی شخص بلالحاظ عقیدہ و مذہب۔ ان سے محروم نہ رہے۔"

سوال:۔ جو لوگ انگریز نوازی کی وجہ سے یا دیگر ناجائز بدولت آج بڑی بڑی جاگیروں، ملوں اور کارخانوں کے مالک ہیں۔ ایک اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد ان کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا جائے؟

جواب:۔ اسلامی اصول کی روشنی میں ان کے بارے میں دو رویے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آئندہ ان کی تمام ناجائز مراعات کا خاتمہ کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ پہلے انہوں نے دولت جس طرح سے کمائی ہے اس پر ٹیکس عائد کر کے آہستہ آہستہ ان کے قبضے سے نکال لی جائے۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ اسے اشتراکیت کا آپریشن کر کے نکالا جائے، لیکن وہ اس بات کو نہیں سوچتے کہ اشتراکیت کا اپریشن کر کے ان کے قبضے سے نکالنے کے لئے حکومت کو بہت زیادہ اختیارات دینے پڑیں گے کیونکہ جب تک حکومت کو اتنے وسیع اختیارات نہ حاصل ہوں کہ وہ لوگوں کی جائیدادیں ضبط کر سے۔ اس وقت تک یہ سکیم عمل میں نہیں آ سکتی۔ اب اگر آپ حکومت کو اتنا طاقتور بنا دیتے ہیں تو اس کے بعد آپ کے پاس اس بات کی کیا ضمانت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اپنی طاقت اور غیر محدود اختیارات کو عوام کے خلاف استعمال نہیں کرے گی۔ حکومت کا انتظام بہرحال

انسان چلائیں گے۔ آسمان سے فرشتے نہیں آئیں گے اور انسانوں کو وہی اختیارات دیئے جاسکتے ہیں جن کو وہ آسانی سے ہضم کرلیں گے جہاں بھی انسانوں کو وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں وہاں بالعموم ان کو اختیارات کی بدہضمی لاحق ہوگئی ہے اور انہوں نے لوگوں پر بے پناہ ظلم وستم ڈھایا ہے۔ اسلام یہ ظلم وستم کا دروازہ کھولنے کا قائل نہیں اور اسی لئے وہ حکمرانوں کو وسیع اختیارات دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی حکومت اسلام کی قائم کی ہوئی حدود اور اسلام کے طے کئے ہوئے اصولوں کے مطابق تمام حالات اور معاملات کی اصلاح کرے گی نہ کہ قوانین اسلامی کے حدود سے باہر جاکر اس طرح کے ظالمانہ قوانین بنائے گی جس طرح سے اشتراکی حکومتیں بناتے جاتے ہیں۔ یہ صحیح طریقہ کار نہیں ہے۔ اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ سرمایہ داروں سے دولت چھینتے چھینتے پھر غریبوں سے بھی سب کچھ چھین لیا جاتا ہے اور ملکیت ختم کرتے کرتے آزادی کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے۔

(آئین، ۵ اگست ۱۹۶۸ء)

سوال:۔ اگر اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد آج کل کے بڑے بڑے کارخانے، ملیں اور جاگیریں جوں کی توں بحال رکھیں گئیں تو معاشی وطبقاتی تفاوت کس طرح دور ہوگی؟ اور معاشی مسائل کس طرح حل ہوں گے؟ کیا اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد آسمان سے من وسلویٰ برسنے لگے گا؟

جواب:۔ نہیں۔ بلکہ من وسلویٰ انشاء اللہ زمین سے اُگنے گا۔ اسلامی حکومت خدا کی بنائی ہوئی زمین کی برکات کو خدا کے بندوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنے گی۔ انشاء اللہ۔

اس سوال کے پہلے حصّے کا جواب میں ابھی دے چکا ہوں یعنی اسلامی حکومت ان چیزوں کو اسلامی قوانین کی حدود میں حل کرے گی۔ ان حدود کو

تو ڈکر نہیں جاننا چاہیے کہ انسان کے معاشی مسائل حل کرنے کے لئے اسلام اپنا
ایک مزاج رکھتا ہے۔ اسس میدان میں اس کا مزاج چودہ سو سال پہلے سے مکمل
تھا موجودہ صدی میں آکر مکمل نہیں ہوا۔

(آئین، ۲۵، اگست ۱۹۶۹ء)

جماعت اسلامی کا معاشی پروگرام

سوال۔ جب جماعت کا معاشی پروگرام شائع ہوا تو بعض لوگوں کا تبصرہ یہ تھا کہ جماعت نے ملکیت زمین پر عارضی تحدید کی تجویز اختیار کر کے اصولی طور پر سوشلزم سے اتفاق کر لیا ہے۔ ایسا خیال کرنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔؟

جواب۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے یا کج فہمی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تجویز کے ساتھ سوشلزم کی جڑ کاٹ دی گئی ہے ــــــ ہم نے پچھلی ناہمواریوں کو ختم کرنے کے لئے ایک عارضی تدبیر کے طور پر ملکیت زمین کی تحدید تجویز کی ہے نہ کہ انفرادی ملکیت ہی کو سرے سے ساقط کر دیا ہے۔ جو کہ سوشلزم کا بنیادی اصول ہے پھر ہم نے ایک خاص حد سے زائد زمین منصفانہ قیمت پر خریدنے کی شرط لگائی ہے جبکہ سوشلزم کے تحت ریاست افراد سے زمین ظالمانہ طور پر غصب کر لیتی ہے مزید برآں سوشلزم زمین کو اجتماعی ملکیت قرار دے دیتا ہے۔ جبکہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ حکومت فرد کا حق ملکیت تسلیم کرتے ہوئے ایک خاص حد سے زائد زمین منصفانہ طریقے پر خرید کر غیر مالک کاشت کاروں یا اقتصادی حد سے کم زمین کے مالکوں کے ہاتھ آسان اقساط پر فروخت کر دے ــــــ اب یہ بتایا جائے کہ ان میں کون سی چیز ایسی ہے جس کی بناء پر یہ دعویٰ کرنا درست ہو کہ اصولی طور پر سوشلزم سے

اتفاق کر لیا ہے۔

سوال:۔ پچھلے دنوں جماعت کا جو معاشی پروگرام شائع ہوا ہے اس میں زمین کی ملکیت کو محدود کرنے کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے بظاہر یہ چیز جماعت کے سابق موقف کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ اس کی کیا حقیقت ہے؟

جواب:۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے اس تجویز کو پوری طرح نہیں پڑھا ہے۔ اس میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے کہ ملکیت زمین کی تحدید ایک ایسی عارضی تدبیر کے طور پر تجویز کی گئی ہے جس کا اصل مقصد پچھلی ناہمواریوں کو دور کرنا ہے اسے مستقل بنانا مقصود نہیں ہے کیونکہ مستقل تحدید اسلامی قانون وراثت اور متعدد دوسرے شرعی قوانین سے متصادم ہوتی ہے جماعت اسلامی کا موقف پہلے بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے اس لیے انحراف کا سوال پیدا نہیں ہوتا ——— یہ عارضی تحدید صرف اس غرض کے لئے تجویز کی گئی ہے کہ ایک دفعہ غیر معمولی ناہمواریوں کو دور کر دیا جائے۔ جو صدیوں سے ایک غیر اسلامی نظام کی کارفرمائی کی وجہ سے یہاں پیدا ہو چکی ہیں۔ اسلامی نظام قائم ہونے کے بعد تو تحدید کے لئے ایسی کسی تجویز کی ضرورت ہی نہیں رہے گی کیونکہ اسلامی قوانین کی موجودگی میں اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کوئی بڑی سے بڑی زمینداری بھی ظلم کی شکل اختیار کر سکے بڑی زمینداریوں کی ممکنہ خرابیوں کا سدباب مختلف قانونی پابندیوں کے ذریعے سے کیا جاسکتا ہے۔

سوال۔ عارضی تدبیر کے طور پر ملکیت زمین کے لئے جو تحدید تجویز کی گئی ہے اس کی شریعت میں کہاں تک گنجائش موجود ہے کیا اس طرح کے اقدام کے لئے کوئی نظیر پیش کی جاسکتی ہے؟

جواب۔ اس سوال کا جواب بھی شائع شدہ پروگرام میں موجود ہے اس میں صاف طور پر لکھا گیا ہے کہ ایک مدت تک زرعی املاک کے معاملہ میں غلط

نظام رائج رہنے کی وجہ سے جو ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہیں ان کو ختم کرنے کے لئے شریعت کے اس قاعدے پر عمل کیا جائے کہ غیر معمولی حالات میں ایسی غیر معمولی تدابیر اصلاح اختیار کی جا سکتی ہیں۔ جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوتی ہوں ـــــ ہم نے اپنے معاشی اصلاحات کے پروگرام میں جو ایسی تدابیر تجویز کی ہیں وہ شریعت کے اسی قاعدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے تجویز کی ہیں۔ شریعت اسلامی ہیں مباحات پر عارضی پابندیاں عائد کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے اور اس کے نظائر بھی پائے جاتے ہیں۔

ہم نے مختلف تجاویز مرتب کرتے وقت اصول شرعیہ کو پوری طرح سامنے رکھا ہے چنانچہ جو معاملات براہِ راست قانونِ شریعت سے متعلق تھے۔ ان کے لئے باقاعدہ علماء کی ایک کمیٹی مقرر تھی جس نے ہمیشہ مسائل پر غور و فکر کرکے رائے قائم کی ہے مزید برآں دوسرے جید علماء سے بھی رابطہ قائم کرکے ان کے مشورے اور آراء حاصل کی گئی ہے۔ تب کہیں جا کر کسی ایک تجویز کو قطعی شکل دی گئی ہے۔ یہ سارا علمی مواد بھی مرتب صورت میں ان شاء اللہ شائع کیا جائے گا ـــــ اس وقت تو ہم نے جو معاشی پروگرام دیا ہے اس میں صرف اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں ان کی وضاحت کے لئے مستقل مقالات اور مفصل کتابچے الگ بھی لکھے جائیں گے تاکہ ان اصولوں کے متعلق کوئی اشکال یا ابہام باقی نہ رہے۔

(آئین ۸ را پریل ۶۹ء)

طریقِ انقلاب

سوال ۔ کہا جاتا ہے کہ تبدیلی اقتدار آئینی ذرائع سے ہونی چاہیئے، لیکن گذشتہ انتخابات سے ثابت ہو گیا کہ رائے عامہ کی دو ٹوک تائید کے باوجود پُرامن تبدیلی ممکن نہیں ہے، دوسری طرف یہ صورت ظاہر ہے کہ تخریب پسندی اور توڑ پھوڑ میں ہلاکت ہے۔ پھر آخر اس کا حل کیا ہے؟

جواب ۔ آئینی طریقے سے حالات کی تبدیلی کا مفہوم اور ہے اور کسی ملک کے آئین کی پابندی کرتے ہوئے حالات کو تبدیل کرنے کا مفہوم اور ہے۔ آئینی ذرائع سے نظام کی تبدیلی کا مطلب یہ نہیں کہ موجودہ آئین کے مقرر کردہ طریقوں کے اندر رہ کر ہی کوششیں کی جائیں گی بلکہ دنیا بھر میں آئینی ذرائع سے جو مطلب لیا جاتا ہے ان ذرائع کو اختیار کر کے تبدیلی کی جائے گی اور یہ ذرائع موجودہ آئین کے مقرر کردہ طریقوں سے مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک توڑ پھوڑ کی کارروائیوں کا تعلق ہے ملک میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جو ایسی کارروائیوں کے ذریعے سے اقتدار پر قبضہ کر کے اشتراکی آمریت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اشتراکی انقلاب آتا ہی توڑ پھوڑ کے ذریعے سے ہے ان کا فلسفہ یہی ہے کہ بندوق کی نالی انقلاب کا سرچشمہ ہے' ـــــ اگر اس وقت ملک کے حالات توڑ پھوڑ کی طرف گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک اشتراکی انقلاب کے قریب آ رہا ہے لیکن

یہ بات یاد رہنی چاہیئے کہ توڑ پھوڑ اور تشدد کے ذریعے کوئی مستحکم اور پائیدار نظام حکومت قائم نہیں کیا جا سکتا لاطینی امریکہ اور افریقہ کے ان ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جہاں اس قسم کی کارروائیوں کے بعد انقلاب لائے گئے ہیں اور پھر وہاں انقلاب در انقلاب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس لئے نہ ہم خود تشدد کا راستہ اختیار کریں گے اور نہ دوسروں کو کرنے دیں گے۔

سوال ۔ اگر اس ملک میں حالات ایسے ہی رہے جیسے ہیں تو کیا سیاسی پارٹیوں کے لئے پرامن ذرائع سے تبدیلی لانا ممکن ہو گا۔؟

جواب ۔ اگر کچھ لوگ اسے ناممکن سمجھتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ موجودہ نظام پر راضی ہو چکے ہیں یا پھر وہ صبر و حکمت کے ساتھ پرامن کام کے قائل نہیں ہے ہم نے جس طریق کار کو صحیح سمجھا ہے اور پوری طرح سوچ سمجھ کر جس تدبیر کو مناسب پایا اس کے مطابق کام کر رہے ہیں اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے حالات بدلے جا سکتے ہیں —— غیر آئینی تدابیر ہمارے نزدیک غلط ہیں۔

(آئین ۲۵ راگست ۶۹ء)

سوال ۔ جب کبھی ملک میں ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں عام سیاسی سرگرمیاں جاری نہیں رکھی جا سکتیں تو اس سے نقصان انہی لوگوں کے کام کو پہنچتا ہے جو تعمیری انداز میں کام کرنے والے ہوتے ہیں کیونکہ دوسرے عناصر تو زیر زمین چلے جاتے ہیں اور اس طرح وہ بدستور اپنا کام کرتے رہتے ہیں جب حالات معمول پر آتے ہیں تو یہ لوگ زیادہ طاقت سے سامنے آتے ہیں کیا ایسے حالات میں جمہوری قوتیں بھی زیر زمین کام کی کوئی شکل نکال سکتی ہیں؟

جواب ۔ جی نہیں! زیر زمین تو چوہے جاتے ہیں جمہوریت پسندوں کا یہ مقام نہیں ہے۔ کیونکہ جمہوریت وہ چیز نہیں جو زیر زمین چلے۔ زیر زمین چلنے والی چیز اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے مگر جمہوریت نہیں ہو سکتی۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ صحیح مقصد کے لئے صحیح ذرائع ہی اختیار

کیے جا سکتے ہیں۔ اور حق بات اگر حکمت اور دانش کے ساتھ کہی جائے تو کوئی اس کی راہ نہیں روک سکتا۔

سوال۔ یہ بات اکثر دیکھی گئی ہے کہ جب بھی قومی اہمیت کا کوئی مسئلہ آتا ہے تو اشتراکی عناصر کی تخریبی سرگرمیاں تیز تر ہو جاتی ہیں اور پھر ان کا زیادہ تر رخ جماعت اسلامی اور آپ کی ذات کی طرف ہی ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب۔ یہاں کے کیمونسٹ اور سوشلسٹ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے راستے کا حقیقی سنگ گراں کون ہے یہ لوگ مختلف سیاسی جماعتوں اور دوسرے اداروں میں گھسے ہوئے ہیں۔ اور مختلف روپ بدلتے رہتے ہیں ہر موقع کے لحاظ سے نئے نئے نعرے تصنیف کر کے لاتے ہیں۔ اور لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کی الجھن یہ ہے کہ یہ جہاں کہیں بھی ہیں ہماری نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ جماعت اسلامی نے انہیں ہر مقام پر اور ہر محاذ پر بے نقاب کیا ہے اور ان کے فتنوں کا سد باب کیا ہے۔ پھر جماعت اسلامی کے لٹریچر نے ان کے ایک ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا کے ہر معاشی و معاشرتی ظلم کا خاتمہ صرف اسلام کر سکتا ہے اور کوئی دوسرا نظام نہیں کر سکتا اور نہ آج تک کر سکا ہے یہ ہیں وہ حقائق جنہیں آپ سامنے رکھیں گے۔ تو اس ساری مخالفت اور جھوٹے پروپیگنڈے کی وجہ آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔ جو کیمونسٹ اور سوشلسٹ عناصر جماعت اسلامی کے خلاف کر رہے ہیں ہم نے بالخصوص فکری محاذ پر اشتراکی عناصر کا جس طرح مقابلہ کیا ہے اس سے وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ان کا اصل حریف کون ہے۔

(آئین ۲۱ مارچ ۶۹ء)